اسلام

شاہ راہِ اعتدال

راشد شاز اور ان جیسے مفکرین کے مذہبی انحرافات
ایک علمی تحلیل و تجزیہ

از

محمد معاویہ سعدی

مکتبہ
دار السعادۃ سہارنپور

اِسلام

شاہ راہ اعتدال

راشد شاز اور ان جیسے مفکرین کے مذہبی انحرافات

ایک علمی تحلیل و تجزیہ

از

محمد معاویہ سعدی

شعبۂ تخصص فی الحدیث، مظاہر علوم، سہارنپور

مکتبہ دار السعادۃ، سہارنپور

نام کتاب : اسلام: شاہ راہِ اعتدال

تصنیف : محمد معاویہ سعدی

اشاعت اول : جمادی الاولیٰ ۱۴۳۷ھ

مطابق فروری ۲۰۱۶ء

صفحات : ۲۶۴

قیمت : ۲۴۰

طابع اینچ.ایس.آفسیٹ، پرنٹرس، نئی دہلی۔2

ملنے کے پتے:

مکتبہ دارالسعادۃ، نزد مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور

مکتبہ امداد الغرباء، محلہ مفتی سہارنپور

آئینۂ حقیقت نما

أعوذ بالله من الشيطان الرجيم

بسم الله الرحمن الرحيم

﴿هو الذي أنزل عليك الكتاب، منه آيات محكمات هن أم الكتاب، وأخر متشابهات، فأما الذين في قلوبهم زيغ فيتبعون ما تشابه منه؛ ابتغاء الفتنة وابتغاء تأويله، وما يعلم تأويله إلا الله، والراسخون في العلم يقولون آمنا به، كل من عند ربنا، وما يذكر إلا أولوا الألباب﴾ (آل عمران:۷)۔

(وہ وہی ذات ہے جس نے آپ پر کتاب نازل کی، جس میں کچھ آیات محکم (اور واضح المعنی) ہیں، وہی کتاب کا بڑا حصہ ہیں، اور دیگر کچھ آیات متشابہ (خفی المعنی) ہیں، جن لوگوں کے دلوں میں کھوٹ (اور کجی) ہوتی ہے وہ متشابہات ہی کے درپے ہوتے ہیں، اور اُن کا مقصد: (تحقیقِ حق اور عمل کے بجائے) دوسروں کو شکوک وشبہات میں ڈال کر (شورش پیدا کرنا) اور (ایک مخفی چیز کی بے مقصد) کرید میں لگنا ہوتا ہے، حالاں کہ اُن آیاتِ متشابہات کا واقعی مفہوم اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، اِسی وجہ سے پختہ علم لوگ یہاں پہنچ کر صرف یہ کہتے ہیں کہ (آیاتِ محکمات ہی کی طرح) ہم اِس پر (بھی) ایمان لاتے ہیں، اور یہ (آیاتِ محکمات اور آیاتِ متشابہات) سب ہمارے رب ہی کی طرف سے ہیں، اور ذکر ونصیحت نہیں حاصل کرتے مگر عقل مند لوگ)۔

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

ابتدائیہ

الحمدلله رب العالمین، والصلاة والسلام علی سید المرسلین، محمد وآله وأصحابه أجمعین، وعلی من تبعهم بإحسان إلی یوم الدین.

رب اشرح لي صدري، ویسر لي أمري، واحلل عقدةً من لساني، یفقهو قولي ..... اللّٰهم انفعني بما علمتني، وعلمني ما ینفعني، وزدني علماً، وبك نستعین یا فتاح.

''اسلام'' کی ترجمانی، تعارف اور تشریح کے نام پر کتابوں کے بازار میں اتنا بڑا مواد دستیاب ہے کہ اُس میں کسی قسم کا اضافہ اپنے آپ میں ایک سوالیہ نشان ہے۔

مگر اِس کے باوجود اِس کو اِسلام کا ایک زندہ جاوید معجزہ ہی کہنا چاہیے کہ اَب بھی بہت سے ایسے گوشے موجود ہیں جن پر مختلف انداز میں دادِ تحقیق دی جاسکتی ہے۔

اپنی اِس حقیر کاوِش کو بھی اسی تحقیقی خدمت کا کوئی حصہ، یا علمی معیار کا کوئی نمونہ قرار دینا؛ اِس کا نہ دعوی ہے، نہ خیال، بس اتنی سی دعا ہے کہ رب کریم کی توفیق سے جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ دین اِسلام کی معتبر خدمت کے طور پر مقبولِ بارگاہ ہوجائے، اور دجل وتلبیس اور شرور فتن کے اِس دور میں اِسلام کی ''شاہ راہِ اعتدال'' کی تعیین میں معین، اور دینی انحرافات کے بنیادی نقطوں کو سمجھنے میں معاون ہوجائے۔

''اِسلام'' کا مزاج بھی یہی ہے، اور تجربے کی بات بھی یہی ہے کہ کسی بھی مسئلے کے صرف مثبت پہلو پر روشنی ڈال دینا، اور منفی رخ کو نظرانداز کر دینا؛ عام عقول واَذہان کے لیے کافی نہیں ہوتا، بلکہ ''صراطِ مستقیم'' کی راہ نمائی کے لیے جس طرح یہ بتانا ضروری ہے کہ یہ ''شاہ راہ'' تمہارے لیے منزل رسا ہے، اسی طرح یہ بتانا بھی ضروری ہوتا ہے کہ اِس سے منحرف ہونے والے یہ ''گلی کوچے'' رہروانِ حق کے لیے گم راہ کن ہیں۔

قرآن کریم کی سب سے پہلی سورت (الفاتحہ:۶-۷) ہی میں اس کی کتنی واضح مثال موجود ہے، کہ ﴿اهدنا الصراط المستقيم، صراط الذين أنعمت عليهم﴾ کے مثبت مضمون پر اکتفا کرنے کے بجائے، منفی صیغے کے ساتھ یہ وضاحت بھی کرادی گئی ﴿غير المغضوب عليهم ولا الضالين﴾ (اے اللہ! ہمیں سیدھا راستہ چلا دیجیے، اُن لوگوں کا راستہ جن پر آپ نے اِنعام فرمایا، جو (یہود کی طرح) آپ کے مغضوب نہیں ہیں، اور نہ ہی (نصاریٰ کی طرح) بے راہ)۔

اِسی طرح ایک اور موقع پر ''صراطِ مستقیم'' کے اتباع کا حکم دیتے ہوئے دونوں ہی پہلوؤں کی رعایت کے ساتھ یہ اِرشاد فرمایا گیا: (الأنعام:۱۵۳) ﴿وأن هذا صراطي مستقيماً فاتبعوه، ولا تتبعوا السبل فتفرق بكم عن سبيله﴾ (اور بے شک میرا یہ راستہ ہی سیدھا راستہ ہے، لہٰذا تم اُسی کا اتباع کرو، اور اِدھر اُدھر کے راستوں پر مت چلو کہ وہ تم کو صراطِ مستقیم سے بھٹکا دیں گے)۔

جس امت کو ''امت وسط'' قرار دے کر، تمام اقوام وملل کے لیے ''شاہد عدل'' اور گواہ بنایا گیا ہے، اُسی امت کی تعریف کرتے ہوئے اِرشادِ ربانی ہے: (آل عمران:۱۱۰) ﴿كنتم خير أمة أخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنهون عن المنكر وتؤمنون بالله﴾ (تم بہترین امت ہو جس کا وجود ہی لوگوں کو نفع پہنچانے کے لیے ہوا ہے: تم امر بالمعروف کرتے ہو، اور نہی عن المنکر کرتے ہو، اور اللہ پر اِیمان رکھتے ہو)۔

معلوم ہوا کہ اِس امت کی خیریت، افضلیت اور ''اعتدال پسندی'' اِسی میں ہے کہ اِیمان باللہ کے باوصف: اِیجابی اور سلبی دونوں طرح کی اِصلاح اور ہدایت کی ذمہ داری بھی محسوس کی جائے، اور خیر کے کاموں کی رہنمائی کے ساتھ ساتھ، شر کی باتوں کی بھی نشاندہی کی جائے، تاکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے دونوں فریضوں کی ادائیگی ہو سکے۔

گزشتہ آیت سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ جس دین میں مثبت پہلو کے ساتھ، منفی رخ کی طرف توجہ نہ کی جائے، وہ کسی کلیسا یا دَیر کا مذہب، اور کسی دجالی تحریک کا محورِ فکر تو ہو سکتا ہے، اللہ کے دین اور مذہبِ اِسلام سے اُس کا تعلق ہرگز نہیں ہو سکتا۔

اِس لیے پیشِ نظر رسالہ میں بعونہ تعالیٰ مثبت پہلوؤں کے ساتھ ساتھ، منفی پہلوؤں کو بھی پیشِ نظر رکھا گیا ہے، اور زیرِ بحث آنے والے مسائل کے دونوں رخوں پر روشنی ڈالنے کی اپنی سی کوشش کی گئی ہے۔

اِس وقت ''دینِ اِسلام'' کے، سلف صالحین سے منقول و متوارث تصور کو بدلنے کی جو عالمی سازش چل رہی ہے، اُس کے مرکزی نقطے تین ہیں: دجل و تلبیس، تحریف و تبدیل اور زیغ و فتنہ، اِس لیے آئندہ سطور میں سب سے پہلے اِن الفاظ کی مختصراً شرعی حقیقت پیش کی جاتی ہے۔

دجل و تلبیس:

یہود کی بہت ساری بری عادتوں کی طرح ایک عادت ''تلبیس'' کی بھی ہے، جس پر قرآن کریم نے اُن کو بار بار زجر و توبیخ کی ہے، اِرشادِ ربانی ہے: (البقرۃ: ۴۲)

﴿ولا تلبسوا الحق بالباطل، و تکتموا الحق وأنتم تعلمون﴾ (یہودیو! حق کو باطل کے ساتھ گڈمڈ مت کیا کرو، اور جانتے بوجھتے حق کو چھپایا مت کرو)۔

''تلبیس''، ہی کے ہم معنیٰ ''دجل و تمویہ'' کے الفاظ بھی ہیں، جن کا مشترکہ مفہوم

ہے: حق و باطل میں خلط کرنا، اور باطل کو ملمّع کر کے حق کی شکل میں پیش کرنا۔
کسی شیٔ کی جو واقعی حقیقت نہ ہو، اُس کو حقیقت باور کراتے ہوئے پیش کرنا، یہی ''دجل'' کہلاتا ہے، اَحادیث صحیحہ میں ''دجال'' (مسیحائے یہود) کے فتنوں سے کس قدر پناہ مانگی گئی ہے، جاننے والوں پر مخفی نہیں، اِس نام کا جو واقعی مصداق ہے وہ تو آئندہ جب بھی ظاہر ہو، مگر اُس کے خروج کے پیش خیمہ کے طور پر اِس وقت ''دجل و تلبیس'' کی ایسی گرم بازاری ہے، کہ دکانوں اور بازاروں سے لے کر، علمی اور تحقیقی اِداروں تک ہر جگہ ''دجل و فریب'' ہی کے جلوے کارفرما نظر آتے ہیں۔

یہ ''کمالِ دجل'' ہی کا کرشمہ تو ہے کہ بہت سے لوگ مستند اور معتبر طریقے سے ''دین و مذہب'' کو پڑھے اور سیکھے بغیر، مذہبی عنوانات پر تقریریں کر رہے ہیں، دینی موضوعات پر کتابیں لکھ رہے ہیں، خود ''اِسلام'' اور ''اِسلامی تعلیمات'' کو صدقِ دل سے قبول کیے بغیر، ''اِسلام'' کے نام سے مختلف قسم کے لٹریچر شائع کر رہے ہیں، پھر لوگ ان کے دجل آمیز اُسلوبِ بیان اور ملبِّسانہ طرزِ تحریر سے متاثر ہو کر، ان کی چیزیں دیکھتے، پڑھتے اور سنتے ہیں، اور اَنجام کار (غیر شعوری طور پر) اُن کے دجل اور تلبیس کا شکار ہو جاتے ہیں۔

تحریف و تبدیل:

تحریف و تبدیل دونوں قریب المعنی الفاظ ہیں، جن کے لغوی معنی ہیں: ''بدل دینا''، خواہ یہ تبدیلی الفاظ و کلمات کی شکل میں کی جائے، خواہ اُن کے مفہوم و معانی میں۔

یہود کی بدبختانہ حرکتوں میں سے ایک حرکت ''تحریف و تبدیل'' کی بھی ذکر کی گئی ہے: (النساء:۴۶) ﴿من الذین ھادوا یحرفون الکلم عن مواضعه﴾ (یہود میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو کلام کو اس کے موقع سے پھیر دیتے ہیں)، اور (البقرة:۵۹) ﴿فبدل الذین ظلموا قولاً غیر الذي قیل لهم......﴾ (سو بدل

ڈالی ظالموں نے وہ بات جو اُس سے الگ تھی جس کا اُنھیں حکم دیا گیا تھا)۔

یہود کا یہ مرض ''اِسلام'' کا نام لینے والے اُفراد اور جماعتوں تک بھی متعدی ہو چکا ہے، اور فی زمانا دین کی شکل بگاڑنے میں اِس بیماری کا بھی اہم کردار ہے، اچھے خاصے ''دین پسند'' حلقوں میں بھی اس کے اثرات نظر آرہے ہیں۔

تحریف وتبدیل کی دو قسمیں ہیں:

ا: تحریفِ لفظی، جس میں حروف وکلمات کی شکل ہی بدل دی جاتی ہے، جیسے بنی اسرائیل کو جب ''حِطَّة'' کہتے ہوئے فلسطین میں داخل ہونے کا حکم دیا گیا تھا، تو اُنھوں نے اس کو بدل کر ''حِنْطَة'' کر دیا تھا۔

۲: تحریف معنوی، اَلفاظ کو باقی رکھتے ہوئے، متکلم کی مراد کو بدل دینا، اور اس کی مختلف صورتیں ہیں:

الف: شریعت کی طرف سے جو نص جس حکم کے لیے وارد ہوئی ہے، دلالت کی وجوہِ معتبرہ (عبارۃ النص، دلالۃ النص، اشارۃ النص اور اقتضاء النص) کا لحاظ کیے بغیر، کسی اور مفہوم کے لیے اُس کو استعمال کرنا۔

ب: جہاں کسی لفظ کو اُس کے حقیقی معنی پر محمول کرنا ممکن ہو، وہاں بلاضرورت مجازی معنی کی طرف پھیرنا۔

ج: شرعی نصوص میں وارد ہونے والے الفاظ کے جو مخصوص اِصطلاحی مفاہیم متعین ہیں، بغیر کسی قرینے کے ان کے علاوہ مفہوم میں اُن الفاظ کا استعمال کرنا۔

د: قرآن وحدیث کی عام نصوص کو، بغیر کسی قرینے کے خاص کر لینا، یا اس کے برعکس کسی خاص نص کو، سیاق وسباق کا لحاظ کیے بغیر از خود عام کر لینا۔

فتنۂ تشکیک:

''فتنہ'' کا لفظ بھی شرعی نصوص میں بکثرت استعمال کیا گیا ہے، جو مختلف معانی

کے لیے بولا جاتا ہے، مگر اُس کے اصل معنی ہیں: سونے چاندی کو آگ میں ڈال کر کھرے کھوٹے کو الگ کرنا، اِسی وجہ سے عموماً اِس کا ترجمہ ''آزمائش وابتلاء'' سے کردیا جاتا ہے، کہ امتحان ہی کے ذریعے اہل ونااہل میں تمیز ہو پاتی ہے: عند الامتحان یکرم الرجل أو یھان۔

پھر کہیں یہ لفظ آزمائش اور ابتلاء سے قطع نظر، مطلق عذاب اور تکلیف کے لیے بھی استعمال ہوجاتا ہے، بلکہ بعض مرتبہ سببِ عذاب (گمراہی، کفر، شرک اور نفاق وغیرہ) پر بھی اِس کا اِطلاق ہوتا ہے، جیسا کہ ''تاج العروس'' میں ان سب کی تفصیل موجود ہے۔

قرآنِ کریم میں بھی اِس کا اِطلاق متعدد معانی پر ہوا ہے، سورۂ بقرہ (آیت: ۱۹۱، ۱۹۳) اور سورۂ اَنفال (۳۹) میں ''قبولِ حق کی راہ میں رکاوٹ بننے'' کے معنی میں اِس کا اِطلاق کیا گیا ہے: ﴿وقاتلوھم حتی لاتکون فتنة﴾، اور سورۂ آل عمران کی ابتداء میں تشکیک وتلبیس اور دِینی ''فتنہ'' واُلجھن پیدا کرنے کے معنی میں اِستعمال کیا گیا ہے:

﴿ھو الذي أنزل علیک الکتاب، منه آیات محکمات ھن أم الکتاب، وأخر متشابھات، فأما الذین في قلوبھم زیغ فیتبعون ما تشابه منه؛ ابتغاء الفتنة وابتغاء تأویله، وما یعلم تأویله إلا اللّٰه، والراسخون في العلم یقولون آمنا به، کل من عند ربنا، وما یذکر إلا أولوا الألباب﴾

(آل عمران: ۷)۔

(وہ وہی ذات ہے جس نے آپ پر کتاب نازل کی، جس میں کچھ آیات محکم (اور واضح المعنی) ہیں، وہی کتاب کا بڑا حصہ ہیں، اور دیگر کچھ آیات متشابہ (خفی المعنی) ہیں، جن لوگوں کے دلوں میں کھوٹ (اور کجی) ہوتی ہے وہ متشابہات ہی کے درپے ہوتے ہیں، اور اُن کا مقصد: (تحقیقِ حق اور عمل کے بجائے) دوسروں کو شکوک وشبہات میں ڈال کر (شورش پیدا کرنا) اور (ایک مخفی چیز کی بے مقصد) کرید میں لگنا ہوتا ہے،

حالاں کہ اُن آیاتِ متشابہات کا واقعی مفہوم اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، اِسی وجہ سے پختہ علم لوگ یہاں پہنچ کر صرف یہ کہتے ہیں کہ ہم اِس پر (بھی) اِیمان لاتے ہیں، اور یہ (آیاتِ محکمات اور آیاتِ متشابہات) سب ہمارے رب ہی کی طرف سے ہیں، اور ذکر و نصیحت نہیں حاصل کرتے مگر عقل مند لوگ)۔

ہمارا یہ دور ''فتنوں کا دور'' بھی کہلاتا ہے، جس میں جانی، مالی اور ظاہری فتن سے کہیں زیادہ حساس معاملہ ''دینی فتنوں'' کا ہے، کہیں بدعات و خرافات کے فتنے ہیں، کہیں افکار و نظریات کے فتنے ہیں، کہیں معاشرت و اخلاق کے فتنے ہیں، کہیں سیاست بنامِ دین کا فتنہ ہے، کہیں تحصیل معاش بنام طلبِ علم کا فتنہ ہے، کہیں تحقیقات و انکشافات کا فتنہ ہے، کہیں جدیدیت و نیچریت کا فتنہ ہے، پھر قومیت، وطنیت، جمہوریت، اور مادیت وغیرہ فتنے ان کے علاوہ ہیں۔

غرضیکہ ہر چہار سو مختلف افراد و اشخاص، طبقات و تحریکات، اور فرق و جماعات کے ذریعے مختلف النوع تشکیکات و تلبیسات کے فتنے پھیلے ہوئے ہیں۔

قرآن کریم کی مذکورہ آیت میں جس فتنے کا ذکر ہے، وہ اہلِ زیغ کے ذریعے برپا کیا جانے والا وہ فتنہ ہے، جس میں کتاب و سنت کی سیدھی سادی تعلیمات پر اولاً خود عمل کرنے، اور ثانیاً دوسروں کو دعوت دینے کے بجائے، ایسے علمی پہلوؤں کو عوامی گفتگو کا موضوعِ بحث بنایا جاتا ہے، جس سے عامۃ الناس ''اِسلام'' و ''اِسلامی تعلیمات'' کے سلسلے میں شکوک و شبہات میں مبتلا ہو کر، دین و مذہب ہی سے برگشتہ ہو جائیں، **أعاذنا اللہ من الشرور والفتن ما ظهر منها وما بطن۔**

تقریبِ کتاب:

(۱) اِسی تناظر میں اللہ تعالیٰ کی توفیق سے دل میں یہ داعیہ پیدا ہوا کہ بنیادی طور پر، قرآنی نصوص کو سامنے رکھتے ہوئے، مذہبِ اِسلام کا ایک ایسا اِجمالی تعارف پیش کر دیا

جائے، جس سے فتنوں کے اِس دور میں کم از کم ایمان وعقائد کی حفاظت کا اتنا ضروری سامان مہیا ہو جائے، جو ہماری اخروی نجات کا ذریعہ، اور دنیوی کامیابیوں کی بنیاد بن سکے۔

(۲) یہ خیال بھی ہوا کہ موجودہ دور میں مسلمانوں کے اندر جن حساس راستوں سے فکری اور اصولی اِنحرافات راہ پا رہے ہیں، اُن سب کا بھی ایک تحقیقی جائزہ لے لیا جائے: غور کرنے سے مجموعی طور پر تین موضوعات ایسے سمجھ میں آئے جن کی اِصلاح سے اِن شاء اللہ ''مذہبِ اِسلام'' کو سمجھنا اور اُس کی ''شاہ راہِ اِعتدال'' (صراطِ مستقیم) پر چلنا اور جمنا آسان ہو سکتا ہے، اور بحیثیت مسلمان کے ہمارا فکری زاویہ اور مذہبی رخ ہر قسم کے اِنحراف اور کج رَوِی سے محفوظ رہ سکتا ہے۔

وہ تین اہم موضوعات (میری نظر میں) یہ ہیں: علم، عقل اور نقل۔

کیوں کہ کسی بھی چیز، خصوصاً مذہب کو سمجھنا موقوف ہے اُس کے ''علم'' پر، اور حصولِ علم کے ذرائع میں ''عقل'' اور ''نقل'' بنیادی ستون کی حیثیت رکھتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ''اِسلام'' پر علمی اور فکری راستوں سے حملہ کرنے والے دانا دشمنوں نے، مسلمانوں کے انہی تین پہلوؤں کو متزلزل کرنے کی سب سے زیادہ کوشش کی ہے، اور یہ ایک نہایت تلخ اور ناگوار حقیقت ہے کہ ہماری قوم کے اکثر افراد نے اِن محاذوں پر شکست قبول کرتے ہوئے دشمن کے سامنے پوری طرح سے ہتھیار ڈال دیا ہے، اور علمِ دین کی تحصیل کی فکر کے بجائے، نوبت العیاذ باللّٰہ ''علم'' اور ''دین'' کے شرعی مفہوم ہی میں تبدیلی تک پہنچ چکی ہے۔

جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم میں سے ایک بڑی تعداد بھی اُسی چیز کو ''علم'' سمجھنے لگی ہے جسے اہلِ باطل انھیں علم باور کرانا چاہ رہے ہیں، اُسی بھاگ دوڑ اور تگ ودَو کو ''دین'' (اور اِنسانیت) تصور کرنے لگی ہے جو أعداء الدین (دِین کے دشمن) اُن سے چاہتے

تھے، انہی خیالات وجذبات کو ''عقل'' تسلیم کرنے لگی ہے جس کا دشمنوں کی طرف سے اُن سے مطالبہ ہے۔

اور ''نقل'' (قرآن وحدیث) کے سلسلہ میں خود ساختہ اصولوں، اور کج مج ضابطوں کے حوالے سے، اُنہی منفی خیالات اور اُسی معاندانہ روِش پر چل پڑی ہے جس کی طرف حاوِی دشمن نے انھیں ہانکنا چاہا ہے!

اِس لیے پیش نظر مضمون کے پہلے حصے میں: سب سے پہلے (مذہب اِسلام) کا اِجمالی تعارف، اُس کے بعد ''علم'' کی تعریف، تقسیم اور متعلقہ تفصیلات، بعد ازاں ''عقل'' کی حقیقت، اہمیت اور اُس کا دائرۂ کار وغیرہ کا مختصر بیان کیا گیا ہے۔

حصولِ علم کے سلسلہ میں ''نقل'' کا کردار، اُس کا مرتبہ، اُس کی اَقسام، اور ''نقلِ صحیح'' کی حجیت سے متعلق پیش آمدہ شبہات واعتراضات وغیرہ کا بیان، بمصلحت دوسرے حصے کے لیے موخر کردیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی تکمیل کی توفیق ارزانی فرمائیں۔

(۳) اِفتراق وانتشار کو عصر حاضر میں امت کا سب سے بڑا المیہ کہا جا سکتا ہے، پیش نظر کتابچہ میں ''وحدت امت اور حدودِ اِختلاف'' کے عنوان سے اِس موضوع پر بھی کچھ عرض معروض کی کوشش کی گئی ہے۔

(۴) آخر میں ''اِعتدال'' اور اُس کی شرعی حقیقت واہمیت پر بھی مختصر سی روشنی ڈالی گئی ہے، کہ ہمارا آج کل سب سے بنیادی مرض ہی ہر کام میں اِفراط وتفریط اور بے اِعتدالی ہے۔

تشکر وامتنان:

اِس رسالہ کو پیش کرتے ہوئے تشکر وامتنان کے جذبات سے جبینِ نیاز بارگاہِ صمدیت میں خم ہے، اور زبان وقلم سربسجود۔

پھر شریعت، عقل اور جذبات تینوں ہی کے تقاضے سے اپنے اُن تمام اَسلاف

واکابر اور اساتذہ ومشائخ کی شکر گذاری کی ذمہ داری بھی مجھ پر عائد ہوتی ہے، جن کی کتب ورسائل اور علوم ومعارف سے، یا جن کی مصاحبت ومجالست اور اِرشاد وہدایت سے اِس مضمون میں اِستفادہ کیا گیا ہے، یا جن کے تحریری یا زبانی اِفادات واِصلاحات سے اِس رسالے کو زینت بخشی گئی ہے، یا جن کے کسی بھی طرح کے تعاون سے یہ کتاب نذرِ قارئین کیے جانے کا موقع فراہم ہوسکا ہے، فجزاهم الله عنا خير ما يجزي به المحسنين المخلصين.

اللہ تعالیٰ ستاری کا معاملہ فرماتے ہوئے محض اپنے فضل وکرم سے اِس کوشش کو قبول فرمائیں، دنیا اور آخرت ہر اعتبار سے کامیاب فرمائیں، میرے لیے ذخیرۂ آخرت اور برادرانِ اِسلام کے لیے دینی ہدایت واستقامت کا ذریعہ بنائیں، آمین۔

إن أريد إلا الإصلاح ما استطعت، وما توفيقي إلا بالله، عليه توكلت وإليه أنيب، وصلى الله تعالىٰ علىٰ خير خلقه محمد وآله وأصحابه أجمعين، وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين۔

محمد معاویہ سعدی گورکھپوری

جامعہ مظاہر علوم، سہارنپور، یوپی، انڈیا

۱۸ ربیع الثانی ۱۴۳۷ھ، موافق ۲۹ جنوری ۲۰۱۶ء

پہلا باب

مذہب کا تعارف

مذہب کیا ہے؟

سیکولرزم، کمیونزم اور سوشلزم جیسے بعض ملحدانہ نظریات کے علاوہ، دنیا کے تمام افکار وملل میں ''مذہب'' کو خاص اہمیت حاصل ہے، اِس لیے ''مذہب'' کی اِصطلاح خاصی جانی پہچانی اور مشہورِ عام ہے، لیکن اِس کی حقیقت پر نظر، اور مقصد پر توجہ کم ہی لوگوں کو ہے۔

لفظ ''مذہب'' عربی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی ہیں: چلنے کا راستہ، قرآن کریم میں اِس مفہوم میں ''دِین'' کا لفظ اِستعمال کیا گیا ہے: (المائدۃ:۳) ﴿ورضیت لکم الإسلام دِیناً﴾ (میں نے تمہارے لیے راستے کے طور پر اِسلام کو پسند کیا ہے)۔

''راستے'' سے: اللہ تعالیٰ کی طاعت وعبادت، خودسپردگی اور بندگی کا راستہ مراد ہے، جس کو قرآنی اِصطلاح میں ''صراطِ مستقیم'' (سیدھا راستہ) کہا گیا ہے، اور ہر نماز میں اِس سیدھے راستے کی طرف ہدایت کی دعا کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔

مذہب: اللہ کے یہاں کونسا معتبر ہے؟

مذہب: اِنسان کی اپنی سوچ، عقل اور جذبات کا نام نہیں ہے، بلکہ اُس راستہ (اور صراطِ مستقیم) کا نام ہے جس پر چل کر بندہ خداوند تعالیٰ کی مرضیات کو حاصل کرتا ہے،

اور نامرضیات سے بچتا ہے، ظاہر ہے کہ اس مطلوبہ راستہ کی تعیین بھی خدا تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوسکتی ہے۔

روزمرہ کی دنیاوی زندگی گذارنے کے بقدر اِنسانوں کے پاس ''عقل'' تو تھی ہی، مگر خدا تعالیٰ کی بندگی کا طریقہ معلوم کرنے کے لیے، اور مغیباتِ آخرت (اللہ کی رضا وعدمِ رضا، اور جنت، دوزخ، نشر، حشر وغیرہ) کے بارے میں فکر وعقیدہ درست رکھنے کے لیے، اللہ تعالیٰ سے کسی ایسے رابطہ کی ضرورت تھی جس سے عقلِ نارسا کی یہ مشکلیں دور ہوسکیں، اِس لیے مذہب وہی معتبر اور لائقِ اتباع ہونا چاہیے جس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف مستند اور معتمد ذریعہ سے ہو، جن ذرائع میں ایسا خلل پیدا ہوجائے کہ وہ اِس نسبت کو مشکوک کردے تو اُن ذرائع کو مذہب جیسی اہم چیز- جو عقل پر بھی حاکم ہوتی ہے، اُس- کی بنیاد بنانا عقلِ سلیم کے نزدیک درست نہیں ہوسکتا۔

اور یہ بات دنیا کو معلوم ہے، اور اہلِ دنیا نے اِس کو خوب اچھی طرح جانچ اور جان لیا ہے کہ تمام مذاہب عالَم کی آسمانی کتابوں میں قرآنِ کریم وہ واحد برگزیدہ کتابِ ہدایت اور نصابِ عبادت ہے جس کا ایک ایک حرف قطعیت کے مرتبہ کو پہنچا ہوا ہے، اور جس کا ہر ہر لفظ شک وشبہ کے واہمہ سے بھی بالاتر ہے، اِس کے علاوہ بقیہ آسمانی کتابیں اعتبار واستناد کے اِس درجہ پر نہیں ہیں کہ اُن کو خالق ومخلوق کے درمیان ربطِ باہمی کا واسطہ بنایا جائے، اِس لیے اِس وقت سارے عالَم میں مذہب سماوی اور پیغامِ خداوندی کی بنیاد بنائے جانے کے لائق صرف اور صرف وہ قرآنِ مجید ہے جس کے بارے میں خدا نے خود فرمادیا: (الحاقۃ:۴۳) ﴿تنزیل من رب العالمین﴾ (یہ رب العالمین کی طرف سے اتاری گئی کتاب ہے)، (البقرۃ:۲) ﴿لا ریب فیہ﴾ (اِس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے)۔ اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری اِن الفاظ میں لے لی: (الحجر:۹) ﴿إنا نحن نزلنا الذکر وإنا لہ لحافظون﴾ (ہم نے ہی یہ کتاب اتاری ہے، اور

ہم ہی اِس کی حفاظت کریں گے)۔

لہٰذا جب قرآنِ کریم ہی آسمانی مذاہب کی واحد بنیاد ٹھہرا تو اَب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ قرآنِ کریم نے کس راستہ کو ''مذہب'' قرار دیا ہے؟ اور پھر اُس کی بنیاد کن افکار اور اعمال پر رکھی ہے؟

چنانچہ ''مذہب'' کی تعیین کے سلسلہ میں قرآن کا صاف اِعلان ہے: (آل عمران:۱۹): ﴿إن الدين عند اللّٰه الإسلام﴾ (اللہ کے نزدیک معتبر دِین تو بس اِسلام ہے)، اور (المائدة:۳) ﴿ورَضيتُ لكم الإسلام دِيناً﴾ (میں نے تمہارے لیے مذہب کے طور پر اِسلام کو پسند کیا ہے)، اور یہ بھی وضاحت کردی گئی ہے (آل عمران:۸۵): ﴿ومن يبتغ غير الإسلام ديناً فلن يقبل منه﴾ (جو اِسلام کے علاوہ کوئی اور دِین اِختیار کرے گا تو وہ اُس سے قبول نہیں کیا جائے گا)۔

اِس لیے قرآنِ کریم کے اِرشاد اور فیصلے کے مطابق: خدائے وحدہ لاشریک کے ہاں ''مذہب'' کے طور پر ''اِسلام'' ہی مقبول ہوسکتا ہے، اِس کے علاوہ بقیہ اَدیان ومذاہب یا منسوخ ہیں یا مردود۔

اِسلام کیا ہے؟

''اِسلام'' کے لغوی معنی ہیں: سر نہادن بطاعت، فرمانبرداری کے طور پر سر جھکا دینا، قرآنی اِصطلاح میں عام طور پر جب یہ لفظ بولا جاتا ہے تو مطلب ہوتا ہے: زبان اور ظاہری عمل سے ﴿أسلمت لرب العالمين﴾ (البقرة:۱۳۱) کے اقرار کے ذریعے رب العالمین کے سامنے مکمل طور پر خودسپردگی کردینا، اور ﴿سمعنا وأطعنا﴾ (النساء: ۴۶) کے وعدے کے ذریعے اِس دنیا کے خالق ومالک کی پوری طرح سے اِطاعت قبول کرلینا۔

اور اِسی کے قریب ایک لفظ ''اِیمان'' ہے، جس کا تعلق دِل سے ماننے اور قبول

کرنے سے ہے، لہٰذا ہر وہ شخص جو ظاہراً اللہ کی وحدانیت اور حاکمیت کو تسلیم کرتا ہو، اور اُس کی اِطاعت کا اِقرار کرتا ہو، وہ شخص ظاہری اَحکام کے اعتبار سے ''مسلمان'' ہے، اور یہی فکر وعقیدہ جب دِل کے اندر تک اتر جائے، اور اُس پر پوری طرح سے قلبی اِطمینان، اِعتماد اور شرحِ صدر بھی حاصل ہو جائے تو ایسا شخص ''مؤمن'' کہلاتا ہے۔

پھر یہ دونوں الفاظ اکثر ایک دوسرے کی جگہ بھی استعمال ہو جاتے ہیں، اِس لیے لغۃً اور اصطلاحاً دونوں میں فرق ہونے کے باوجود عرفاً ایک دوسرے کے مترادف ہی سمجھے جاتے ہیں، اس لیے ہر وہ شخص جس کو مسلمان سمجھا جاتا ہے؛ اُس کو مؤمن بھی کہا جاسکتا ہے۔

اِسلام کی ضد:

''اِسلام'' کے بالمقابل قرآنِ کریم نے ''کفر'' کا لفظ استعمال کیا ہے، اِسلام کی اَساس: اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری اور اُس کی نعمتوں کی شکرگذاری پر ہے، جب کہ ''کفر'' کی بنیاد: اپنے خالق ومالک کی نافرمانی اور اپنے محسن کی ناشکری پر ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں ہی دو متضاد طرزِ عمل اور دو متحارب رویے ہیں: (التغابن: ۲) ﴿هو الذي خلقكم فمنكم كافر ومنكم مؤمن﴾ (وہ وہی ذات ہے جس نے تمھیں پیدا کیا، پھر تم میں سے کچھ کافر ہو گئے، اور کچھ مؤمن)، اور ''کفر'' کے بارے میں اللہ رب العزۃ نے صاف فرمادیا ہے: (الزمر: ۷) ﴿ولا يرضى لعباده الكفر﴾ (اللہ اپنے بندوں کے کفر سے راضی نہیں ہوتا)۔

اِسلام کی بنیادیں:

مذہبِ اِسلام کی بنیاد کن افکار واعمال پر رکھی گئی ہے؟ اِس کا خلاصہ دو لفظوں میں ہے: اُصول اور فروع، اُصول سے مراد وہ اَساسی عقائد واَفکار ہیں جن کو تسلیم کیے اور مانے بغیر ''اِسلام'' کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا، اور فروع سے مراد وہ اَعمال اور اَخلاق ہیں

جن کو (حسبِ مرتبہ) اِختیار کرنا تو ضروری ہے، مگر اُن کے بغیر بھی فی الجملہ "اِسلام" کا علم باقی رہے گا، اگر چہ اِسلامی اِعتبار سے ترقی کا مستحق نہ ہوگا۔

اصولِ اسلام:

اِسلامی اُصول میں رأس الاصول چار عقائد ہیں:

۱: اللہ کے وجود، توحید اور صفاتِ قدسیہ پر ایمان لانا، اُس کے کسی اِرادہ اور فیصلہ میں کسی کو شریک اور موٴثر نہ سمجھنا۔

۲: تمام انبیائے سابقین کو برحق مانتے ہوئے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر دل وجان سے اِیمان لانا، اور آپ کو "خاتم النبیین" تسلیم کرنا۔

۳: قرآنِ کریم کے اللہ کا کلام اور اُس کی آخری کتاب ہونے، اور قیامت تک آنے والوں کے لیے دلیلِ راہ، حجتِ قطعیہ اور نورِ ہدایت ہونے پر ایمان لانا۔

۴: غیب پر، خصوصاً آخرت اور اُس کے متعلقات (قیامت، بعث، نشر، حشر، حساب، جنت، جہنم، جزا، سزا، ثواب، عذاب وغیرہ) کے برحق ہونے پر ایمان لانا۔

جیسا کہ اِن آیات میں اِس کا بیان ہے: (التغابن: ۸) ﴿فآمنوا باللہ ورسولہ والنور الذي أنزلنا﴾ (ایمان لاؤ اللہ پر، اُس کے رسول پر، اور اُس نور (قرآن) پر جو ہم نے اپنے نبی پر اتارا ہے)۔

اور (الإسراء: ۹) ﴿إن هذا القرآن يهدي للتي هي أقوم﴾ (حقیقت یہ ہے کہ یہ قرآن وہ راستہ دکھاتا ہے جو بالکل سیدھا ہے)، اور: (العنکبوت: ۳۶) ﴿اعبدوا اللہ وارجوا الیوم الآخر﴾ (اللہ کی بندگی کرو، اور آخرت کی رجا رکھو)۔

۵: پھر تفصیلی طور پر توحید، رسالت، قرآن، صحابہؓ، ملائکہؑ، معجزات، تقدیر، آخرت وغیرہ سے متعلق کتاب وسنت میں جو افکار وعقائد بتائے گئے ہیں، یا عبادات ومعاملات، معاشرت واخلاق وغیرہ کے بارے میں جو احکام دیئے گئے ہیں، اُن کو برحق ماننا، اور من وعن

اُن کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا بھی شرطِ اِسلام ہے، اسی طرح کفر، شرک، نفاق اور اِلحاد وزَندقہ وغیرہ جن باطل اَفکار ونظریات سے ممانعت فرمائی گئی ہے، اُن کو ضلالت وگمراہی سمجھنا، اور اُن سے پوری طرح احتراز کرنا، اور فتنہ وفساد، قتل وغارت گری وغیرہ جن بداَعمالیوں سے منع کیا گیا ہے، اُن کو غلط اور قابلِ ترک سمجھنا بھی لازمۂ ایمان ہے۔

جیسا کہ اِن نصوص میں اِس کا صاف اِعلان موجود ہے:

اِرشادِ ربانی ہے: (النساء:۱۳۶) ﴿ومن یکفر باللّٰہ وملائکتہ وکتبہ ورسلہ والیوم الآخر فقد ضل ضلالاً بعیداً﴾ (اور جس نے اِنکار کیا اللہ کا، اُس کے فرشتوں کا، اُس کی کتابوں کا، اُس کے رسولوں کا، اور قیامت کے دن کا، تو وہ کھلی ہوئی گمراہی میں ہے)۔

ایک جگہ اِرشاد ہے (النساء:۱۵۰،۱۵۱): ﴿إن الذین یکفرون باللّٰہ ورسلہ ویریدون أن یفرقوا بین اللّٰہ ورسلہ، ویقولون نؤمن ببعض ونکفر ببعض، ویریدون أن یتخذوا بین ذلک سبیلاً، أولئک ھم الکافرون حقاً، وأعتدنا للکافرین عذاباً مھیناً﴾ (بے شک جو لوگ اللہ اور اُس کے رسولوں کا اِنکار کرتے ہیں، اور اِیمان لانے میں اللہ اور اُس کے رسولوں میں فرق کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ہم اپنے حسبِ منشا کسی پر اِیمان لائیں گے کسی پر نہیں، اور چاہتے ہیں کفر واِسلام کے درمیان ایک مستقل مذہب اِختیار کرنا، یہ لوگ پکے کافر ہیں، اور ہم نے کافروں کے لیے رسوا کردینے والا عذاب تیار کر رکھا ہے)۔

ایک دوسری جگہ اِرشاد ہے: (البقرۃ:۱۷۷) ﴿ولکن البر من آمن باللّٰہ والیوم الآخر والملائکۃ والکتاب والنبیین، وآتی المال علی حبہ ذوي القربی والیتامی والمساکین وابن السبیل والسائلین وفي الرقاب، وأقام الصلوٰۃ وآتی الزکوۃ......﴾ (اَصل نیکی یہ ہے کہ آدمی اِیمان لائے اللہ پر، آخرت

کے دن پر، فرشتوں پر، کتاب (قرآن) پر، اور تمام نبیوں پر، اور اللہ کی محبت میں مال دیا کرے رشتہ داروں کو، یتیموں کو، مسکینوں کو، مسافر کو، ضرورت مندوں کو، اور غلام آزاد کرانے میں، اور نماز قائم کرے، اور زکوٰۃ دیا کرے......الخ)۔

۶: یہ عقیدہ بھی رکھنا اِسلام کی شرائط میں سے ہے کہ اللہ کی اتاری ہوئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی، اور قرآن کریم میں وارد ہونے والی تمام باتیں (وجوہِ دلالت کے توسع کے ساتھ) اپنی جگہ بالکل سچ اور برحق ہیں، لہٰذا ان میں سے کسی بات کے اِنکار یا دوراَز کار تاویل (اور معنوی تحریف) سے بھی ''کفر'' لازم آجاتا ہے۔

جحود واِنکار سے متعلق قرآنی ارشاد ہے: (الأعراف:۳۶) ﴿والذين كذبوا بآياتنا واستكبروا عنها أولئك أصحاب النار، هم فيها خالدون﴾ (جن لوگوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو، اور اُن سے تکبُّر کیا، وہ لوگ جہنمی ہیں، وہ اُس میں ہمیشہ ہمیش رہیں گے)، اور (عنکبوت:۴۷) ﴿وما يجحد بآياتنا إلا الكافرون﴾ (ہماری آیتوں کا اِنکار نہیں کرتے ہیں مگر کافر ہی لوگ)۔

اِلحاد، باطل تاویلات، تحریفات اور تلبیسات کا اِرتکاب کرنے والوں کے بارے میں ہے: (حمٓ السجدۃ:۴۰) ﴿إن الذين يلحدون في آياتنا لا يخفون علينا، أفمن يلقى في النار خير؛ أم من يأتي آمناً يوم القيامة﴾ (بے شک جو لوگ ہماری آیات میں کج رَوِی کرتے ہیں وہ ہم سے مخفی نہیں ہیں، کیا جو لوگ جہنم میں ڈالیں جائیں گے وہ اچھے ہیں، یا وہ لوگ جو روزِ قیامت مامون ومطمئن رہیں گے؟)، اور بعض مواقع پر اِس کو یہودِ بے بہبود کا طرزِ عمل بتایا گیا ہے ﴿يحرفون الكلم عن مواضعه﴾ (المائدۃ:۱۳)۔

۷: اللہ ورسول کی کسی بات کے ساتھ اِستہزاء وتمسخر کرنے اور مذاق اڑانے سے بھی آدمی ''اِسلام'' کے دائرہ سے خارج ہوکر، ''کفر'' کی سرحد میں داخل ہوجاتا ہے،

قرآنِ کریم میں ہے(التوبۃ:٦۵):﴿قل أبالله وآياته ورسوله كنتم تستهزؤون، لا تعتذروا، قد كفرتم بعد إيمانكم﴾(آپ اِن سے پوچھیے کہ کیا تم اللہ، اُس کی آیات اور اُس کے رسول کے ساتھ اِستہزاء کیا کرتے تھے؟ اب کوئی معذرت مت کرو، ایمان لانے کے بعد تم نے کفر کیا ہے)۔

۸: اِسی طرح اللہ کی، یا اُس کے رسول کی توہین و بے ادبی کرنے سے بھی ''کفر'' لازم آجاتا ہے، اللہ کا اِعلان ہے(الأحزاب:۵۷):﴿إن الذين يؤذون الله ورسوله لعنهم الله في الدنيا والآخرة، وأعد لهم عذاباً مهيناً﴾(بے شک جو لوگ اللہ کو، اُس کے رسول کو تکلیف پہنچاتے ہیں اُن کے اوپر اللہ کی پھٹکار پڑتی ہے دنیا میں بھی، اور آخرت میں بھی، اور ایسوں کے لیے اللہ نے بھی اِہانت آمیز عذاب تیار کر رکھا ہے)۔

اللہ ورسول کی طرف یقینی طور پر منسوب چیزوں کے بھی اَدب وتعظیم کا حکم دیا گیا ہے:(الحج:۳۲)﴿ومن يعظم شعائر الله فإنها من تقوى القلوب﴾(اور جو اللہ کے ''شعائر'' کا احترام کرتا ہے تو یہ قلب میں تقوی ہونے کی علامت ہے)، لہٰذا شعائر اِسلام کی بے حرمتی سے بھی آدمی تقویٰ اِیمانی سے نکل جاتا ہے۔

تکملۂ اِسلام:

یہاں یہ وضاحت بھی مناسب ہے کہ ''اِسلام'' میں داخلہ کے لیے؛ اُس کے مطلوبہ عقائد وافکار کا تسلیم کرنا جتنا ضروری ہے، اُس کے مخالف اور مصادِم افکار ونظریات سے براءت کرنا بھی اتنا ہی ضروری ہے، یہی وجہ ہے کہ اِسلام کے کلمہ کی بنیاد ''إلا اللّٰہ'' کے اِثبات سے پہلے ''لا إلــــہ'' کی نفی پر رکھی گئی ہے، اللہ کے تعلق (عُروہٗ وثقی) کا مدار ''اِیمان باللہ'' کے ساتھ ساتھ، ''کفر بالطاغوت'' (اِسلام مخالف چیزوں کے اِنکار) پر رکھا گیا ہے: (البقرۃ:۲۵٦)﴿فمن يكفر بالطاغوت ويؤمن بالله فقد

استمسک بالعروۃ الوثقیٰ﴾۔

سورۂ اِخلاص میں ﴿ھو اللّٰہ احد﴾ (خدا تو بس ایک ہی ہے) کی پکار کے ساتھ، سورۂ کافرون میں ﴿لا اعبد ما تعبدون﴾ (ہم نہیں پوج سکتے اُن چیزوں کو جنھیں تم پوجتے ہو) کا اِعلان بھی کروایا گیا ہے، تمام انبیائے کرام علیہم الصلاۃ والسلام کی دعوتِ توحید میں ﴿وما أنا من المشرکین﴾ (میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں)، اور ﴿إني بريء مما تشرکون﴾ (میں لاتعلق ہوں تمہارے شرکیہ اعمال وعقائد سے) کی براءت بھی بطور خاص رکھی گئی ہے۔

صرف کفریہ اَعمال وعقائد ہی سے نہیں؛ بلکہ ایک خاص حد تک اہلِ کفر سے بھی فاصلہ رکھنا اِسلامی فریضہ ہے: (المجادلۃ:۲۲): ﴿لا تجد قوماً یؤمنون باللّٰہ والیوم الآخر یوادّون من حادَّ اللّٰہ ورسولہ؛ ولو کانوا آباء ھم أو أبناء ھم أو إخوانھم أو عشیرتھم﴾ (آپ نہیں پائیں گے اُس قوم کو جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتی ہے کہ وہ اُن لوگوں سے مودّت کا تعلق رکھیں جو اللہ اور اُس کے رسول کی مخالَفت کرتے ہیں؛ چاہے وہ اُن کے باپ، بیٹے، بھائی یا خاندان والے ہی کیوں نہ ہوں)۔

ایک اور جگہ یہ فرمایا گیا: (آل عمران:۲۸) ﴿یا أیھا الذین آمنوا لا تتخذوا الکافرین أولیاء من دون المؤمنین﴾ (ایمان والو! مؤمنین کے علاوہ کافروں سے موالات (قلبی دوستی) مت قائم کرو)۔

الحاصل: ''ولاء'' اور ''براء'' بھی ایک اہم اِسلامی تقاضا اور ایک حساس شرعی فریضہ ہے، جس کو مطلوبہ طریقے کے مطابق ادا کرنا تکملۂ اِسلام ہے۔

اِسلام اور کفر کی کشمکش:

''اِسلام'' اور ''کفر'' کا مسئلہ تو تخلیقِ آدم ہی کے وقت سے اِختلاف کا سب سے بڑا اور سب سے حَسَّاس موضوع رہا ہے: (التغابن:۲) ﴿ھو الذي خلقکم

فمنکم کافر و منکم مؤمن ﴾، اِبلیس کی شیطانی صفت اِسی مضمون کے پرچہ میں ناکامی سے ظاہر ہوئی، اِسی مسئلہ سے دُنیا میں گروہی اور جماعتی اِختلافات پیدا ہوئے، ہر دور میں حق و باطل کی معرکہ آرائی کی سب سے بڑی بنیاد یہی مسئلہ بنا، ابوالأنبیاء حضرتِ آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم الانبیاء حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک آنے والے سارے انبیائے کرام علیہم الصلاۃ والسلام کو مخالفتوں اور مشکلات کا سامنا اِسی ''اِسلام وکفر'' کے اِختلاف ہی کی وجہ سے کرنا پڑا، قومِ نوح، اور عاد وثمود سے لے کر، نمرود وفرعون، اور ابوجہل وابولہب تک جتنے مجرمین، اِسلامی تاریخ کے رجسٹر میں محفوظ کیے گئے ہیں یہ سب کفر کے مرتکب، اِسلام کے مخالف اور مسلمانوں کے دشمن ہی کی حیثیت سے یاد کیے جاتے ہیں۔

اہلِ اسلام کے لیے یہ مسئلہ اتنا اہم اور نازک رہا ہے کہ انھوں نے ہر طرح کے مشکل حالات ومصائب برداشت کرکے، اِس اِختلاف کو پوری طرح سے زندہ رکھا ہے، اور جان ومال، جاہ ومنصب اور عزت وآبرو؛ ہر چیز کی قربانی دے کر اپنی اور اپنی نسلوں کی ''کفر'' سے حفاظت کی فکر کی ہے۔

سیدنا حضرت اِبراہیم علی نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام کو اِسی وصف میں خصوصی امتیاز کی وجہ سے ''حنیف'' کے لقب سے ملقَّب فرمایا گیا، قرآنِ کریم میں آپ کا ''براءت من الکفر'' کا عمل بطورِ نمونہ ذکر کیا گیا:

(الممتحنۃ:۴): ﴿قد كانت لكم أسوة حسنة في إبراهيم والذين معه، إذ قالوا لقومهم إنا برآء منكم ومما تعبدون من دون اللّٰه، كفرنا بكم، وبدا بيننا وبينكم العداوة والبغضاء أبداً حتى تؤمنوا باللّٰه وحده﴾

(مسلمانو! تمہارے لیے ابراہیم اور ان پر ایمان لانے والوں میں بہترین اسوہ ہے، خاص طور پر ان کا وہ قول جو انھوں نے قوم کے ایمان نہ لانے والے لوگوں سے کہا تھا کہ ہم تم سے اور تمہارے باطل معبودوں سے بری ہیں، ہم تمہارے (عقائد کی وجہ سے

تم سے) بیزار ہیں، ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ بغض وعداوت ظاہر رہے گی جب
تک کہ تم اللہ وحدہ لاشریک پر ایمان نہیں لاتے)۔
اَصحابِ کہف کا اس کے علاوہ کوئی عمل نہیں ملتا کہ انہوں نے اللہ کی عبودیت کا
اقرار اور غیر اللہ سے براءت کا اظہار کیا تھا، مکہ مکرمہ میں صحابہؓ کرامؓ کو جن مشکل ترین
آزمائشی حالات کا سامنا کرنا پڑا اُس کا سبب بھی کفر اور اہلِ کفر سے بیزاری ہی تھی۔

فروعِ اسلام:

اِسلام میں افکار وعقائد کے علاوہ، جن اعمال واخلاق کا مثبت یا منفی حکم دیا گیا
ہے اُن کو ''فروعِ اِسلام'' کہتے ہیں، اِجمالی طور پر اُن کو پانچ شعبوں میں تقسیم کیا جاسکتا
ہے:

۱-: عبادات (نماز، روزہ، زکوۃ، حج، قربانی، قسم اور نذر وغیرہ)۔
۲-: معاملات (نکاح، طلاق، خرید وفروخت اور اجارہ وغیرہ)۔
۳-: معاشرت (ادب تمیز اور رہن سہن کے آداب، والدین، اہلِ قرابت،
پڑوسی، مہمان، مسافر، اہلِ اِسلام اور عام مخلوق کے حقوق)۔
۴-: اَخلاق (اچھے اوصاف کی تفصیلات، اور اُن کے اِختیار کرنے کی
ہدایات، بری عادات کا بیان، اور ان کے ترک کی تاکید)۔
۵-: سیاست (تدبیرِ منزل، انتظامِ حکومت، امورِ جہاں بانی، آدابِ حکم رانی،
اور حکام ورعیت کے حقوق)۔

اعمالِ صالحہ:

''اعمالِ صالحہ'' یہ ایک قرآنی اصطلاح ہے، جو ہر قدم اور ہر کام میں ''خلوصِ
نیت'' کا لحاظ کرنے، اور ''اتباعِ شریعت'' کا اہتمام کرنے سے عبارت ہے، اور یہ اپنے
وسیع مفہوم کے اعتبار سے ''فروعِ اِسلام'' کے پانچوں مذکورہ امور کو حاوی ہے، قرآنِ کریم

(اور احادیث متواترہ) میں واردشدہ فروعِ اِسلام کا شرعی حکم یہ ہے کہ اِجمالاً اِن کی مشروعیت کو تسلیم کرنا اِیمان کی بنیاد میں شامل ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص نماز وغیرہ کی (بہ ہیئت معہودہ) مشروعیت اور مطلوبیت کا اِنکار کرنے لگے تو قرآنی بیان کے مطابق ''کافر'' ہوجائے گا: (العنکبوت:۴۷) ﴿وما یجحد بآیاتنا إلا الکافرون﴾ (ہماری آیتوں کا اِنکار کافر ہی لوگ کرتے ہیں)، اور (الجن:۲۳) ﴿ومن یعص اللہ ورسولہ فإن لہ نار جھنم خالدین فیھا أبداً﴾ (اور جو بھی اللہ اور اُس کے رسول کی نافرمانی کرے گا تو یقیناً اُس کے لیے آتشِ دوزخ ہے، جس میں وہ ہمیشہ ہمیش رہے گا)۔

البتہ اِن پر عمل درآمد کرنے میں سستی یا لاپرواہی ہوجانے سے ''کفر'' کا حکم نہیں لگایا جاتا، بلکہ ایسا کرنے والے کو عاصی یا فاسق کہا جاسکتا ہے، قرآنِ کریم میں ہے: (التوبۃ:۱۰۲) ﴿وآخرون اعترفوا بذنوبھم خلطوا عملاً صالحاً وآخر سیئاً، عسی اللہ أن یتوب علیھم﴾ (اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو اپنے گناہوں کا اِقرار کرتے ہیں، اور اُن سے نیک کاموں کے ساتھ کچھ برے کام بھی سرزد ہوگئے ہیں، تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو معاف فرمادیں گے)۔

اعمالِ صالحہ کا تکملہ:

جس طرح ''اِسلام'' کی تکمیل، ''کفر'' (اور ایک خاص حد تک اہلِ کفر سے بھی) تبرّی پر موقوف ہے، اِسی طرح ''اَعمالِ صالحہ'' کا تکملہ: بداعمالیوں سے، اللہ ورسول کی نافرمانیوں سے (اور ایک خاص حد تک نافرمانوں سے بھی) اجتناب واحتراز پر موقوف ہے۔

اِختیاری اور غیر اِختیاری حالات:

اَفراد اور قوموں کے انفرادی اور اجتماعی حالات ہمیشہ یکساں نہیں رہتے، کبھی کوئی فرد بہت بااِختیار اور بڑی قوت وشوکت والا ہوتا ہے، اور پھر انقلابِ زمانہ سے بالکل ہی مسلوب الاختیار حتی کہ پابند سلاسل بھی ہوجاتا ہے، اِسی طرح بعض قومیں کبھی

حاکم وحاوی ہوتی ہیں، اور کبھی مجبور ومقہور، کبھی سپر پاور اور کبھی صفر حالت۔

اِسی لیے اِسلام نے دونوں طرح کے حالات کے لیے علیحدہ نصاب ونظام رکھا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی مکہ مکرمہ کی صبر آزما زندگی کو الگ نمونہ بنایا ہے، اور مدینہ منورہ کی خود مختار حیاتِ طیبہ کو الگ۔

ایک میں اِیمان واَعمالِ صالحہ کے ساتھ اگر صبر وتحمل اور عفو ودرگذر کا حکم دیا جارہا ہے، تو دوسری جگہ اِقدام واِرہاب اور جہاد وقتال کی عظیم الشان ذمہ داری سے بھی سرفراز فرمایا جارہا ہے، اِستخلاف وتمکین کا وعدہ پورا کرتے ہوئے امورِ جہاں بانی اور آدابِ حکم رانی بھی سکھلائے جارہے ہیں۔

لہٰذا قرآنِ کریم اور شریعتِ مطہرہ میں وارِد ہونے والے تمام اَوامر ونواہی کو ہمیشہ کے لیے دِل سے برحق تسلیم کرنا ایک مسلمان کا ہمہ وقتی فریضہ ہے: (یونس: ۶۴) ﴿لا تبديل لكلمات الله﴾ (اللہ کے کلمات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی)۔

پھر اُن پر عمل کرنا بھی حتی المقدور ضروری ہے، اور عمل نہ کرپانے کی صورت میں اپنی عاجزی اللہ کے سامنے پیش کردینی چاہیے جوکہ ہمارے حالات اور حقیقت سے خوب واقف ہے: (البقرة: ۲۲۰) ﴿واللّٰه يعلم المفسد من المصلح﴾ (اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ کون فساد پسند ہے اور کون اصلاح چاہتا ہے)، (البقرة: ۲۳۵) ﴿واعلموا أن اللّٰه يعلم ما في أنفسكم فاحذروه﴾ (اور سمجھ لوکہ اللہ تعالیٰ تمھارے دل کی سب باتیں جانتے ہیں، اِس لیے اُس سے ڈرتے رہو)۔

ناموافق صورتِ حال میں شرعی نصوص کو اپنے حالات وجذبات کے تابع کرنے کوشش میں نہیں لگ جانا چاہیے، کیوں کہ یہ عملی مشکل ایک تو وقتی اور عارضی ہے: (آل عمران: ۱۴۰) ﴿وتلك الأيام نداولها بين الناس﴾ (اور یہ اچھے برے دن تو لوگوں کے درمیان ہم اَدلتے بدلتے رہتے ہیں)، دوسرے یہ عارض خود ہماری اپنی

کمزوری اور عاجزی کی وجہ سے ہے: (الأنفال:٦٦) ﴿الآن خفف اللّٰــه عنكم وعلم أن فيكم ضعفاً﴾ (أب اللہ نے تم سے تخفیف کردی ہے، اور اُسے تمہاری کمزوری خوب معلوم ہے)، نہ کہ شریعت کی طرف سے کسی کمی اور نقص کی وجہ سے: (الروم:۳۰) ﴿ذلک الدين القيم، ولكن أكثر الناس لا يعلمون﴾ (یہی ہے سیدھا دین، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے)۔

کافر کون؟

یہ بات عرض کی جا چکی ہے کہ ''اِسلام'' کا مدار: اللہ کی وحدانیت کا اقرار کرنے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لانے، قرآنِ کریم کو اللہ کی کتاب مانتے ہوئے فیصل اور حَکَم تسلیم کرنے، اور یومِ آخرت کا یقین رکھنے پر ہے، جب کہ ''کفر'' کی بنیاد: اللہ و رسول کے انکار، یا اُن کے احکام و آیات سے اِستکبار و رُوگردانی پر ہے۔

لہٰذا جو قومیں یا اَفراد اللہ کو مانتے ہی نہیں، یا وجود کو تو تسلیم کرتے ہیں، مگر ذات و صفات میں یکتا نہیں مانتے، یا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اُس کا رسول نہیں مانتے، یا رسول تو مانتے ہیں، مگر اپنے لیے نمونۂ ہدایت اور اُسوۂ عمل نہیں قرار دیتے، یا قرآنِ کریم کو اللہ کی کتاب نہیں مانتے، یا ماننے کے باوجود اُس میں وارِد اَحکام و فرامین کو تسلیم نہیں کرتے، یا آخرت (قیامت، حشر، نشر، جنت، دوزخ وغیرہ) کے قرآنی تصور پر ایمان نہیں رکھتے، یہ سارے لوگ اِسلامی نقطۂ نظر سے اللہ کے باغی اور ''کافر'' ہیں۔

البتہ شرعی اصطلاح میں اللہ کے وجود کے منکر کو ''دہری''، اُس کی ذات یا صفات میں شریک کرنے والے کو ''مشرک''، اُس کے کسی حکم کا صریح اِنکار کرنے والے کو ''جاحد'' و ''مستکبر''، باطن میں کافر ہوتے ہوئے ظاہر میں اِسلام کا اِظہار کرنے والے کو ''منافق'' کہا جاتا ہے۔

اِسی طرح اپنے کو مسلمان کہنے کے باوجود خفیہ طور پر کسی کفریہ عقیدہ رکھنے والے

کو''ملحد'' و''زندیق''، اور اِسلام قبول کر لینے کے بعد کھلم کھلا کفر میں واپس جانے والے کو ''مرتد'' کہتے ہیں، اور قرآن وحدیث اور شرعی نصوص میں تحریف اور غلط سلط تفسیر وتاویل کرنے والوں کو''اہلِ زیغ'' اور''ضال'' و''مضل'' کہا جاتا ہے۔ نعوذ باللّٰہ من الکفر والشرك والنفاق، ومن سوء الأخلاق، والضلالة بعد الهداية، والحور بعد الکور۔

کافروں کا حبطِ أعمال:

اِن تمام اقسام کے کافروں کے''اعمالِ صالحہ'' کا؛ اُن کے کفر اور جرمِ بغاوت کی وجہ سے آخرت میں اللہ کے یہاں کوئی وزن اور اعتبار نہیں ہوگا: (الأنعام: ۸۸)
﴿ولو أشركوا لحبط عنهم ما كانوا يعملون﴾ (اور اگر انھوں نے شرک کیا تو ان کے سارے اعمال غارت ہوجائیں گے)۔

(المائدۃ: ۵) ﴿ومن يكفر بالإيمان فقد حبط عمله، وهو في الآخرة من الخاسرين﴾ (جو اِیمان لانے سے اِنکار کرے گا اُس کے سارے اعمال بے کار ہوجائیں گے، اور وہ آخرت میں گھاٹا اٹھانے والوں میں سے ہوگا)۔

(الکہف: ۱۰۳-۱۰۶) ﴿قل هل ننبئكم بالأخسرين أعمالاً، الذين ضل سعيهم في الحياة الدنيا وهم يحسبون أنهم يحسنون صنعاً، أولئك الذين كفروا بآيات ربهم ولقائه فحبطت أعمالهم فلا نقيم لهم يوم القيامة وزناً، ذلك جزاؤهم جهنم بما كفروا واتخذوا آياتي ورسلي هزواً﴾
(آپ فرمادیجیے کہ کیا ہم تمھیں بتائیں کہ وہ کون لوگ ہیں جو أعمال میں سب سے زیادہ ناکام ہیں، یہ وہ لوگ ہیں کہ دنیوی زندگی میں اُن کی ساری دوڑ دھوپ سیدھے راستہ (اِسلام) سے بھٹکی رہی، اور وہ سمجھتے رہے کہ وہ بہت اچھے کام کر رہے ہیں، یہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے پروردگار کی آیتوں (قرآن ودیگر آسمانی کتابوں) کا اور اُس کے سامنے پیش ہونے کا اِنکار کیا، اِس لیے اُن کے سارے أعمال غارت ہوگئے، لہٰذا ہم

بھی اُن کے اَعمال کا کوئی وزن اور قیمت نہیں لگائیں گے، اور اُن کی سزا دوزخ ہوگی، کیوں کہ اُنھوں نے کفر کی رَوِش اِختیار کی تھی، اور میری آیتوں اور میرے پیغمبروں کا مذاق اُڑایا تھا)۔

اِن کافروں کو جو کچھ دینا ہوگا؛ اللہ دنیا ہی میں دے دیں گے، اور آخرت میں صاف فرمادیں گے:

(لأحقاف:٢٠)﴿**ويوم يعرض الذين كفروا على النار، أذهبتم طيباتكم في حياتكم الدنيا واستمتعتم بها، فاليوم تجزون عذاب الهون بما كنتم تستكبرون في الأرض بغير الحق وبما كنتم تفسقون**﴾(اور اُس دن کو یاد رکھو جب اِن کافروں کو آگ کے سامنے پیش کیا جائے گا (اور کہا جائے گا کہ) تم نے اپنے حصے کی اچھی چیزیں اپنی دنیوی زندگی ہی میں پوری کرلیں، اور اُن سے خوب مزا اُڑالیا، لہٰذا آج تمھیں بدلے میں ذلت کی سزا ملے گی، کیوں کہ تم زمین میں ناحق اینٹھا کرتے تھے، اور نافرمانی کیا کرتے تھے)۔

مؤمن عاصی اور کافر میں فرق:

آخرت کے اعتبار سے مؤمنِ عاصی اور کافر میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ کافر جہنم میں ہمیشہ ہمیش رہے گا: (البقرة:٣٩)﴿**والذين كفروا و كذبوا بآياتنا أولئك أصحاب النار هم فيها خالدون**﴾(جن لوگوں نے کفر اِختیار کیا، اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا وہی لوگ جہنمی ہیں، جو اُس میں ہمیشہ رہیں گے)۔

اِس کے برخلاف اگر کسی کے پاس صرف ایمان ہو، اور اعمالِ صالحہ نہ بھی ہوں جب بھی وہ کبھی نہ کبھی بخشا جاسکتا ہے، اللہ تعالیٰ کا اِرشاد ہے: (الزمر:٥٣)﴿**قل يا عبادي الذين أسرفوا على أنفسهم لا تقنطوا من رحمة الله، إن الله يغفر الذنوب جميعاً**﴾(اے نبی! آپ (میری طرف سے میرے بندوں سے) کہہ دیجیے

کہ (اللہ تعالیٰ فرماتا ہے): اے میرے وہ بندو جنھوں نے (گناہ کر کے) اپنے آپ پر زیادتی کرلی ہے! تم اللہ کی رحمت سے مایوس مت ہو، یقیناً اللہ تعالیٰ تمام گناہ معاف فرمادیں گے)۔

اِس مضمون سے متعلق واردشدہ مختلف آیات وروایات کا خلاصہ یہ ہے کہ:

۱: اِیمان اور اعمالِ صالحہ دونوں کے ہوتے ہوئے، اللہ کے فضل سے، اُس کے وعدے کے مطابق نجات اور مغفرت ضرور ہوگی۔

۲: صرف اِیمان ہو، اعمالِ صالحہ نہ ہوں، تو معاملہ تحت المشیئۃ رہے گا، مگر بہر حال اللہ کے فضل وکرم سے کبھی نہ کبھی معافی ہو ہی جائے گی۔

۳: اِیمان نہ ہو، تو کبھی بھی مغفرت نہیں ہوگی؛ اعمالِ صالحہ ہوں یا نہ ہوں۔

یہ ہے "مذہب اِسلام" کے اصول وفروع کا اِجمالی خاکہ، اَب اِس کے بعد موجودہ دور میں بعض دجل پسند اور فتنہ پرداز لوگوں کی طرف سے کیے گئے اہم مذہبی اِنحرافات، اور "اِسلام" کے پردے میں تشکیکات وتلبیسات کے کارناموں پر بھی ایک نظر ڈالتے ہیں۔

فکرِ شاذ کا جائزہ
قرآن کریم کی روشنی میں

راشد شاز کا فتنہ

امت کی آزمائش کے طور پر ہر دور اور ہر زمانہ میں ایسے بدعقیدہ، اور بددین لوگ پیدا ہوتے رہے ہیں، جو کچھ تو اپنی کم علمی اور بدفہمی کی بنا پر اور کچھ حالات و ماحول سے مرعوبیت کی بنا پر اپنے دین وایمان کا سودا کرتے آئے ہیں، ابھی ماضی قریب میں صرف ہندوستان ہی میں غلام احمد قادیانی، عبداللہ چکڑالوی، اسلم جیراج پوری، غلام احمد پرویز، نیاز فتحپوری، اور عنایت اللہ مشرقی جیسے ننگ مذہب اور ننگ قوم لوگ تحریفِ دین اور اِنکارِ (حجیت) حدیث وغیرہ گمراہیوں کا اِرتکاب کر چکے ہیں۔

پھر پاکستان میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن، جاوید غامدی، عمار خاں ناصر وغیرہ کے فتنے پھیلے، اور اَب ہندوستان میں اَسرار عالم اور راشد شاز (ڈائریکٹر برج کورس، مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ) وغیرہ کے فتنے بھی اسی ''سلسلۃ الفتن'' کی آتشیں کڑیاں ہیں۔

ڈاکٹر راشد شاز کے ذریعے (''مسلم یونیورسٹی'' علیگڑھ کے پلیٹ فارم سے، برج کورس کے پردے میں) اٹھنے والے ''فتنے'' نے اردو زبان میں برپا کی جانے والی تشکیکات وتلبیسات کے اَب تک کے سارے ریکارڈ توڑ دیئے ہیں، بعض حضرات اس کو صرف ''اِنکارِ حدیث'' کا فتنہ سمجھ رہے ہیں، مگر چند ایام قبل ان کا بعض مطبوعہ لٹریچر دیکھنے کا اتفاق ہوا تو اندازہ ہوا کہ یہ تو ''اِنکارِ قرآن'' اور ''اِنکارِ دین'' کا بھی فتنہ ہے، جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ماننے والوں کو پولس نامی ایک یہودی نے گمراہ کیا تھا، اِسی طرح اِس وقت دنیائے یہودیت ''اہلِ اِسلام'' کی طرف متوجہ ہے، ڈاکٹر شاز کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''......اہلِ یہود کے ہاں اِس حیلِ شرعی کے ذریعہ دینوی علوم پر لگی پابندی کا جو بند ٹوٹا ہے تو پھر یہ سلسلہ رو کے نہیں رکا، دیکھتے دیکھتے انیسویں اور بیسویں صدی میں قومِ یہود سے علماء و مفکرین کی ایک فوج نکل آئی، جن کے دل و دماغ نے انیسویں اور بیسویں صدی کی بساط سجانے میں کلیدی رول ادا کیا، اہلِ یہود کے اِس تجربہ میں ہم مسلمانوں کے لیے عبرت کا ایک بڑا سامان پوشیدہ ہے''۔
(مستقبل کی بازیافت، ص ۱۵۴، اشاعت ۲۰۰۵ء، از: راشد شاز)۔

جہاں تک ڈاکٹر شاؔز کی انفرادی بات ہے، تو اس قماش کے لوگ امت کی مختلف قسم کی آزمائشوں کا ایک حصہ بن کر ہر زمانہ میں ظاہر ہوتے رہے ہیں، مگر افسوس اُن بے شعور نادانوں اور محروم و مفتون اِنسانوں پر ہوتا ہے، جو اگلوں کے انجام سے سبق لینے کے بجائے، ہر بعد والے ''شاذ'' افراد کے پیچھے آنکھیں بند کر کے دوڑ پڑتے ہیں، اور جو لوگ کہ اپنی دنیا کے ایک معمولی سے کام کے لیے، اور تھوڑے سے پیسے بچانے کے لیے نا معلوم کتنے لوگوں سے مشورے کرتے ہیں، اور کتنے ماہرین کی آراء دریافت کرتے ہیں، وہی لوگ دین کے معاملے میں کتنی سادہ دلی اور سہل انگاری سے کام لیتے ہیں۔

یہ بات بھی کتنی عبرت کی ہے کہ ''تقلید'' کو برا کہتے ہوئے وہ اِس موڑ پر پہنچتے ہیں کہ مستند اہل علم و فضل اور معتمد اہل تدین و تقوی کی فہم و بصیرت پر اعتماد نہ کر کے، کتنے ظلمت خیز اور تاریک انجام، قعرِ مذلت میں جا پڑتے ہیں!

بہر حال یہ سن کر خوشی بھی بہت ہوئی کہ اہلِ حق کی طرف سے بھی بعض مخلص اور فکر مند حضرات، ڈاکٹر شاؔز کے اِس نئے فتنے کی سرکوبی کے لیے مستعد ہو گئے ہیں، انھی میں سے بعض احباب نے راقم کو بھی اِس طرف متوجہ کیا، اُن ہی کی تحریک پر توکلاً علی اللہ اس دینی ذمہ داری کو قبول کرتے ہوئے، اپنے اِس مضمون میں، شاؔز صاحب کے بعض مذہبی اِنحرافات، اور ''علم'' و ''عقل'' اور ''نقل'' کے تینوں موضوعات میں کی گئی اُن کی تلبیسات کے کھلے ہوئے نمونے بھی دکھلائے گئے ہیں، اور قرآن کریم کی روشنی میں اُن پر

سنجیدہ علمی رد کی بھی کوشش کی گئی ہے۔

مضمون کے اِس حصہ میں قارئین کرام کو کہیں کہیں طوالت کا اِحساس بھی ہوسکتا ہے، اُس کی وجہ: مسئلہ کی اہمیت کے پیش نظر اپنے خالی الذہن قارئین کی بحد اِمکان تسلی اور تشفی کا سامان فراہم کرنا ہے، اور بس۔

جہاں تک ہم نے شاز کے لٹریچر کا جائزہ لیا ہے، اُس سے ہم تو اسی نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ صاحب عملاً تو "قرآن کریم" کو بھی نہیں مانتے، مگر زبانی طور پر اُن کا یہی دعوی ہے کہ (عقل کے بعد؟) قرآن کریم ہی ایسی واحد کتاب ہے جس کو حجت اور دلیل کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے، اِس لیے زیر نظر مضمون میں شاز کے رد کی حد تک قرآن کریم اور عقل سلیم ہی سے استدلال کیا گیا ہے۔

البتہ بعض شرعی مسائل کو سمجھانے، اور اپنے مسلمان بھائیوں کی خدمت میں بعض موضوعات کی وضاحت پیش کرنے کے لیے، اَحادیث شریفہ سے بھی احتجاج کیا گیا ہے، جو مسلمانوں کے نزدیک نہ صرف قرآن کریم کی شرح وتفسیر، بلکہ خود بھی من جملہ دلائل شرعیہ کے ایک دلیل، اور حجتِ مستقلہ ہے۔

اگلے چند صفحات میں ڈاکٹر شاز ہی کے مذہبی اَفکار سے بحث کی گئی ہے، ظاہر ہے کہ یہاں اِس موضوع کا، اور اُن کی کتابوں کا کوئی اِحاطہ اور استقصا مقصود نہیں ہے، صرف اتنی بات پیش نظر ہے کہ ہمارے مسلمان بھائیوں کو یہ سمجھ میں آجائے کہ دجل پسند اَفراد کس طرح حق وباطل میں خلط کرتے ہیں، اور مذہب کے سلسلے میں ضروری علم وفہم نہ رکھنے والے مسلمانوں کے جذبات سے کس طرح کھیلتے ہیں، علمی وتاریخی معلومات اور دینی ومذہبی اَفکار ونظریات میں شکوک وشبہات کے کیسے کیسے بیج بوتے، اور دجل وتلبیس کے کیسے کیسے گل کھلاتے ہیں:

﴿فأما الذين في قلوبهم زيغ فيتبعون ما تشابه منه؛ ابتغاء الفتنة

وابتغاء تاويله﴾ (آل عمران:۷)۔
(جن لوگوں کے دلوں میں کھوٹ (اور کجی) ہوتی ہے وہ متشابہات ہی کے درپے ہوتے ہیں، اور اُن کا مقصد: (تحقیقِ حق اور عمل کے بجائے) دوسروں کو شکوک وشبہات میں ڈال کر (شورش پیدا کرنا) اور (ایک مخفی چیز کی بے مقصد) کرید میں لگنا ہوتا ہے)۔

اللہ تعالیٰ ستاری کا معاملہ فرماتے ہوئے محض اپنے فضل وکرم سے اِس کوشش کو قبول فرمائیں، دنیا اور آخرت ہر اعتبار سے کامیاب فرمائیں، میرے لیے ذخیرۂ آخرت اور برادرانِ اِسلام کے لیے دینی ہدایت واستقامت کا ذریعہ بنائیں، آمین۔

إن أريد إلا الإصلاح ما استطعت، وما توفيقي إلا بالله، عليه توكلت وإليه أنيب، وصلى الله تعالىٰ علىٰ خير خلقه محمد وآله وأصحابه أجمعين، وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين۔

راشد شاز کی طرف سے
اُصولِ اِسلام میں کی گئی بعض تلبیسات

ا-:''دین'' کے مفہوم میں تحریف:

لفظِ'' الـدِّیـن '' قرآن کریم میں عام طور پر دو معنوں کے لیے اِستعمال ہوا ہے: ایک ''بدلے'' کے معنی میں: (الفاتحہ:۳) ﴿مالک یوم الدین ﴾، دوسرے طاعت وعبادت اور بندگی کے ''طریقے'' کے معنی میں: (آل عمران: ۱۹) ﴿إن الـدین عند الله الإسلام﴾، (المائدۃ:۳) ﴿رضیت لکم الإسلام دیناً﴾، (الأعراف:۲۹) ﴿وادعوہ مخلصین له الدین﴾۔

اِس کے برعکس شاز کی ہرزہ گوئی ملاحظہ ہو:

''......واضح رہے کہ قرآن مجید میں لفظ ''دین'' سے مراد رسومِ عبودیت، فقہی علوم، یا نماز، روزے اور طہارت کے مسائل نہیں ہیں، بلکہ اس سے مراد خدا شناسوں کا اجتماعی نظام ہے، اور کسی اجتماعی نظام کو چلانے کے لیے امورِاجتماعیت کے ایسے ماہرین، جو وحی کی غایت سے واقف ہوں، اُن کی اہمیت سے اِنکار نہیں کیا جا سکتا، البتہ یہ کہنا کہ اِس آیت کے مخاطب موجودہ دور کے طبقہ ٔ علماء ہیں، تو یہ دراصل قرآن مجید کی اِس آیت کا مذاق اڑانا ہے، جب یہاں ''دین'' سے مراد علماء کا مزعومہ دین نہیں تو پھر اس ''دینِ علماء'' کے ماہرین، قرآن کے مخاطب کیسے ہو سکتے ہیں''

(تشکیلِ جدید، ص ۲۷-۲۸، از: راشد شاز)۔

اِس اقتباس میں:

۱: ''دِین'' کی مشہور ومتوارث تفسیر چھوڑ کر، ایک نئی تشریح اِیجاد کرنے کی کوشش کی گئی ہے، مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کے یہاں جو اُبھی تک ''دیندار طبقے'' کا مصداق: ''علمائے کرام'' اور نماز روزہ وغیرہ عبادات کا اہتمام کرنے والوں کو سمجھا جاتا ہے، وہ قدیم تصور ختم ہو جائے، اور یونیورسٹیز اور کالجز کے اُن لوگوں کو ''دیندار'' سمجھا جانے لگے، جو گزشتہ ڈیڑھ سو سالوں سے ''دین'' کو بازیچۂ اطفال بنانے کی ناکام سعی میں مصروف ہیں، کیوں کہ جب تک ''دینداری'' کا موجودہ تصور باقی ہے، جبھی تک ''دین'' کی تشریحات وتعبیرات پر (بقول شاؔز) ''علماء'' کی اِجارہ داری ہے! اور جب یہ تصور ہی بدل جائے گا تو پھر اُن کا یہ حق دعویٰ خود بخود ختم ہو جائے گا۔

۲: مذکورہ اقتباس میں ''خدا شناسوں کا اجتماعی نظام''، ''امورِ اجتماعیت کے ماہرین''، اور ''وحی کی غایت سے واقفیت'' کی باتیں: یہ سب ایسے خوش نما الفاظ ہیں، جن کا استعمال تجدد پسندوں اور ملحدین کی طرف سے مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے لیے کیا جاتا ہے، آخر وہ کون سے ''خدا شناس'' لوگ ہیں جو ''رسومِ عبودیت'' سے بھی بے نیاز ہیں، جب کہ قرآن مجید کا مطالبہ تو تمام لوگوں سے بس یہ ہے: (البینۃ: ۵) ﴿وما أمروا إلا ليعبدوا الله مخلصين له الدين حنفاء، ويقيموا الصلوٰة ويؤتوا الزكوٰة وذلك دين القيمة﴾ (لوگوں کو صرف اِس بات کا حکم دیا گیا تھا کہ وہ اللہ کی بندگی کریں اِس طرح، کہ بندگی ہو اِخلاص کے ساتھ صرف اُسی کی، بالکل اُسی کے ہو کر، اور نماز قائم کریں، زکوۃ دیا کریں، اور یہی سیدھی سچی امت کا دین ہے)۔

اِس آیت میں اچھی طرح واضح کر دیا گیا ہے کہ لفظِ ''دین'' سے اصل اور اولین مراد: رسومِ عبودیت، اِخلاص وللّٰہیت اور نماز وزکوٰۃ وغیرہ کے مسائل ہی ہیں، اور بقیہ امور دیگر نصوص کی بناء پر، معاونِ ''دین'' کی حیثیت سے مراد لے لیے جاتے ہیں،

بذاتِ خود مقصود نہیں ہیں۔

صحابۂ کرامؓ جنھیں ﴿والذین اتبعوھم باحسان﴾ (التوبۃ:۱۰۰) کے ارشاد کے ذریعہ قیامت تک کے لیے ''معیارِ حق'' قرار دے دیا گیا ہے، اُن کا تعارف کراتے ہوئے، قرآن کریم نے بھی کیسی عجیب علامت ذکر فرمائی: (الفتح:۲۹) ﴿تراھم رکعاً سجداً یبتغون فضلاً من اللہ ورضواناً، سیماھم في وجوھھم من اثر السجود﴾ (تم ان-صحابہ-کو دیکھوگے؛ یا رکوع کرتے، یا سجدے کرتے، اللہ کے فضل اور خوشنودی کی تلاش میں، اُن کی پہچان: اُن کے چہروں (پیشانیوں) میں سجدوں کے نشانات ہیں)۔

یہ ہے وہ دین جس کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں سے مطالبہ ہے، نہ کہ ''اُفقِ مغرب'' سے اُٹھنے، اور ''مغربی تعلیم گاہوں'' سے پھیلنے والا دین!

۳: مذکورہ آیات سے شاذ کی اِس بکواس کا بھی شافی جواب ہوگیا کہ:

''...... جب یہاں ''دین'' سے مراد علماء کا مزعومہ دین نہیں تو پھر اس ''دینِ علماء'' کے ماہرین، قرآن کے مخاطب کیسے ہوسکتے ہیں''

حالاں کہ قرآنی اصطلاح میں ''اہلِ علم'' کہا ہی اُن لوگوں کو جاتا ہے جن کے سینوں میں قرآنی آیات ہوں، جیسا کہ یہ صریح نص موجود ہے: (العنکبوت:۴۹) ﴿بل ھو آیات بینات في صدور الذین أوتوا العلم﴾ (بلکہ یہ-قرآن- ایسی روشن آیات ہیں جو ''اہلِ علم'' کے سینوں میں محفوظ ہیں)۔

یا اُن لوگوں کو عالم کہا جاتا ہے جو نماز وغیرہ کے مسائل سے واقف ہوں، جیسا کہ اِس آیت میں اِشارہ کیا جارہا ہے: (الزمر:۹) ﴿أمن ھو قانت آناء اللیل ساجداً وقائماً یحذر الآخرۃ ویرجو رحمۃ ربہ، قل ھل یستوي الذین یعلمون والذین لا یعلمون﴾ (کیا وہ شخص جو آخرت کے خوف سے رات کے اوقات میں سجدے کی حالت میں اور کھڑے ہوکر عبادت کرتا ہو، اور اپنے

رب کی رحمت کا امیدوار ہو- وہ اور کافر لوگ برابر ہو سکتے ہیں؟-، آپ فرمایئے کہ کیا وہ لوگ جو علم رکھتے ہیں اور وہ جو علم نہیں رکھتے؛ برابر ہو سکتے ہیں؟)۔

جب یہاں عبادت، سجدہ اور قیام وقنوت وغیرہ کا بیان چل رہا ہے تو ظاہر یہی ہے کہ انھیں امور کے جاننے، نہ جاننے کی گفتگو بھی ہوگی، بلکہ رازیؒ وغیرہ نے اس کی تصریح بھی کردی ہے۔

۲-: مسلمان ہونے کے لیے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کو ضروری قرار نہ دینا:

قرآنِ کریم میں جابجا یہ مضمون کھول کھول کر بیان بھی کیا گیا ہے، اور گذشتہ صفحات میں قرآنی دلائل کی روشنی میں یہ عرض بھی کیا جاچکا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد، اللہ تعالیٰ نے ''اِسلام وکفر'' کا پیمانہ آپ کی ذات کو بھی قرار دے دیا ہے، لہٰذا جن لوگوں تک آپ کی رسالت کا ذکر پہنچ چکا، اُن کے لیے آپ پر اِیمان لائے بغیر، اور لا إلـه إلا الله کے ساتھ ساتھ محمد رسول الله کہے بغیر، کفر سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں، اور یہ بات بھی واضح کی جاچکی کہ کفر پر مرجانے والوں کے نیک اعمال بھی حبط ہوجاتے ہیں، اِس لیے اُن پر ''عملِ صالح'' کا اِطلاق اِبلیسی تلبیس ہے، اِسی تلبیسِ ابلیس کا نمونہ مندرجہ ذیل عبارت بھی ہے:

> ''بلکہ اِس سے بھی بڑھ کر ''عمل صالح'' کے وہ حاملین بھی جن کا تعلق دوسرے اِیمانی طائفوں سے ہے، مثلاً یہود ونصاریٰ اور صابئین تو ایسے خداشناسوں اور فکرآخرت رکھنے والوں کو بھی عطائے ربی ﴿اجرهم عند ربهم﴾ اور ہر قسم کے خوف وحزن سے نجات ﴿لاخوف عليهم ولاهم يحزنون﴾ کا مژدہ سنایا گیا ہے، گویا ''اہلِ ایمان'' خواہ اُن کا تعلق کسی بھی نبوی طائفے سے ہو؛ اگر وہ عمل صالح کی راہ پر چل نکلیں تو دنیا وآخرت کی کامیابی ان کا مقدر بن جاتی ہے''۔
>
> (تشکیل جدید، ملخصاً ص ۴۷، از: راشد شاز)۔

"......البتہ کسی کو یہ خیال نہ ہو کہ انبیائے سابقین کی دوسری امتیں یا متقین کے دوسرے گروہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اِس عظیم نبوی تحریک سے باہر کر دیئے گئے ہوں، بات صرف اتنی ہے کہ آخری وحی کے حاملین کی حیثیت سے جہاں "متبعین محمد" کو کلیدی اور مرکزی کردار ادا کرنا ہے، وہیں دوسری اقوام کے متبعین کو بھی اِس انبیائی تحریک میں اپنی بساط بھر شریک ہونا ہے، کہ اِنسانیت کی فلاح کا کوئی وسیع پروجیکٹ وسعتِ نظری اور وسعتِ قلبی کے بغیر انجام نہیں پا سکتا......"۔

(مستقبل کی بازیافت، ص ۴۵، از: راشد شاز)۔

"ایک نئی ابتداء کے لیے لازم ہے کہ ہم دیگر ایمانی طائفوں کے سلسلے میں قرآن کی روشنی میں اپنے "فقہی رویے" کا فی الفور محاسبہ کریں، شِبہ اہلِ کتاب کے سلسلے میں بھی بعض سیاسی اور مذہبی عوامل کے تحت گفتگو کا دروازہ صدیوں سے بند ہے ......، اگر اہلِ ہنود کے بعض طائفے شِبہ اہل کتاب کے معیار پر پورے اترتے ہیں، اگر ان کے یہاں بھی خدا، "رسالت"، آخرت، کتاب اور عملِ صالح کا تصور پایا جاتا ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ انھیں کلمۃ سواء کی بنیاد پر اِسلام کے آفاقی مشن میں کھلے عام شرکت کی دعوت نہ دی جائے......"۔

اِن اقتباسات میں خلطِ مبحث اور دجلِ حق کی بدترین مثالیں جمع ہیں:

۱: جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بعثت سے لے کر قیامت تک آنے والے تمام انسانوں کی طرف مبعوث ہیں: ﴿قل یا أیها الناس إني رسول اللّٰه إلیکم جمیعاً......فاٰمنوا باللّٰه ورسوله النبي الأمي﴾ (آپ فرما دیجیے! اے لوگو! میں تم تمام لوگوں کی طرف مبعوث کیا گیا رسول ہوں ......، لہٰذا تم سب لوگ اللہ پر بھی اِیمان لاؤ، اور اُس کے اُس رسول پر بھی جو نبیٔ اُمّی ہیں)، تو آپ پر ایمان لائے بغیر کسی کا اِیمان معتبر کیسے ہو سکتا ہے؟ اور وہ "اِیمانی طائفوں" میں داخل کیوں کر ہو سکتا ہے؟

۲: حتی کہ اللہ نے اپنی محبت اور تعلق کا معیار بھی آپ کی پیروی ہی کو قرار دے دیا ہے: (آل عمران: ۳۱) ﴿قل إن کنتم تحبون اللّٰه فاتبعوني یحببکم اللّٰه ویغفر

لکم ذنوبکم﴾ (آپ فرما دیجیے! اگر تمھیں اللہ سے محبت ہے تو میرا (نبی کا) اِتباع کرو، اللہ بھی تم سے محبت فرمانے لگیں گے اور تمہارے گناہ بھی معاف فرما دیں گے)۔

اِس آیت سے معلوم ہوگیا کہ اللہ کے یہاں وہی اِیمان، وہی تقوی، وہی عملِ صالح اور وہی تعلق مع اللہ معتبر ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کے ذریعہ سے ہو، اُس کے بغیر نہ تو کسی ''نبوی طائفے'' کا اِیمان معتبر ہے، اور نہ کسی ''اِیمانی طائفے'' کا عمل۔

۳: بلکہ اللہ تعالیٰ نے تو سیدنا حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی سے فرمادیا تھا: (الأعراف:۱۵۶-۱۵۷)﴿ورحمتي وسعت كل شيء، فسأكتبها للذين يتقون ويؤتون الزكوة والذين هم بآياتنا يؤمنون، الذين يتبعون الرسول النبي الأمي الذي يجدونه مكتوباً عندهم في التوراة والإنجيل ......﴾(اور میری رحمت تمام چیزوں کو حاوی ہے، مگر آئندہ میں اُس کو انہی لوگوں کے لیے مقدر کروں گا جو تقوی اختیار کریں گے، زکوۃ دیا کریں گے، اور ہماری آیات پر ایمان لائیں گے، اُس رسول اور نبیٔ اُمّی کا اتباع کریں گے جس کو وہ اپنی توریت اور انجیل میں لکھا پائیں گے)، بتائیے! کیا اِس کے بعد بھی کسی صراحت کی ضرورت رہ جاتی ہے؟

۴: پھر اِسی آیت سے ''كلمة سواء بيننا وبينكم'' کا مصداق بھی متعین ہوجاتا ہے، کہ اے اہل کتاب! اللہ کے جو احکام تمہاری کتابوں میں بھی ہیں، اور قرآنِ مجید میں بھی ہیں؛ آؤ اُن سب کا تتبع کرلیں، اور کم از کم اسی پر ہم سب متفق ہوجائیں، اور جب توریت وانجیل (اور دیگر آسمانی کتابوں) میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت میں نبیٔ آخر الزماں کی بعثت کا ذکر ہے، تو تمھیں وہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا۔

۵: یہود ونصاریٰ (اور دیگر اہلِ کتاب یا شبہ اہلِ کتاب) کو ''اِیمانی طائفے'' میں داخل کرنے کے خواہش مند لوگوں نے قرآنِ کریم کی اِس آیت پر تو غور کیا ہوگا:

(المائدۃ:٦٨) ﴿قل یا أهل الکتاب لستم علی شيء حتی تقیموا التوراة والإنجیل وما أنزل إلیکم من ربکم، ولیزیدن کثیراً منهم ما أنزل إلیک من ربک طغیاناً وکفراً، فلاتأس علی القوم الکافرین﴾

(آپ فرما دیجیے: اے اہل کتاب! جب تک تم توریت اور اِنجیل اور جو (کتاب) تمہارے پاس (اب) بھیجی گئی ہے اس کی پوری پابندی نہیں کرو گے، تم کسی راہ پر نہیں (بلکہ بے راہ ہو)، اور جو وحی آپ پر نازل کی گئی ہے وہ اُن میں سے بہت سوں کی سرکشی اور کفر میں مزید اِضافہ کرے گی، اِس لیے آپ اِن کافروں پر افسوس نہ کیجیے گا)۔

اِس آیت سے یہ بات معلوم ہوئی کہ ''اِیمانی طائفوں'' میں شمولیت کے لیے، مطلق ''اہلِ کتاب'' میں سے ہونا کافی نہیں، بلکہ آخری کتابِ ہدایت ''قرآن کریم'' پر بھی ایمان لانا ضروری ہے، اور اَب اس پر ایمان لانا اور نہ لانا ہی حق و باطل کی پہچان بن چکا ہے۔

٦: کفر کرنے والوں کے بارے میں قرآن کریم میں اِس طرح کے اَلفاظ وارد ہوئے ہیں: ﴿إن شر الدواب﴾ (الأنفال:۵۵)، ﴿أولئک کالأنعام بل هم أضل﴾ (الأعراف:۱۷۹)، اور ﴿شر البریة﴾ (البینۃ:٦)......، اَب جو لوگ صرف قرآنی گفتگو کے مدعی ہیں اُن کو بتانا چاہیے کہ پھر یہ اہل کفر اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے منکرین کس طور پر ''اِنسانیت'' کے دائرے میں آسکتے ہیں؟!

واضح رہے کہ حسن اَخلاق، صفائی معاملات اور آدابِ معاشرت یہ الگ چیزیں ہیں، جو اِسلام کے اہم اَحکام اور بنیادی اَجزاء میں سے ہیں، جیسا کہ ان کی تفصیلات کتاب وسنت میں وضاحت کے ساتھ مذکور ہیں، جب کہ ''اِنسانیت'' کی آڑ میں وحدتِ اَدیان کی ذہن سازی، اقوام اور ملتوں کے مابین مذہبی امتیازات کا اِنکار......وغیرہ، یہ اس زمانہ کے خطرناک فتنوں میں سے ہے، جو اہل علم کی خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔

''اہلِ کتاب'' سے متعلق غلط فہمی کا ازالہ:

اِس موقع پر اہلِ اِسلام کو اِن ملحدین کی ایک اور مغالطہ آمیزی سے ہوشیار رہنا ضروری ہے، وہ یہ کہ یہ لوگ اہل کتاب اور اُنبیائے سابقین علیہم الصلوٰۃ والسلام کے مسئلے میں خلط کرتے ہیں، حالاں کہ یہاں چار امور ہیں:

۱: تمام انبیائے سابقین کو بلا تفریق اللہ کا پیغمبر اور نبی تسلیم کرنا، یہ جزوِ دین اور لازمۂ اِیمان ہے، اِس کے بغیر مطلوبہ اِیمان حاصل ہی نہیں ہوسکتا۔

۲: ان انبیائے سابقین پر نازل ہونے والی کتابوں کو برحق اور منزّل من اللہ ماننا، مگر نزولِ قرآن سے اُن کو منسوخ تسلیم کرنا۔

۳: ان انبیائے سابقین کے منتسبین میں جو لوگ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے کے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ لوگ آپ پر اِیمان کی دعوت کے نہ مخاطب ہیں نہ مکلّف، اِس لیے اگر وہ اپنے اپنے وقتوں میں اُس وقت کی شریعت کے پابند تھے، تو اُن کو ''ایمانی طائفے'' میں شمار کرنا۔

۴: وہ اہل کتاب جو آپ کی بعثت کے بعد کے ہیں، یہ اگر آپ پر اِیمان نہیں لاتے، اور آپ کو اپنے لیے اُسوہ نہیں مانتے تو قرآنی بیان کے مطابق ان کو کافر سمجھنا، اور ان سے تبرّی کرنا۔

۳-: قرآنِ کریم کے معانی میں تحریف:

الف: سورۂ تکویر کے ترجمہ وتفسیر میں تحریف:

پارۂ عم میں سورۂ تکویر کی ابتدائی آیات میں صور پھونکے جانے اور قیامت کے قائم ہونے کی منظر کشی کی جارہی ہے، اور بتایا جارہا ہے: (۱-۱۴) ﴿**إذا الشمس كورت، وإذا النجوم انكدرت، وإذا الجبال سيرت، وإذا العشار عطلت، وإذا الوحوش حشرت، وإذا البحار سجرت، وإذا النفوس**

زوجت، وإذا الموءدة سئلت، بأي ذنب قتلت، وإذا الصحف نشرت، وإذا السماء كشطت، وإذا الجحيم سعرت، وإذا الجنة أزلفت، علمت نفس ما أحضرت ......﴾۔

(جب سورج لپیٹ دیا جائے گا، جب ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر گر جائیں گے، جب پہاڑ چلا دیئے جائیں گے، جب دس ماہ کی گابھن اونٹنیاں بھی چھٹی پھریں گی (کوئی اُن کا پرسان حال نہ ہوگا)، جب وحشی جانور بھی اکٹھے کر لیے جائیں گے، جب سمندر بھڑکا دیئے جائیں گے، جب لوگوں کے جوڑے جوڑے بنا دیئے جائیں گے (مؤمنین ایک طرف، کفار ایک طرف، صالحین الگ، فاسقین الگ)، اور جب زندہ درگور کی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس جرم میں قتل کی گئی تھی؟ جب صحیفے (اعمال نامے) کھول دیئے جائیں گے، جب آسمان کی پرتیں اتار دی جائیں گی، جب دوزخ بھڑکا دی جائے گی (اُس کے مستحقین کے لیے)، اور جب جنت قریب لے آئی جائے گی (متقیوں کے لیے)، تو اُس وقت جان لے گا ہر شخص اُن اعمال کو جنھیں وہ آگے بھیجتا رہا ہے......)۔

یہ قیامت اور اُس میں پیش آنے والے واقعات کا بالکل واضح بیان ہے، مگر سائبر اسپیس کی دنیا میں جینے والوں نے اِس میں تحریف وتبدیل کر کے اِس کو انٹرنیٹ کی دنیا کا مضمون بنا دیا:

> ''جب لوگ باہم ملا دیئے جائیں گے، جب نوزائیدہ درگور بچی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس جرم کی پاداش میں قتل کی گئی،'' جب صحیفوں کی نشرواشاعت کی کثرت ہوگی''، جب جنت قریب لے آئی جائے گی، تب ہر شخص کو پتہ چل جائے گا کہ وہ اپنے لیے کیا لایا ہے''۔ (مستقبل کی بازیافت، ص ۲۷)۔

یہ اِن آیات کا ترجمہ کیا گیا ہے: **﴿وإذا النفوس زوجت، وإذا الموءدة سئلت، بأي ذنب قتلت، وإذا الصحف نشرت، وإذا الجنة أزلفت، علمت نفس ما أحضرت﴾۔**

۱: پہلی بات یہ کہ اِس سیاق میں ''جہنم'' کے ذکر پر مشتمل درمیانی آیت چھوڑ دی گئی، جو افسوس ناک خیانت کا نمونہ ہے۔

۲: دوسری بات یہ کہ ﴿وإذا الصحف نشرت﴾ کا ترجمہ کیا گیا ہے: ''جب صحیفوں کی نشر و اِشاعت کی کثرت ہوگی''، حالاں کہ سیاق وسباق سے اِس ترجمے کا کوئی ربط ہی نہیں ہوسکتا، اِس کا صحیح ترجمہ ومطلب اوپر گذر چکا: اور جب صحیفے (اعمال نامے) کھول دیئے جائیں گے۔

۳: تیسری بات یہ کہ اِس ترجمہ ہی کی تحریف پر اکتفاء نہیں کیا گیا، بلکہ اِس کے بعد تفسیر میں مزید جسارت یہ کی گئی ہے:

> ''سورۂ تکویر کی اِن آیات کا مطالعہ کرتے ہوئے ذہن برملا سائبر اسپیس کی طرف منتقل ہوجاتا ہے، اور کیوں نہ ہو قرآن مجید جس ذات باری کا کلام ہے وہ زمان ومکان کے فرق سے ماوراء، چیزوں کو اس کی اصل ماہیت کے ساتھ اِس طرح دکھاتا ہے گویا ازل تا ابد بجلی کی ایک چمک اور بصیرت کی ایک رعد کے ساتھ سب کچھ اچانک ایک لمحے کے لیے منور ہوگیا ہو۔
>
> عام اِنسانی دنیا سے ماوراء ایک ایسے (ورچوئل ورلڈ) کا وجود میں آجانا جہاں کروڑہا کروڑ نفوس ایک دوسرے سے بحث ومباحثہ اور باہمی استفادے میں مشغول ہوں، ایک حیرت ناک وقوعے سے کم نہیں، ''عالمِ محسوسات سے پرے'' ایک ایسی اِضافی دنیا کا وجود جو مسلسل ہماری زمینی زندگی کو متاثر کررہی ہو، اب ایک ایسی حقیقت ہے جسے مزید نظر انداز کرنا اَب ماضی پرست قوموں کے لیے بھی ممکن نہیں رہا۔
>
> صحیفوں کی نشر واِشاعت کا یہ عالم ہے کہ جس موضوع پر بھی بٹن دبایئے معلومات کا ایک لامتناہی سمندر موجود ہے......''۔

اِس اقتباس پر بظاہر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں، البتہ اِس طرف توجہ دلادینا مناسب ہے کہ اِس اقتباس کے ظاہر سے ایسا محسوس ہورہا ہے کہ اِس کا لکھنے والا ''روزِ آخرت'' اور ''یومِ قیامت'' کے معہود تصور کا قائل نہیں، بلکہ وہ قرآن کریم میں بیان کردہ

اِن امور کو سائبر اسپیس کی دنیا کی ترقی یافتہ شکل مانتا ہے؟! واللہ اعلم۔

ب: لوحِ محفوظ سے متعلق ایک آیت کے مفہوم میں تحریف:

ساتویں پارے میں سورۂ اَنعام (۳۸) میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وما من دابة في الأرض ولا طائر يطير بجناحيه إلا أمم أمثالكم، ما فرطنا في الكتاب من شيء﴾ (جو جاندار روئے زمین پر ہیں، یا جو پرندے فضا میں اڑ رہے ہیں، وہ تمہاری ہی طرح ایک مستقل مخلوق ہیں، اور ہم نے کتاب میں کوئی چیز درج کرنے سے باقی نہیں چھوڑی)۔

اِس آیت میں ''لوحِ محفوظ'' کا واضح تذکرہ ہے، اور قرآن کریم سے الگ اُس کے مستقل وجود کا ذکر ہے، مگر شاذ چونکہ ''تقدیر'' کا منکر ہے، اور اُس کے نتیجے میں ''لوحِ محفوظ'' کے بھی وجود کا اِنکار کرتا ہے (جیسا کہ اِس کی تفصیل بھی آتی ہے)، اور دوسری طرف ''حجیت حدیث'' کا بھی اِنکاری ہے، اِس لیے قرآنِ کریم کی جامعیت اور حدیث شریف سے اُس کی بے نیازی کو ثابت کرنے کے لیے اُس نے محوّلہ آیت کا صرف آخری ٹکڑا اپنی عبارت میں ٹانک لیا، اور سیاق سباق سے قطعِ نظر کہتا ہے:

> ''چیزوں کی اصل ماہیت کے اِدراک کے بغیر نہ تو صحیح محاکمہ ہو سکتا ہے اور نہ ہی مستقبل کے لیے کوئی راستہ مل سکتا ہے، اور یہ کام غیاب محمدی میں قرآن مجید کے ذریعے ہی انجام پائے گا، کہ قرآن مجید ایک ایسی کتاب ہے جو کامل ہدایت کا اِعلامیہ ہے: ﴿ما فرطنا في الكتاب من شيء﴾''۔ (مستقبل کی بازیافت: ص ۴۱)۔

مضمون نگار نے یہ مضمون اور بھی جگہ دہرایا ہے، کوئی اِس سے پوچھے کہ بندۂ خدا! جب ہدایت سے متعلق قیامت تک کی ساری باتیں قرآن کریم میں آچکی ہیں، حتی کہ ''اَب حدیث کی بھی ضرورت نہیں''، تو پھر تمہارے اُن ہدایت ناموں کی کیا

ضرورت رہ جاتی ہے جو اُمت کے ''اسبابِ زوال'' اور ''فکرِ عروج'' سے متعلق تم مسلسل لکھے جا رہے ہو......؟

''......لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم وحی کی طرف واپسی کے لیے تمام ترکیبیں علمائے متقدمین کے منہج سے مستعار لینا ضروری سمجھتے ہیں، اہلِ یہود (یا یہود؟) کی طرح ہم نے بھی اپنے بزرگوں کی فہم وفراست کو ناقابلِ خطا باور کر رکھا ہے، ابتدائی نسلوں کے فیصلے اور اُن کی فہم وبصیرت ہمارے درمیان وحی جیسے تقدس کی حامل ہو گئی ہے، نتیجہ یہ ہے کہ ہم قرآن مجید کے تازہ بتازہ مطالعے کو اپنے حدِ امکان سے باہر سمجھتے ہیں، وحی ربانی کے گرد مفروضہ سلفِ صالحین کا گھیرا اتنا سخت ہے کہ صدیوں سے ہم نے عملی طور پر قرآن مجید سے راست رہنمائی کے تمام دروازے بند کر رکھے ہیں .....''۔ (ہم کیوں سیادت سے معزول ہوئے؟ ص ۱۴، اِشاعت اول ۲۰۱۲ء، از: راشد شاز)۔

کاش! کوئی مسٹر شاز سے یہ کہہ سکے کہ ''قرآنِ مجید سے راست رہنمائی'' کے لیے تو آپ کو بس قرآن کریم ہی کی، اُس کی اصل شکل میں، نشر واِشاعت میں لگنا چاہیے تھا، کہیں بیٹھ کر ناظرہ یا حفظ کی تعلیم دیتے، اور اگر اِس میں شرم آ رہی تھی تو کچھ بچوں کو فہم قرآن کے بقدر عربی پڑھا دیتے، وہ خود ہی قرآن کریم پڑھ اور سمجھ لیتے، ترجمہ وتفسیر کی ''بزرگانِ سلف کی غلطی'' آپ کو نہیں دہرانی چاہیے تھی، ''بزرگوں'' اور ''سلفِ صالحین'' کی طرح آپ کو سمجھانے، بتانے اور مفہوم ومطالب میں دخل دینے کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی!!

ج: اہلِ اِیمان کے قرآنی مفہوم میں تحریف:

قرآن کریم میں سورۃ الحج کی آیت (۱۷) میں فرمایا گیا ہے: ﴿إن الذين آمنوا والذين هادوا والصابئين والنصارى والمجوس والذين أشركوا، إن الله يفصل بينهم يوم القيامة، إن الله على كل شيء شهيد﴾

(بلاشبہ اہلِ اِیمان ہوں یا یہود، صابی ہوں یا نصاریٰ، مجوس ہوں یا مشرکین، اللہ قیامت کے دن اُن سب کے درمیان فیصلہ کردے گا۔یقیناً اللہ ہر چیز کا گواہ ہے)۔

قرآنِ کریم میں جگہ جگہ اِیمان کی دعوت دی گئی ہے، اور تمام منحرف راستوں کو چھوڑ کر، دینِ حنیف اور مذہب اِسلام اِختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اِس کے باوجود لوگ ''اِعتصام بحبل اللّٰہ'' کے ذریعے ایک کلمے پر متفق نہیں ہورہے ہیں، بلکہ جذبات وخواہشات کے تقاضوں پر چل کر، ہر جماعت اور ہر طائفے نے اپنا راستہ الگ کررکھا ہے، کچھ لوگ تو حسبِ منشا اِیمان لائے، باقی ان کے علاوہ کوئی یہودی ہے، کوئی صابی، کوئی عیسائی، کوئی مجوسی، اور کوئی مشرک، پھر طرفہ تماشا یہ کہ ان میں سے ہر فرقہ اپنے محق ہونے کا بھی مدعی ہے، تو اِس آیت میں یہ مضمون بیان کیا جارہا ہے کہ یہ جو دنیا میں الگ الگ فرقے بنے ہوئے ہیں، اور ہر فرقہ حق پر ہونے کا دعویدار بھی ہے، تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ جنتیوں اور جہنمیوں کو ایک دوسرے سے ممتاز کرکے کھلا ہوا عملی فیصلہ کردیں گے کہ کون حق پر تھا، اور کون حق سے منحرف:

(الأنفال:۳۶-۳۷)﴿والذین کفروا إلی جہنم یحشرون، لیمیز اللّٰہ الخبیث من الطیب ویجعل الخبیث بعضہ علی بعض فیرکمہ جمیعاً فیجعلہ في جہنم﴾(کافروں کو جہنم کی طرف اکٹھا کیا جائے گا، تاکہ اللہ ناپاک لوگوں کو پاک لوگوں سے الگ کردے، اور پھر ناپاکوں کو ایک دوسرے سے ملادے، پھر ان سب کو جمع کرکے دوزخ میں ڈال دے)۔

یہ مضمون بالکل واضح تھا، اور بظاہر کسی قسم کی تلبیس کی کوئی گنجائش نہیں تھی، مگر فن کاروں کے لیے ایسی آہنی دیوار میں بھی نقب زنی کچھ مشکل نہ رہی، کہتے ہیں:

''......اِس کے برعکس قرآن مجید نجات جیسے مسئلہ کو سرے سے اِنسانی بحث

وتحیص کے دائرے سے باہر قرار دیتا ہے، روزِ آخر کون جنت میں جائے گا اور کسے واصلِ جہنم کیا جائے گا، یہ وہ حساس امور ہیں جن پر کوئی قولِ فیصل اِنسانوں کے بس کی بات نہیں، اہلِ کتاب کوتو چھوڑیئے، انھیں تو قرآن دینِ محمدی کے فطری حلیف کے طور پر پیش کرتا ہے، حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جن کے دامن شرک سے آلودہ ہوگئے اُن کے لیے بھی خدا کا اِرشاد ہے کہ سزا و جزا کا یہ فیصلہ وہ بذاتِ خود روزِ حشر انجام دے گا، اِس بارے میں کوئی گفتگو اِنسانوں کے دائرۂ اِختیار سے باہر ہے: ﴿إن اللّٰہ یفصل بینھم یوم القیامة﴾ (الحج:۱۷)"۔ (مستقبل کی بازیافت: ص ۵۵)۔

حالاں کہ قرآنِ کریم نے اسی سورت میں دوسری جگہ صاف لفظوں میں یہ اِعلان فرما کر تلبیس کا آخری موقع بھی ختم کر دیا ہے: (الحج:۵۶-۵۷) ﴿یحکم بینھم: فالذین آمنوا وعملوا الصحالحات في جنت النعیم، والذین کفروا وکذبوا بآیاتنا فأولئک لھم عذاب مھین﴾ (اللہ اُن کے مابین فیصلہ فرمائیں گے: ایمان اور اعمالِ صالحہ والوں کو تو جنت ملے گی، اور کفر کرنے والوں اور ہماری آیات کو جھٹلانے والوں کے لیے ذلت آمیز عذاب ہوگا)۔

ایک دوسرے موقع پر یہ کہتے ہوئے "اہل کتاب" کا معاملہ بھی صاف کر دیا گیا (البینۃ:۶) ﴿إن الذین کفروا من أھل الکتاب والمشرکین في نار جھنم خالدین فیھا، أولئک ھم شر البریة﴾ (اہلِ کتاب اور مشرکین: جنھوں نے کفر کیا یقیناً وہ سب دوزخ کی آگ میں جائیں گے، اُس میں ہمیشہ رہیں گے، یہی مخلوق کے بدترین لوگ ہیں)۔

یہاں تو اہل کتاب کافروں کے لیے بھی جہنم کا فیصلہ اِس دنیا ہی میں کر دیا گیا، اور اِس آیت کا طرزِ بیان یہ بتا رہا ہے کہ "اہلِ کتاب" کے جو لوگ نبی آخر الزماں محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اِیمان نہیں لاتے، اُن کا اور مشرکین کا حکم قرآنِ کریم کے نزدیک یکساں ہے۔

د: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ''امی'' ہونے سے متعلق آیت کے مفہوم میں تحریف:

قرآنِ کریم میں سورۃ العنکبوت میں فرمایا گیا ہے: (۴۷-۴۸) ﴿وما كنت تتلو من قبله من كتاب ولا تخطه بيمينك إذاً لاارتاب المبطلون، بل هو آيات بينات في صدور الذين أوتوا العلم، وما يجحد بآياتنا إلا الظالمون﴾ (اور آپ قرآن سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھتے تھے، اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے، اگر ایسا ہوتا تو اہل باطل اُس میں مین میخ (اور شک وشبہ) نکال سکتے تھے، بلکہ یہ (قرآن) ایسی روشن آیات ہیں جو اہل علم کے سینوں میں محفوظ ہیں، اور ہماری آیتوں کا اِنکار صرف ظالم (اور نا اِنصاف) لوگ ہی کرسکتے ہیں)۔

اِس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک معجزہ کا ذکر ہے کہ آپ لکھنا پڑھنا سیکھے بغیر، ثقلین (جن واِنس) کے معلم قرار پائے، اور آپ نے تلاوتِ آیات، تعلیم کتاب وحکمت، تزکیۂ نفوس اور تربیتِ اَخلاق کی گراں بار ذمہ داری بأحسن وجوہ پوری فرمائی، اور آپ کو لکھنا پڑھنا نہ سکھانے کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ اگر آپ کا ایسا کچھ سلسلہ ہوتا تو معاندین کو زبردستی کا ایک موقع ہاتھ آجاتا کہ آپ یہ عالی مضامین کہیں سے مطالعہ کرکرکے، اور لکھ لکھ کے لاتے ہیں، اور یاد کرکرکے سنادیتے ہیں۔

جو لوگ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ پر اِیمان رکھتے ہیں اُن کو اِس خرقِ عادت (معجزہ) کو تسلیم کرنے میں تأمل بھی نہیں، کہ جو ذاتِ باری بغیر کسی سبب، ذریعے اور معاون کے پوری کائنات کو عدم سے وجود میں لاسکتی ہے، خاک کے ایک بے جان پتلے سے اِنسان جیسی جامع الکمالات مخلوق کو وجود بخش سکتی ہے، شعلے اگلتی آگ کو گلزار کرسکتی ہے، خشک پتھر سے بارہ چشمے جاری کرسکتی ہے، تلاطم خیز دریا میں ہموار

راستے پیدا کر سکتی ہے، سیدنا حضرت موسیٰؑ کو ید بیضاء اور عصائے معجزہ دے سکتی ہے، سیدنا حضرت عیسیٰؑ کو ماں کی گود میں قوت گویائی عطا فرما سکتی ہے۔

اُس خالق تبارک وتعالیٰ کے لیے ایک ایسے شخص کو پڑھے بغیر، پڑھانے کے منصب پر فائز کر دینا، سیکھے بغیر سکھانے کی ذمہ داری تفویض کر دینا؛ کیا مشکل ہے، جس کی خلقت: تخلیق کا احسن نمونہ، جس کی فطرت: اِعتدال کا آخری کمال، جس کی شخصیت: حسن وجمال کا اعلیٰ شاہ کار ہے، جس کی توصیف شاعرِ رسول حضرت حسان بن ثابتؓ نے اِن الفاظ میں کی ہے:

خلقت مبرأ من کل عیب　　　　کأنک قد خلقت کما تشاء

شیخ سعدیؒ یوں فرماتے ہیں:

یاصاحب الجمال ویاسیدالبشر
من وجهک المنیر لقد نور القمر
لا یمکن الثناء کما کان حقه
بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

اور ایک ہندوستانی شاعر اِس قطعہ کے ساتھ نعت خواں ہے:

ہر حسن وبلندی سے اسے جوڑ دیا ہے
کس اوج پہ لے جا کے اسے چھوڑ دیا ہے
اک آخری تصویر نبوت کی بنا کر
رضواں! مصور نے قلم توڑ دیا ہے

بہر حال مذکورہ آیت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مخلوق سے لکھنا پڑھنا نہ سیکھنا صراحتاً مذکور ہے، اِسی لیے قرآنِ کریم میں مختلف مواقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ''الأمـــي'' کے وصف سے موصوف کیا گیا ہے، جو ''الأم'' (بمعنیٰ: ماں) کی طرف منسوب ہے، یعنی اپنی اصل (مادرزاد) حالت پر برقرار، کسی مخلوق کی تعلیم

وتربیت اور فکرونظر کی آمیزش سے محفوظ، بقول شاعر (رومی اکبرآبادی):

جس نے کچھ سیکھا نہ ہو اِنسان سے
علم پایا ہو فقط رحمان سے
وہ نہ ہو شاگرد، بس اُستاد ہو
بے پڑھے سب علم از خود یاد ہو

مگر نیچریوں، اور عقل پرستوں کا چونکہ معجزات پر ایمان نہیں ہوتا اِس لیے وہ لوگ معجزات پر مشتمل نصوص کا یا تو صاف اِنکار کردیتے ہیں، یا دور اَز کار تاویلات وتوجیہات میں پڑجاتے ہیں، مثلاً:

”کتب تفسیر اور سیر کی کتابوں میں عام طور پر یہ بتایا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پڑھنے لکھنے پر قادر نہ تھے۔ قلم اور کاغذ سے اگر نبی کو بے تعلق ثابت کردیا جائے تو تبلیغ قرآن کے لیے صرف زبانی طریقۂ ترسیل باقی رہ جاتا ہے، انسانی حافظہ خواہ کتنا ہی قوی کیوں نہ ہو اِنسان ہونے کی وجہ سے خطاونسیان کا اِمکان بہرحال بنا رہتا ہے، اس لیے وحی جیسی عظیم نعمت کو صرف زبانی تحفظ کے حوالے کرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں کہا جاسکتا، ہمارے خیال میں رسول اللہ جیسے معلّم اِنسانیت کے لیے بے پڑھا لکھا ہونا صرف آپ کی ذاتِ مبارک کی توہین ہی نہیں، بلکہ قرآن کی اس تصویر سے براہ راست متصادم ہے جس میں بار بار رسول کریم کا کتاب مسطور میں سے قرآن کی تلاوت کرنا اور کتابت پر انہیں قادر بتایا گیا ہے: ﴿ما کنت تتلو من قبله من کتاب ولا تخطه بیمینک﴾ (العنکبوت: ٤٨)، یعنی نبوت سے پہلے نہ تو تم پڑھنے پر قادر تھے اور نہ ہی اپنے ہاتھ سے کچھ لکھ سکتے تھے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلے میں بے پڑھے لکھے ہونے کا مغالطہ دراصل لفظ ”اُمی“ کی غلط تعبیر سے پیدا ہوا ہے، اس کے معنی عام طور پر علماء ومفسرین نے ”اَن پڑھ“ کے لیے ہیں، حالانکہ قرآن میں مختلف موقع پر ”اُم“ کا لفظ ”اُم القری“ (مکہ) کی طرف اشارہ کرتا ہے......“۔

''......ایسے تمام موقعوں پر جہاں نبی کی تقدیس وستائش خود اللہ تعالیٰ '' النبي الأمي '' کے حوالے سے کر رہا ہے، وہاں بھی مترجمین ومفسرین نے لفظ '' اُمی '' سے اَن پڑھ ہونا مراد لیا ہے، اور اِسے قابل فخر صفت قرار دے رکھا ہے......''۔ (ملخصاً از: اِدراکِ زوال امت، ص ١٦٥-١٦٧)۔

اِس اقتباس میں مندرجہ ذیل امور قابل توجہ ہیں:

١: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں '' مخلوق سے پڑھنا لکھنا نہ سیکھنے '' کی بات کتب تفسیر اور سِیَر کی کتابوں پر ڈال دی گئی، جب کہ یہ مضمون قرآن کریم میں صراحتاً موجود ہے، جیسا کہ مذکورہ بالا آیت کا حوالہ گذر چکا۔

٢: صرف '' اِنسانی حافظے میں خطا ونسیان کے مزعومہ اِمکان '' کی بناء پر ایک کھلے ہوئے معجزے کا اِنکار کیا جا رہا ہے، پھر تو: (البقرة:٣١) ﴿وعلم آدم الأسماء كلها﴾ (اور اللہ نے آدم کو تمام اسماء سکھا دیئے) میں بھی نہ جانے کیا تاویل کی جاتی ہوگی؟

دراَصل اِن لوگوں کو پورے دین ہی میں اِسی طرح کے شکوک وشبہات رہتے ہیں، یہ لوگ دِین کے دیگر متواترات پر بھی اِسی قسم کی تشکیکی نشتر زنی کرتے رہتے ہیں، حالاں کہ: (الأعلى:٦) ﴿سنقرئك فلا تنسى﴾ (ہم آپ کو پڑھائیں گے تو آپ بھولیں گے نہیں) کی تبشیر کے ہوتے ہوئے، اور: ﴿إنا نحن نزلنا الذكر وإنا له لحافظون﴾ (ہم نے ہی یہ قرآن اتارا ہے، اور ہم ہی اِس کے محافظ ہیں) کے وعدہ کے بعد، اِن اوہام وخیالات کی گنجائش ہی کہاں رہ جاتی ہے؟

شاز کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ '' معجزات '' (خرقِ عادت اور ماورائے اَسباب امور) کو مانتے ہی نہیں، اِسی لیے اپنی بعض تحریروں میں ارشادِ ربانی: ﴿كونوا قردة خاسئين﴾ کا ترجمہ (تم ہو جاؤ ذلیل بندر) کے بجائے '' بندر

صفتی‘‘ سے کرر کھا ہے، حالاں کہ جو ذات اِنسان اور بندر دونوں مخلوق کو عدم سے وجود میں لا سکتی ہے، وہ اِنسان کو بندر کیوں نہیں بنا سکتی؟ جیسا کہ یہودیوں کی ایک جماعت کو بنا بھی چکی ہے ﴿فاعتبروا يا أولي الأبصار﴾۔

نکتہ: اللہ تعالیٰ نے محولہ آیت میں قرآن کے محافظ ’’سینوں‘‘ کو ’’اہل علم‘‘ کا سینہ قرار دیا ہے، اور اپنی کتاب کی جس حفاظت کی ذمہ داری خود لی تھی، اُس کا ذریعہ اِنہی ’’اہل علم‘‘ کو بنایا ہے، پس لائق صد مبارک باد ہیں وہ سینے جو اِس عطائے خداوندی سے سرفراز ہیں، سبحانك لا علم لنا إلا ما علمتنا إنك أنت العليم الحكيم۔

۳: اِس وقت دنیا میں محتاط اندازے کے مطابق قرآن شریف حفظ کرنے والوں کا سالانہ اوسط ایک لاکھ کے قریب ہے، اور تحفیظ القرآن کے معیاری مدارس کا معمول ہے کہ حافظ ہونے والے طلبہ کو اُس وقت تک سند نہیں دیتے جب تک وہ ایک دن میں پورا قرآنِ کریم تجوید کے ساتھ بالکل اَزبر نہ سنا دیں، تو جب ایک ایسے دور میں ’’اہل علم‘‘ قرآنِ کریم کو حافظوں میں محفوظ کرنے کا اِتنا اِہتمام کر رہے ہیں، اور اِس کتابِ ہدایت کو سینہ بسینہ منتقل کرنے کی قدیم سنت اور دیرینہ روایت پر سختی سے عمل کر رہے ہیں، جس دور میں کہ دین اور علم دین سے بے توجہی بھی روز افزوں ہے، اور طباعت واشاعت کی گرم بازاری کی وجہ سے بظاہر ’’حفظِ قرآن‘‘ کی اتنی مجبوری بھی نہیں رہ گئی۔

تو جب (شاز کے بقول) ’’دانشِ یونانی‘‘ کی آہٹ اور آمد نہیں ہوئی تھی، اور مسلمانوں کے یہاں علم کے نام پر صرف قرآن وحدیث ہی کا تصور تھا، اور عوام سے لے کر حکومتوں تک سب کا موضوع دین اور اَسبابِ دین ہی کی حفاظت واِشاعت تھا، تو اُس وقت یہ کام کتنے بڑے پیمانے پر اَنجام دیا جا رہا ہوگا، اِس زمانہ

میں اُس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

۴: چوتھی اہم بات یہ کہ مضمون نگار نے آیت مذکورہ: ﴿وما كنت تتلو من قبله......﴾ ادھوری ہی نقل کی، اگر وہ پورا سیاق نقل کر کے قاری کے حوالے کر دیتے، اور تلبیسی دخل اندازی نہ کرتے، تو تاویل باطل کا موقع خود ہی ختم ہو جاتا: ﴿وما كنت تتلو من قبله من كتاب ولا تخطه بيمينك إذاً لارتاب المبطلون، بل هو آيات بينات في صدور الذين أوتوا العلم، وما يجحد بآياتنا إلا الظالمون﴾ (اور آپ قرآن سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھتے تھے، اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے، اگر ایسا ہوتا تو اہل باطل اُس میں مین میخ (اور شک وشبہ) نکال سکتے تھے، بلکہ یہ (قرآن) ایسی روشن آیات ہیں جو اہل علم کے سینوں میں محفوظ ہیں، اور ہماری آیتوں کا اِنکار صرف ظالم (اور نا اِنصاف) لوگ ہی کر سکتے ہیں)۔

لفظ ''بــــل'' (بمعنی: بلکہ) ماقبل کے استدراک کے لیے آتا ہے، لہٰذا مطلب ہوا کہ یہ قرآن کہیں لکھا ہوا نہیں ہے کہ دیکھ دیکھ کر پڑھا جائے، بل کہ یہ اہل علم کے سینوں اور حافظوں میں محفوظ کی گئی آیات ہیں۔

اِسی سے اِس فکر شاذ کی بھی تردید ہو گئی کہ قرآن کریم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے زمانے میں بین الدفتین جمع ومرتب ہو چکا تھا، کیوں کہ یہاں تو اس کو ''صدور'' (سینوں) میں محفوظ بتایا جا رہا ہے، اِسی طرح اِس موقع پر یہ سوال بھی کیا جا سکتا ہے کہ جب قرآن مجید کی سینوں کے ذریعے حفاظت ہو سکتی ہے، تو حدیث کی حفاظت کیوں نہیں ہو سکتی؟

۵: اور یہ کہنا کہ:

''ہمارے خیال میں رسول اللہ جیسے معلّم اِنسانیت کے لیے بے پڑھا لکھا

ہونا صرف آپ کی ذاتِ مبارک کی توہین ہی نہیں بلکہ......''

یہ نیچریت زدہ عقل پرستی کی بات ہے، معجزہ اور بیّنہ موجب تکریم ہوا کرتا ہے، نہ کہ باعث توہین، جب ہمارا یہ ایمان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعۂ وحی اللہ تعالیٰ کی طرف سے علوم عطا ہوتے تھے، تو مخلوق سے نہ سیکھنے میں توہین کیسی؟ اگر اللہ رب العزۃ آسمان پر ابوالبشر سیدنا حضرتِ آدم علیہ السلام کو مخلوق کے واسطے کے بغیر علوم سے نواز سکتے ہیں، تو زمین پر سید البشر صلی اللہ علیہ وسلم کو کیوں نہیں نواز سکتے؟

۶: اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ دعویٰ:

''......بلکہ قرآن کی اس تصویر سے براہ راست متصادم ہے جس میں بار بار رسول کریم کا ''کتاب مسطور'' میں سے قرآن کی تلاوت کرنا اور کتابت پر انہیں قادر بتایا گیا ہے......''

اِنتہائی لچر دعویٰ ہے، اور اِس کے پس منظر میں ''آسمانی لوح محفوظ'' کا اِنکار مستور ہے، جس کی مدلل تردید اِن شاء اللہ آئندہ صفحات میں آیا چاہتی ہے، چنانچہ یہاں بھی ''کتاب مسطور'' سے اگر کوئی متعین کتاب مراد ہے تو وہ ''لوح محفوظ'' ہی ہے، ورنہ ایک اِحتمال یہ بھی ہے کہ یہاں مطلق لکھی ہوئی کتاب مراد ہو، جیسا کہ تنکیر اِسی پر دلالت کررہی ہے، واللہ اعلم۔

۷: اور یہ بات کہ:

''ایسے تمام موقعوں پر جہاں نبی کی تقدیس وستائش خود اللہ تعالیٰ ''النبي الأمي'' کے حوالے سے کررہا ہے، وہاں بھی مترجمین ومفسرین نے لفظ ''اُمّی'' سے اَن پڑھ ہونا مراد لیا ہے، اور اِسے قابل فخر صفت قرار دے رکھا ہے''

یہ بالکل بجا ہے، مگر اِس پہلو سے نہیں کہ بے پڑھا لکھا ہونا بذات خود کوئی تقدس وتفاخر کی بات ہے، بلکہ اس حیثیت سے کہ جس نے مخلوق سے ایک حرفِ غلط بھی

پڑھنا لکھنا نہ سیکھا تھا، اَسباب کی دنیا میں ظاہری نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ وہ (نعوذ باللہ) بالکل بلید اور نابلد ہوتا، مگر مافوق الاسباب دنیا میں ہوا یہ کہ وہی ذاتِ گرامی ساری اِنسانیت کی معلم اور مربی قرار پائی، جیسے کہ یتیم ہونے کے باوجود یتیموں کی والی بنائی گئی، صاحبِ فقر وفاقہ ہونے کے علی الرغم محتاجوں اور مسکینوں کا ماوی وملجا ٹھہرائی گئی:

(والضحی: ۶-۱۱) ﴿الم یجدک یتیماً فآوی، ووجدک ضالاً فهدی، ووجدک عائلاً فاغنی، فأما الیتیم فلا تقهر، وأما السائل فلا تنهر، وأما بنعمة ربک فحدث﴾ (کیا آپ یتیم نہیں تھے، کہ پھر اسی رب نے آپ کو پناہ دی، کیا آپ ناواقف نہیں تھے، کہ پھر اسی نے آپ کو راہ دکھلائی، کیا آپ نادار نہیں تھے، کہ پھر اسی نے آپ کو مستغنی فرمادیا، سو آپ بھی یتیم پر سختی نہ کیا کیجیے، سائل کو جھڑکا مت کیجیے، اور اپنے رب کے اِنعامات (جن میں علوم ومعارف بھی شامل ہیں) بیان فرمایا کیجیے)۔

۴-۵: تقدیر ولوحِ محفوظ کا اِنکار:

''تقدیر'' خالقِ کائنات کے اسرارِ نہانی اور رازہائے سربستہ میں سے ایک مخفی راز ہے، جس کی کنہ وحقیقت تک کسی مخلوق کی رسائی نہ ہوسکی، البتہ کتاب وسنت میں اُس سے متعلق جو کچھ وارد ہوا ہے اُس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے علمِ غیب، حکمتِ بالغہ، قدرتِ کاملہ، اور تدبیرِ عالی سے پوری کائنات کے ہر ہر ذرہ کے لیے تا ابد الآباد ایک نظامِ کار متعین فرماکر، ''لوحِ محفوظ'' میں محفوظ فرمادیا ہے، لہٰذا قیامت تک، بلکہ مابعد قیامت بھی اِس کائنات میں اچھا برا جو کچھ بھی پیش آرہا ہے، یا آئے گا، سب اسی ''تقدیر'' و''تکوین'' کے مطابق ہوگا، اس کے خلاف کائنات کا ایک پتہ بھی ہل نہیں سکتا۔

اِس کا یہ مطلب نہیں کہ اِنسان بالکل مجبور وبے بس ہے، بلکہ اِس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی اِنسان اپنے اختیار سے جو کچھ کرے گا، وہ سب اللہ کو پہلے سے معلوم ہے،

اور اُس کی ''کتابِ مبین'' میں لکھا ہوا ہے۔

اور اِس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اللہ تعالیٰ نظامِ عالم کو مرتب و مدوَّن فرما کر العیاذ باللہ یکسو اور معطل ہو گئے ہیں، بلکہ کائنات کا ہر ہر ذرہ اپنے حرکت و سکون میں ہمیشہ باری تعالیٰ کے اِرادے اور اِذن کا محتاج ہوتا ہے، اُس کے بغیر کوئی شیء نہ موجود ہو سکتی ہے نہ معدوم، نہ متحرک ہو سکتی ہے نہ ساکن۔

دراَصل اللہ تبارک وتعالیٰ نے کائنات کے اِس نظام کو دو حصوں میں منقسم فرمایا ہے: تکوین اور تشریع، تکوین کا تعلق کائنات کے عمومی، ابدی اور آفاقی نظم واِنتظام سے ہے، اور تشریع کا تعلق: بندوں سے متعلق اللہ کے احکام اور حقوق العباد سے ہے، نظامِ تکوین: اللہ تعالیٰ کی صفاتِ قدسیہ: ''خَلق''، ''ربوبیت''، ''اِرادہ''، ''حکم''، ''مشیت'' اور ''قضا'' وغیرہ کا مظہر ہے، جب کہ نظامِ تشریع اُس کی صفاتِ عالیہ: ''اَمر''، ''عدل''، ''قہر''، ''شکر'' (قدردانی) اور ''رِضا'' وغیرہ کا پرتو ہے، نظامِ تشریع: ظاہری اسباب وعلل سے مربوط اور اُسی میں محصور ہوتا ہے، جب کہ نظامِ تکوین: ظاہری اَسباب کے ساتھ ساتھ، مخفی (اور باطنی) اَسباب، بلکہ بعض وقت ماورائے اَسباب بھی اَنجام پاتا ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کو اُن کے ہر اِقدام اور ہر عمل میں تکوینی امور کے بجائے، شرعی احکام کا مکلف بنایا گیا ہے، جس کا خلاصہ ہے: ''خلوصِ نیت'' اور ''حُسنِ عمل'': (البینۃ:۵) ﴿وما أمروا إلا لیعبدوا اللہ مخلصین لہ الدین حنفاء ......﴾ (لوگوں کو صرف اِس بات کا حکم دیا گیا تھا کہ وہ اللہ کی بندگی کریں اِس طرح کہ بندگی ہو اِخلاص کے ساتھ صرف اُسی کی، بالکل اُسی کے ہو کر)۔

اور (الملک:۲) ﴿الذي خلق الموت والحیوٰة لیبلوکم أیکم أحسن عملاً﴾ (اُس نے موت اور زندگی کا نظام اِس لیے بنایا ہے کہ دیکھے کون نیک اعمال کرتا ہے)، لہٰذا ہر موقع کا جو مثبت یا منفی شرعی تقاضا ہے، اور کسی بھی مرحلے کی جو جائز یا

مطلوب، شرعی تدبیر ہے، بندے سے صرف اُسی کے متعلق باز پرس ہوگی (الحجر: ۹۲-۹۳) ﴿فوربک لنسألنهم أجمعين عما كانوا يعملون﴾ (آپ کے رب کی قسم! ہم اُن سب سے ضرور باز پرس کریں گے کہ وہ کیا عمل کرتے تھے)، اور (الأنبیاء:۲۳) ﴿لا يسأل عما يفعل وهم يسألون﴾ (اُس ذات باری سے نہیں پوچھا جاسکتا کہ وہ کیا کرتا ہے، مگر بندوں سے پرسش ہوگی)۔

''خلوصِ نیت'' کا مطلب ہے کہ ہر کام صرف اللہ کے حکم کے پیش نظر لوجہ اللہ اَنجام دیا جائے، دولت، شہرت، جاہ اور مخلوق کی رضا وغیرہ مقصود نہ ہو۔

اور ''حسن عمل'' کا حاصل ہے کہ ہر عمل: کتاب وسنت میں وارد شرعی طریقے کے مطابق کیا جائے، نہ تو خود اِیجاد کردہ طریقے اختیار کیے جائیں، اور نہ خود ساختہ اعمال، اُس کے بعد نتیجہ اور انجام اللہ تبارک وتعالیٰ کے اوپر چھوڑ دیا جائے، کہ وہ اُس نے اپنے قبضہ وقدرت ہی میں رکھا ہے، اِنسان کو نہ اُس کا اِختیار دیا ہے، نہ اُس کا مسؤل بنایا ہے:

کیا نتیجہ ہوگا، کیوں کر ہوگا، یہ اوہام چھوڑ
کام کر، اور جس کا ہے کام اس پہ تو انجام چھوڑ
اجر لے، ناکام ہوکر بھی نہ رب کا کام چھوڑ
وقت میں جد وجہد کر، راحت وآرام چھوڑ

ہاں یہ ضرور ہے کہ اگر کسی نے کوئی ''غیر مشروع'' عمل یا ناجائز تدبیر اختیار کی تو اُس کے نتیجہ کی ذمہ داری یقیناً اُسی کے سر ہوگی، کیوں کہ وہ اپنے طرزِ عمل سے نتیجہ اور انجام کے بھی اختیاری ہونے کا مدعی ہو رہا ہے، اور اللہ پر توکل کرنے کے بجائے، اپنی کوشش اور تدبیر پر اِعتماد کر رہا ہے، اور عملاً یہ تأثر دے رہا ہے کہ اگر ہم نے اِس موقع پر یہ ''ناجائز'' قدم اٹھالیا اور یہ ''غیر مشروع'' تدبیر اختیار کرلی، تو انجام یقینی طور پر ہماری مرضی کے موافق ہو جائے گا، حالاں کہ یہ بالکل غلط سوچ اور خلافِ شرع تصور ہے، اپنے

ملکی نظام ہی میں غور کرنا چاہیے کہ مثلاً ٹریفک نظام کے مطابق چلنے والے کو اگر کوئی اتفاقی حادثہ پیش آجاتا ہے، تو وہ مجرم نہیں ٹھہرایا جاتا، اور اگر بے اُصولی کرتے ہوئے کوئی ناگہانی صورت پیش آجائے تو اُس پر دوہرا جرم عائد ہوتا ہے: ایک بے ضابطگی کا، دوسرا اُس حادثہ کا؛ اگرچہ وہ غیر اختیاری ہی کیوں نہ ہو۔

خلاصہ اِس تفصیل کا یہ ہے کہ یہاں دو عقیدے ہیں: ایک ''تقدیر'' سے متعلق، کہ کائنات میں خیر وشر جو کچھ وجود میں آتا ہے، وہ سب قادرِ مطلق اللہ تبارک وتعالیٰ ہی کی مشیئت اور ارادے سے ہوتا ہے، حتیٰ کہ اسباب وعلل کی تاثیر بھی مشیئتِ ایزدی کے تابع اور اُس کے ارادے کی محتاج ہے۔

دوسرے ''لوحِ محفوظ'' سے متعلق، کہ ازل تا ابد جو کچھ اِس عالمِ رنگ وبو میں ہونا ہے سب کچھ اللہ تعالیٰ کے علمِ غیب کے ذریعہ پہلے ہی سے ایک رجسٹر میں درج کردیا گیا ہے، اب سارا نظام اُسی کے مطابق چل رہا ہے، اُس کے خلاف ہونا ممکن ہی نہیں ہے، یہاں تک کہ جو باتیں ماورائے اسباب وقوع پذیر ہوتی ہیں، وہ بھی اپنی اِسی کیفیت کے ساتھ اُس ''کتاب'' میں محفوظ ہیں۔

یہ دونوں ہی عقیدے قرآنِ کریم میں جا بجا مختلف انداز میں بیان فرمائے گئے ہیں:

ا: قرآنِ کریم سے تقدیر کا ثبوت:

''تقدیر'' سے متعلق بہت واضح آیات میں سے چند یہ ہیں: (التکویر:۲۹) ﴿وما تشاؤون إلا أن یشاء اللہ رب العالمین﴾ (اور تم کچھ نہیں چاہ سکتے جب تک اللہ رب العالمین نہ چاہے)، (القصص:۶۸) ﴿وربک یخلق ما یشاء ویختار، ما کان لھم الخیرۃ﴾ (اور آپ کا پروردگار جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، جو چاہتا ہے پسند کرتا ہے، لوگوں کو کوئی اِختیار نہیں ہے)، (الأنعام:۱۱۲) ﴿ولو شاء

ربک ما فعلوہ﴾(اور اگر آپ کا رب چاہتا تو یہ لوگ ایسا نہ کر پاتے)۔

(السجدۃ:۱۳)﴿ولو شئنا لآتینا کل نفس ھداھا ولکن حق القول مني لأملأن جھنم من الجنة والناس أجمعین﴾(اور اگر ہم چاہتے تو ہر شخص کو اُس کی ہدایت دے دیتے، لیکن وہ بات جو میری طرف سے کہی گئی تھی طے پا چکی ہے کہ ''میں جہنم کو جنات اور انسانوں سے ضرور بھر دوں گا'')، (الإسراء:۱۶)﴿وإذا أردنا أن نھلک قریةً أمرنا مترفیھا ففسقوا فیھا، فحق علیھا القول فدمرناھا تدمیراً﴾(اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو اُس کے خوش حال لوگوں کو (اِیمان اور اِطاعت کا) حکم دیتے ہیں، پھر وہ نافرمانیاں کرتے ہیں، تو اُن پر حجت تمام ہو جاتی ہے، چنانچہ ہم انھیں تباہ و برباد کر ڈالتے ہیں)۔

حتیٰ کہ امتوں کے آپسی اختلافات اور مذہبی تنازعات کو بھی قرآنِ کریم اللہ تعالیٰ کی مشیئت اور ارادہ ہی کی طرف منسوب کرتا ہے، ارشادِ ربانی ہے: (البقرۃ:۲۵۳) ﴿ولو شاء اللّٰہ ما اقتتل الذین من بعدھم من بعد ما جاء تھم البینات، ولکن اختلفوا، فمنھم من آمن ومنھم من کفر، ولو شاء اللّٰہ ما اقتتلوا، ولکن اللّٰہ یفعل ما یرید﴾(اور اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو لوگ دلائل آجانے کے بعد باہم قتل وقتال نہ کرتے (بلکہ دلائل مان لیتے)، لیکن اِس کے باوجود انھوں نے اختلاف کیا، کچھ لوگ تو ایمان لائے، کچھ لوگ کافر ہی رہے، حالاں کہ اگر اللہ چاہتا تو اِس قتل وقتال کی نوبت نہ آتی، مگر اللہ تعالیٰ (اپنی حکمتِ ازلی اور قدرتِ کاملہ سے) جو چاہتے ہیں کرتے ہیں)۔

۲: قرآنِ کریم سے لوحِ محفوظ کا ثبوت:

''لوحِ محفوظ'' (جس میں نظامِ کائنات درج ہے، اُس) کے ثبوت سے متعلق چند آیات یہ ہیں: (النمل:۷۵)﴿وما من غائبة في السماء والأرض إلا في

كتاب مبين ﴾(اور آسمان وزمین کی کوئی پوشیدہ چیز ایسی نہیں ہے جو ایک واضح کتاب میں درج نہ ہو)، (الفاطر:۱۱)﴿وما يعمَّر من معمر ولا يُنقص من عمره إلا في كتاب ﴾(اور نہ کسی کی عمر زیادہ کی جاتی ہے، اور نہ کسی کی عمر کم کی جاتی ہے مگر یہ سب ایک ''کتاب'' میں محفوظ ہے)، (الأنعام:۳۸)﴿وما من دابة في الأرض ولا طائر يطير بجناحيه إلا أمم أمثالكم، ما فرطنا في الكتاب من شيء ﴾(جو جاندار روئے زمین پر ہیں، یا جو پرندے فضا میں اڑ رہے ہیں، وہ تمہاری ہی طرح ایک مستقل مخلوق ہیں، اور ہماری کتاب میں کوئی چیز درج ہونے سے رہ نہیں گئی)۔

سورۂ أنعام(۵۹) میں ہے:﴿وعنده مفاتح الغيب لا يعلمها إلا هو، ويعلم ما في البر والبحر، وما تسقط من ورقة إلا يعلمها ولا حبة في ظلمات الأرض ولا رطب ولا يابس إلا في كتاب مبين ﴾(اور اللہ ہی کے پاس ہیں غیب کے خزانے، جنھیں اُس کے علاوہ کوئی اور نہیں جانتا، اور وہ جانتا ہے بر و بحر کی تمام چیزوں کو، اور کوئی پتہ بھی نہیں گرتا مگر اُس کے علم میں ہوتا ہے، اور کوئی دانہ زمین کے کسی تاریک حصہ میں نہیں پڑتا، اور نہ کوئی تر اور خشک چیز گرتی ہے، مگر یہ سب کتابِ مبین میں ہیں)۔

(ھود:٦)﴿وما من دابة في الأرض إلا على الله رزقها، ويعلم مستقرها ومستودعها، كل في كتاب مبين ﴾(اور زمین پر چلنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جس کا رزق اللہ نے اپنے ذمے نہ لے رکھا ہو، وہ اُس کے مستقل ٹھکانے کو بھی جانتا ہے اور عارضی ٹھکانے کو بھی، ہر بات ایک واضح کتاب میں درج ہے)، (الإسراء:۵۸)﴿وإن من قرية إلا نحن مهلكوها قبل يوم القيامة أو معذبوها عذاباً شديداً كان ذلك في الكتاب مسطوراً ﴾(اور کوئی بستی ایسی نہیں ہے جس کو ہم قیامت سے پہلے ہلاک کریں، یا اُسے سخت عذاب دیں، مگر یہ بات

''کتاب'' میں لکھی ہوئی ہے)۔

''تقدیر'' و''لوحِ محفوظ'' کا مسئلہ قرآنِ کریم میں اتنے واضح طور پر موجود ہونے کے باوجود ہر زمانہ کے کچھ عقل پرست دونوں کا اِنکار بھی کرتے آئے ہیں، مسلمانوں میں بھی یہ فتنہ پہلی صدی ہجری کے اواخر میں بعض ملحدین کے ذریعے داخل ہوا، اور دوسری صدی ہجری کے اوائل میں واصل بن عطاء البصری المعتزلی (ت:۱۳۱/۱۳۲ھ) وغیرہ منحرفین کے ذریعے پروان چڑھا، اور قرآن وحدیث کی روشنی میں تشفی بخش جوابات کے علی الرغم آج تک اِس کا سلسلہ قائم ہے۔

اِس فرقے کے لوگوں کا کہنا ہے کہ شریعت کا مکلف ہوتے ہوئے، اگر کسی بھی مرحلے میں اِنسان کو تقدیر کے آگے مجبور و بے بس تسلیم کرلیا جائے، تو پھر شرعیات اور عنداللہ مؤاخذہ کا سارا نظام معطل ہوکر رہ جاتا ہے، اور ایک مکلف کو تکلیف مالا یطاق کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اِس فرقے کا ایک معاصر ترجمان کہتا ہے:

> ''تاریخ کے بارے میں یہ تصور کہ وہ اپنے بندھے ٹکے راستے پر گامزن ہے جو دراصل خدائی فیصلہ ہے، بڑی حد تک اُس جبریہ رجحان کی پیداوار ہے جسے بوجوہ بالکل ابتدائی عہد میں ہی مسلم فکر میں داخلہ مل گیا تھا، اموی اور عباسی حکمرانوں کے لیے اِس خیال میں زندگی کا سامان تھا، وہ یہ سمجھتے تھے کہ اگر ہماری منحرف حکومتیں خدائی فیصلے کی حیثیت سے لوگوں کے لیے قابلِ قبول ہوجائیں تو مخالفین کو قابو میں رکھنا اور خاموش اکثریت کو مطمئن کرنا آسان ہوجائے گا......، جب یہ عقیدہ دل ودماغ میں سرایت کرجائے کہ تاریخ کا سفر پہلے سے طے شدہ ہے، فیصلے کی سیاہی خشک ہوچکی ہے (تعریض ہے اِس حدیث شریف پر: ''قد جف القلم بما هو كائن'' مسند احمد: ۲۶۶۶، و بخاری: ۴۶۸۶) تو پھر اِصلاحِ احوال کی کوئی کوشش شروع ہونے سے پہلے ہی دم توڑ دیتی ہے، پھر کرنے والے کے لیے جو کارِ لایعنی تفویض ہوتا ہے اُس میں وہ اپنا رول اس کے علاوہ اور کچھ نہیں دیکھتا کہ وہ اپنی دانست بھر نیکی کے عمل میں لگا رہے، اِس اطمینانِ قلب کے ساتھ کہ اُس کی یہ تمام کوشش صورتِ حال پر اثر انداز نہیں ہوسکتی......''۔

(ادراکِ زوالِ امت، ملخصاً از ص ۲۵-۲۶، اشاعت ۲۰۰۵ء، از: راشد شاز)۔

تقدیر کا اِنکار کرنے کے نتیجے میں یہ سر پھرے لوگ "لوحِ محفوظ" کا بھی اِنکار کرنے پر "مجبور" ہوتے ہیں:

"......سورۂ بروج میں قرآن مجید کا لوحِ محفوظ میں ہونے کا جو تذکرہ آیا ہے اس سے یہ سمجھ لیا گیا کہ یہ لوحِ محفوظ آسمانوں میں کہیں واقع ہے، حالاں کہ کسی ایسی تاویل کی نہ تو اِس آیت میں گنجائش تھی اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس طرح کی کوئی بات اِرشاد فرمائی تھی، لوحِ محفوظ کا مطلب اِس کے علاوہ اور کچھ نہ تھا کہ یہ کتاب (قرآن) ایک ایسے عہد میں نازل ہو رہی تھی جب تحریر نویسی ایک معروف فن کی حیثیت سے جانی جاتی تھی، اور وقت کا رسول اسے خود تحریری شکل میں مرتب کر رہا تھا......یہی وہ لوحِ محفوظ تھا جس کو مداخلتِ شیطانی اور ترمیم و تنسیخ کے عمل سے محفوظ کر دینے کا خود اللہ تعالی کا وعدہ تھا، اور جس کی تصدیق پر آج بھی چودہ صدیوں کی انسانی تاریخ گواہ ہے......"۔ (ادراکِ زوالِ امت، ص ۶۰، از: راشد شاز)۔

حالاں کہ "تقدیر" و "لوحِ محفوظ" سے متعلق جس شخص کا مذکورہ بالا آیات پر اِیمان ہو، وہ کیسے اِن کے وجود اور حقانیت کا منکر ہو سکتا ہے؟ سورۃ الحدید میں تو یہ مضمون اور صاف کر دیا گیا ہے: (۲۲-۲۳) ﴿ما أصاب من مصيبة في الأرض ولا في أنفسكم إلا في كتاب من قبل أن نبرأها، إن ذلك على الله يسير، لكيلا تأسوا على ما فاتكم ولا تفرحوا بما آتاكم﴾ (جو مصیبت دنیا میں آتی ہے، یا خاص تم کو پیش آتی ہے وہ سب تمہاری پیدائش سے پہلے ہی ایک "کتاب" میں لکھی ہوئی ہے، اور یہ اللہ کے لیے آسان ہے (علمِ غیب ہونے کی وجہ سے)، اور اِس بتانے کا مقصد یہ ہے کہ کسی نعمت کے فوت ہو جانے پر تم حد سے زیادہ رنج بھی مت کیا کرو، اور کسی خوشی کے ملنے پر زیادہ اِترایا بھی مت کرو)۔

دراَصل فرقۂ قدریہ کے لوگوں کو تشریع کے بالمقابل تکوین کے مسئلے میں، اور

تدبیر کے برعکس تقدیر کے تصور میں، دھوکہ یہاں سے ہوتا ہے کہ یہ لوگ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ جس طرح ہم عمل اور اِقدام کے مکلف ہیں، اِسی طرح ہر نتیجے اور انجام کی بھی ذمہ داری ہمارے ہی سر ہے، حالاں کہ یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے، جیسا کہ اِس کی وضاحت بتوفیقه تعالی گذشتہ سطور میں کی جاچکی ہے۔

۶-: دنیا و آخرت، اور دین و دنیا میں خلط:

لفظِ ''دنیا'' شرعی اِصطلاح میں دو معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے:

۱: دنیا بمقابلہ آخرت، اُس وقت یہ ''دنو'' بمعنی قریب، سے مشتق ہوتا ہے، چونکہ آخرت بعد میں آنے والی ہے، اِس لیے اُس سے پہلے کی زندگی کو ''دنیا'' (یعنی قریب) کہا جاتا ہے۔

۲: دنیا بمقابلہ دین، اُس وقت یہ لفظ ''دنیء'' بمعنی خسیس، گھٹیا اور کم تر، سے مشتق مانا جاتا ہے، چونکہ حقیقی اعتبار سے اللہ و رسول کی طرف منسوب چیزیں ہی باوقعت، اور باعزت ہوتی ہیں: (النساء:۱۳۹) ﴿فإن العزة لله جميعاً﴾ (بے شک عزت ساری کی ساری تو وہ اللہ ہی کے لیے ہے)، اور (المنافقون:۸) ﴿ولله العزة ولرسوله وللمؤمنين، ولكن المنافقين لا يعلمون﴾ (اور اللہ ہی کے لیے عزت ہے، اور اُس کے رسول کے لیے، اور ایمان والوں کے لیے، لیکن منافقوں کو پتہ نہیں)۔

اِس لیے خلافِ دین چیزوں کو ''دنیا'' (بمعنی خسیس اور گھٹیا) کہا جاتا ہے۔

شاذ نے اپنے دجالی اور تلبیسی لٹریچر میں بار بار دنیا و آخرت میں موجود اِس حقیقی امتیاز کو ختم کرنے، اور دنیا و دین کے معہود بنیادی فرق کو مٹانے کی ناکام کوشش کی ہے، ''دین و دنیا'' کی رائج شرعی تقسیم کے اِنکار کے پس منظر میں ان کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''......قرآن مجید میں دین اور دنیا کا لفظ ایک دوسرے کی ضد کے طور پر استعمال نہیں ہوا ہے، بلکہ قرآنی تصورِ حیات میں تو دنیا اور آخرت کا لفظ بھی ایک

دوسرے کی ضد نہیں، بلکہ دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں، متاعِ حیاتِ دنیا کی فنا کاریوں کے باوجود اسے حصولِ آخرت کا ذریعہ بتا گیا ہے، اور انسان کو اِس بات کی تلقین کی گئی ہے کہ وہ دنیا میں اپنے حصہ کو نہ بھولے ﴿ولا تنس نصيبک من الدنيا﴾ (القصص:۷۷)"۔ (تشکیلِ جدید، ص۲۶، از: راشد شاز)۔

حالاں کہ آیت کا یہ ٹکڑا قارون کے قصہ میں اُس کی قوم کے کسی کہنے والے کے مقولہ کے طور پر نقل کیا گیا ہے، جو قارون کی خدا فراموشی اور آخرت سے غفلت پر نصیحت کرتے ہوئے اُس سے کہہ رہا ہے: ﴿وابتغ فيما آتاک الله الدار الآخرة، ولا تنس نصيبک من الدنيا﴾ (اور اللہ کی عطا کی ہوئی نعمتوں سے آخرت کماؤ، اور دنیا سے بھی اپنا نصیب مت چھوڑنا)، معلوم ہوا کہ اس سے "دنیوی" زندگی کی مطلوبیت کو ثابت کرنا مقصود نہیں، بلکہ آخرت کی اہمیت بتانا مقصود ہے، اور اُس کے ضمن میں دنیا کی اباحت کو بھی بیان کیا جا رہا ہے۔

چونکہ "دنیا و آخرت" اور "دین و دنیا" کے فرق کے مسئلے میں خلط عام ہے، اِس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اِس مسئلہ کو بتوفیقہ تعالی قرآنی نصوص کی روشنی میں مزید وضاحت کے ساتھ پیش کر دیا جائے۔

۱-: دنیا و آخرت:

"آخرت" کے مقابلے میں جو "دنیا" ہے، ظاہر ہے کہ وہ پہلے اور قریب ہے، اس "دنیا" سے متعلق قرآن کریم میں اس طرح کے ارشادات وارد ہوئے ہیں:

(العنکبوت:۶۴) ﴿وما هذه الحياة الدنيا إلا لهو ولعب، وإن الدار الآخرة لهي الحيوان لو كانوا يعلمون﴾ (یہ دنیوی زندگی تو بس تماشا اور کھیل ہے، اور آخرت کا گھر اصل زندگی ہے، کاش لوگ اِس کو سمجھ لیتے)۔

(آل عمران:۱۸۵) ﴿وما الحياة الدنيا إلا متاع الغرور﴾ (دنیوی

زندگی تو بس ایک دھوکہ ہے)۔
(الأنعام:۳۲)﴿وما الحياة الدنيا إلا لعب ولهو ﴾(دنیوی زندگی تو بس کھیل اور تماشا ہے)۔
(الرعد:۲٦)﴿وما الحياة الدنيا في الآخرة إلا متاع ﴾(دنیوی زندگی آخرت کے مقابلہ میں برتنے کا ایک سامان ہے)یعنی: دل لگانے کی چیز نہیں۔
(النساء:۷۷)﴿متاع الدنيا قليل ﴾(دنیا کا برتنا تو بس تھوڑا سا ہے)۔
(لقمان:۳۳)﴿فلا تغرنكم الحياة الدنيا ﴾(دنیوی زندگی تمہیں دھوکے میں نہ ڈال دے)۔

اِس کے برعکس ''آخرت'' کے تصورِ حیات کی عکاسی قرآنِ کریم اِس طرح کرتا ہے:

(النساء:۷۷)﴿والآخرة خير لمن اتقى ﴾(اہل تقوی کے لیے آخرت بہتر ہے)۔

(الشوری:۳٦)﴿فما أوتيتم من شيء فمتاع الحياة الدنيا، وما عند الله خير وأبقى؛ للذين آمنوا ...... ﴾(سو جو کچھ تمھیں دیا گیا ہے وہ محض دنیوی زندگی کے برتنے کے لیے ہے، اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ بہتر اور پائیدار ہے؛ اُن لوگوں کے لیے جو اِیمان لائے ......)۔

(الغافر:۳۹)﴿إنما هذه الحياة الدنيا متاع، وإن الآخرة هي دار القرار ﴾(دنیوی زندگی تو بس گذر بسر کی چیز ہے، اور بے شک آخرت، وہ ہے رہنے کا اصل ٹھکانہ)۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ ''دنیا'' اور ''آخرت'' اپنی اصل کے اعتبار سے دو متضاد تصورِ حیات اور دو مخالف سمت ہیں: ایک حقیقت، دوسرا دھوکہ، ایک فانی، دوسرا باقی،

ایک حاضر اور موجود، دوسرا غیب اور موعود۔

مگر دونوں کے درمیان اتنے سخت تضاد کے باوجود، تطبیق کی ایک شکل بھی شریعت نے بتائی ہے، وہ یہ کہ "دنیا" کے ہر کام اور اِقدام میں رضائے الٰہی کا اہتمام اور آخرت کے اجر وثواب کی نیت کرلی جائے، اور شریعت کے اصولِ (جواز وعدمِ جواز) کی رعایت کرلی جائے، یعنی اِخلاص اور اتباعِ سنت وشرعت کی فکر کرلی جائے تو تطبیق ممکن ہوسکتی ہے، قرآن کریم میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا اِرشاد ہے:

(الإسراء:۱۸-۱۹): ﴿من كان يريد العاجلة عجلنا له فيها ما نشاء لمن نريد ثم جعلنا له جهنم يصلاها مذموماً مدحوراً، ومن أراد الآخرة وسعى لها سعيها وهو مؤمن فأولئك كان سعيهم مشكوراً﴾

(جو اپنے اعمال کا نتیجہ جلد ہی چاہتا ہے تو جس کو جتنا دینا ہوگا ہم (دنیا ہی میں) دے دیں گے، پھر (آخرت) میں ہم نے اُس کے لیے جہنم تیار کر رکھی ہے، جس میں وہ کمین وذلیل ہوکر جلتا رہے گا، اور جو آخرت کی نیت کرے گا اور اُسی کی سعی میں لگے گا اور وہ مؤمن بھی ہوگا تو ہاں ایسے لوگوں کی سعی مشکور ہوگی)۔

ایک جگہ یہ ارشاد ہے: (الشوریٰ:۲۰) ﴿من كان يريد حرث الآخرة نزد له في حرثه، ومن كان يريد حرث الدنيا نؤته منها وما له في الآخرة من نصيب﴾

(جو آخرت کی کھیتی چاہتا ہے ہم اُس کی کھیتی میں اضافہ کردیں گے، اور جو دنیا کی کھیتی چاہتا ہے ہم اُس کو (اُس کی قسمت کے بقدر) اُس میں سے دے دیں گے، اور آخرت میں اُس کا کوئی حصہ نہ ہوگا)۔

سورۂ ہود میں ہے (۱۵-۱۶): ﴿من كان يريد الحيوة الدنيا وزينتها نوف إليهم أعمالهم فيها، وهم فيها لا يبخسون، أولئك الذين ليس لهم

فی الآخرۃ إلا النار، وحبط ما صنعوا فیھا، وباطل ما کانوا یعملون ﴾
(جولوگ دنیوی زندگی اور اُس کی زیب وزینت کے طالب ہوں گے، ہم اُن کے اعمال کا پورا پورا صلہ اسی دنیا میں دے دیں گے، اور یہاں اُن کے حق میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی، یہ وہ لوگ ہوں گے جن کو آخرت میں سوائے آگ کے کچھ نہ ملے گا، اور دنیا کا سب کیا دھرا غارت ہوجائے گا، اور ان کے سارے اعمال حبط ہوجائیں گے)۔

۲-:دین ودنیا

یہ تفصیل تو اُس دنیا سے متعلق تھی جو آخرت کے مقابلے میں ہو، اور وہ دنیا جو دین کے بالمقابل اور معارض ہو کر آئے، اُس کی طرف اِشارہ اِس آیت میں کیا گیا ہے:

(الکہف:۲۸) ﴿واصبر نفسک مع الذین یدعون ربھم بالغداۃ والعشي یریدون وجھہ، ولاتعد عیناک عنھم ترید زینۃ الحیاۃ الدنیا، ولا تطع من أغفلنا قلبہ عن ذکرنا، واتبع ھواہ وکان أمرہ فرطاً﴾

(اور آپ اپنے آپ کو اُن لوگوں کے ساتھ رکھا کیجیے جو صبح وشام اپنے رب کی عبادت کرتے ہیں اُس کی رضا جوئی کے لیے، اور دنیوی زندگانی کی رونق کے خیال سے آپ کی آنکھیں اُن سے ہٹنے نہ پائیں، اور اُس شخص کا کہنا نہ مانیے جس کے قلب کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کردیا ہے، اور وہ اپنی نفسانی خواہشات پر چلتا ہے، اور اُس کا معاملہ حد سے بڑھ گیا ہے)۔

لہٰذا جو بھی چیز اللہ کے ذکر سے غافل کرنے والی ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع واطاعت میں مانع بن رہی ہو، اور شریعت کی پابندی اور تابعداری میں مخل ہورہی ہو، وہ ''دنیوی رونق'' کا حصہ ہے، اِس لیے اللہ تعالی کو ناپسندیدہ اور ناگوار ہے۔

خواہ وہ مال ودولت کی شکل میں ہو، جاہ ومنصب کی صورت میں ہو، خانگی

مسائل، معاشی مشاغل، اور سیاسی تدابیر کے طور پر ہو، یا بیوی، بچوں اور اہل وعیال کی فکرِ تربیت اور سعیٔ روزگار کے طور پر ہو، دینی تقاضوں میں خلل ڈالنے والی ہر چیز ''دنیا'' ہے، جو بری اور مضر ہے۔

اِس کے برخلاف اِس ''دنیا'' میں پائی جانے والی جو حلال اور مباح چیزیں دینی امور اور مقاصد میں معاون بن جائیں، وہ اللہ کا انعام ہیں، اُن کی قدر دانی اور شکر گذاری کا حکم ہے، اور صحیح معنوں میں دنیا کی ایسی چیزیں تو ''دین'' کا حصہ بھی ہیں۔

اِس کا ظاہری معیار یہ ہے کہ جب دین و دنیا کے تقاضوں میں (جواز وعدم جواز کا، یا اِختیار کرنے اور نہ کرنے کا) اختلاف اور تعارض ہو تو ترجیح ہمیشہ شرعی حکم اور دینی تقاضے کو دی جائے، نفسانی خواہشات، طبعی جذبات اور دنیوی تقاضوں کو نہیں۔

اشتغالِ دنیا کے چار مرتبے:

دراَصل یہاں اشتغالِ دنیا کے چار مرتبے ہیں:

۱: اِنسان اپنا مبلغ علم اور محورِ سعی وعمل قرار تو دے فکرِ آخرت کو، مگر بقدرِ کفاف کسبِ حلال بھی کرلے، یہ زہد فی الدنیا کہلاتا ہے، اور یہی سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے سچے جانشینوں کا طریقہ ہے۔

۲: آخرت کی فکر اور استحضار کے ساتھ ساتھ، سہولت اور آسائش کی حد تک شغلِ دنیا میں لگے، اور اُس کو بھی حصولِ آخرت اور تحصیلِ دین ہی کا ذریعہ بنالے، یہ عام متموّل صالحین کا طرزِ عمل ہے، بلکہ بعض انبیائے سابقین علیہم الصلاۃ والسلام اور بہت سے اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی اِس کا نمونہ موجود ہے۔

۳: دنیا ومافیہا سے (قلباً وعملاً) بالکل یکسو ہوکر، صرف فکرِ آخرت کا غلبہ ہو، اس کے اِختیار کرنے سے اگر دیگر حقوق اللہ اور حقوق العباد متاثر نہ ہوں، تو اس کی بھی گنجائش ہے، بلکہ اگر شرطِ مذکور کی رعایت کے ساتھ، کسی شخص کے لیے دینی اعتبار سے مفید ہونا

متعین ہو جائے، تو محمود اور پسندیدہ بھی ہے۔

۴: حلال وحرام سے بے پروا، اور آخرت سے غافل ہو کر، فکرِ دنیا میں پوری طرح انہماک، یہ وہ دنیاداری ہے جس کی قرآن وحدیث میں مذمت وارد ہوئی ہے۔

یہ ہے ''قرآنی تصورِ حیات'' میں دنیا کی حیثیت اور اُس کا شرعی حکم۔

بہر حال! یہ تو ڈاکٹر شاز کی طرف سے ''اُصولِ اِسلام'' میں کی گئی تحریفات وتلبیسات کی چند مثالیں تھیں، اَب اس کے بعد ''فروعِ اِسلام'' سے بھی اس کے چند نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔

فروعِ اسلام میں کی گئی بعض تلبیسات

۱-:''اعمالِ صالحہ'' کے شرعی مفہوم میں تلبیس:

''قرآن مجید کی مختلف آیتوں کے تقابلی مطالعے سے یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ ''عمل صالح'' دراصل نماز، روزے، حج، زکوٰۃ اور اوراد و وظائف جیسی شخصی عبادتوں سے بہت آگے کی چیز ہے، جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿إن الذین آمنوا وعملوا الصالحات وأقاموا الصلوٰۃ و آتووا الزکوٰۃ لهم أجرهم عند ربهم﴾ (بقرۃ: ۲۷۷)، نماز اور زکوٰۃ سے علیحدہ ''عملِ صالح'' کا یہ مطالبہ جو قرآن اہلِ ایمان سے کرتا ہے، اور جس حوالے سے یہ بشارت سنائی جاتی ہے کہ ایسے لوگوں کے لیے اُن کے رب کے پاس اجر موجود ہے، آخر ہے کیا؟...... بلکہ اِس سے بھی بڑھ کر عمل صالح کے وہ حاملین بھی جن کا تعلق دوسرے ایمانی طائفوں سے ہے مثلاً یہود ونصاریٰ اور صابئین تو ایسے خدا شناسوں اور فکرِ آخرت رکھنے والوں کو بھی عطائے ربی ﴿أجرهم عند ربهم﴾ اور ہر قسم کے خوف وحزن سے نجات ﴿لا خوف علیهم ولا هم یحزنون﴾ کا مژدہ سنایا گیا ہے، گویا ''اہلِ ایمان'' خواہ اُن کا تعلق کسی بھی نبوی طائفے سے ہو؛ اگر وہ عمل صالح کی راہ پر چل نکلیں تو دنیا وآخرت کی کامیابی ان کا مقدر بن جاتی ہے......قرآن کی اصطلاح میں عمل صالح ان تمام کاموں کو محیط ہے جو خدا کے نظامِ کائنات سے ہم آہنگ ہو اور جس کے نتیجے میں نوعِ انسانی کو عام فائدہ پہنچے، شاہراہِ عام سے کانٹا ہٹانے اور عام اِنسانوں کی سہولت کے لیے صاف رکھنے سے لے کر، نوعِ انسانی کو رشد وہدایت سے ہمکنار کرنا، انہیں توہمات وسرکشی سے نجات دلانا اور اُن کے لیے خدا کی عطا کردہ نعمتوں سے متمتع ہونے کے لیے یکساں مواقع فراہم کرنا، یہ سب کچھ عمل صالح کے دائرے میں آتا ہے...... اِس وقت دنیا میں اِنسانی

زندگی کو نئی سمت دینے، معیارِ زندگی کو بلند کرنے، خدا کی کائنات کی تسخیر، خشکی، سمندر اور فضاؤں میں بہتر امکانات کی تلاش، رسل و رسائل کی سہولیات، سفر و حضر کی آسائشیں اور اس جیسے جتنے اعمالِ صالحہ انجام پا رہے ہیں؛ بدقسمتی سے قومی مسلمانوں کا حصہ اِس میں خاصہ کم ہے......"۔ (تشکیل جدید، ملخصاً ص ۴۷-۴۸، از: راشد شاز)۔

اِس اقتباس میں (اور اِس سے متعلق سیاق وسباق کی بقیہ عبارتوں میں) تحریفات وتلبیسات کی بدترین مثالیں جمع ہوگئی ہیں، مثلاً:

الف: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد، آپ پر ایمان نہ لانے کے باوجود یہود ونصاریٰ کو "ایمانی طائفوں" میں شمار کرنا، اور اِس کے لیے قرآن مجید کی آیت: (البقرۃ:۶۲) ﴿إن الذین آمنوا والذین ھادوا والنصاریٰ والصابئین من آمن منھم باللّٰہ والیوم الآخر......﴾ سے بالکل غلط اور بے محل استدلال، جیسا کہ پہلے اِس کی تفصیل عرض کی جاچکی۔

اور رہی بات مُحوّلہ آیت کی جس کے ظاہر سے یہ التباس پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے، تو اُس کا مطلب یہ ہے کہ اِس سے اُن نسل پرست یہودیوں کے عقیدہ اور باطل زعم کی تردید مقصود ہے جو یہ سمجھتے تھے کہ صرف اُنہی کی نسل اللہ کے یہاں مقبول اور ناجی ہے، سو اللہ نے فرمادیا کہ ہمارے یہاں نجات کا مدار کبھی بھی کسی نسل، یا قوم اور قبیلہ سے ہونے پر نہیں رہا ہے، بلکہ اِیمان اور اعمالِ صالحہ کے اختیار کرنے پر رہا ہے، چاہے وہ اہلِ ایمان (مسلمان) ہوں، یا یہود ہوں، یا نصاریٰ ہوں، یا کوئی اور جماعت اور طبقہ ہو۔

اور یہ بات دوسری آیات سے ثابت ہوچکی ہے کہ اَب اللہ کے یہاں وہی ایمان معتبر اور مقبول ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اِیمان لانے، اور آپ کی اِطاعت واتباع کے ساتھ ہو: (النور:۵۴) ﴿وإن تطیعوہ تھتدوا﴾ (اگر تم نے اُن کی اِطاعت کی تو راستہ پالوگے)، اور: (الاعراف:۱۵۸) ﴿واتبعوہ لعلکم تھتدون﴾ (اور اُن کا اتباع کرو تاکہ تم ہدایت پاجاؤ)۔

ب: مذکورہ بالا اقتباس میں ''اعمالِ صالحہ'' کی قرآنی اِصطلاح میں دراندازی کی مذموم کوشش کی گئی ہے، حالاں کہ یہ بات بھی پہلے عرض کی جاچکی ہے کہ اِسلام دو حصوں پر مشتمل ہے: اُصول اور فروع، اور فروع میں پانچ قسم کے اعمال داخل ہیں: عبادات، معاملات، معاشرت، اخلاق، اور سیاست، اور یہی اقسامِ خمسہ شرعی اصطلاح میں ''اعمالِ صالحہ'' کا مجموعہ ہیں۔

پھر اِن میں بھی آپس میں فرقِ مراتب ہے، عبادات کا درجہ سب سے بڑھا ہوا ہے، اِسی لیے قرآن کریم نے ''اِیمان والوں'' کے اوصاف بیان کرتے ہوئے، اُن کے معمولات میں سے زیادہ تر نماز، زکوٰۃ وغیرہ ہی کا تذکرہ کیا ہے، قرآن مجید میں پچاس سے زائد مرتبہ اِقامتِ صلاۃ کا صراحتاً یا اشارۃً امر وارد ہوا ہے۔

حتیٰ کہ جن مواقع پر دیگر ''اعمال صالحہ'' (مثلاً والدین، یتیموں، مسکینوں، پڑوسیوں اور مسافروں کے ساتھ حسن سلوک، لغویات سے احتراز، تواضع کا اختیار کرنا، مصارف میں اعتدال رکھنا، زنا، جھوٹ، وعدہ خلافی، ناجائز قتل، حرام کمائی وغیرہ معاصی سے اجتناب) کا حکم دیا گیا ہے، وہاں بھی پہلو بہ پہلو نماز کی تذکیر اور تاکید کی گئی ہے۔

عباد الرحمن کی مبارک فہرست میں بھی اِن عبادت گذاروں کا ذکرِ خیر موجود ہے، فلاح یافتہ طبقات میں بھی اِن کو سرفہرست رکھا گیا ہے ﴿قد أفلح المؤمنون، الذين هم في صلاتهم خاشعون، والذين هم عن اللغو معرضون، والذين هم للزكوة فاعلون﴾ (المؤمنون:۱-۴)۔

یہاں ایک نکتہ اور بھی غور کرنے کا ہے کہ قرآنِ کریم نے ''المفلحون'' (کامیاب) اور ''الفائزون'' (کامران لوگوں) کا جہاں جہاں تذکرہ کیا ہے اُن کے کس طرح کے اعمال کے ساتھ کیا ہے؟ پورے قرآن مجید میں اِن فوز وفلاح والوں کے یہ اعمال مذکور ہیں: اِقامت صلوۃ، اِیتائے زکوۃ، اَمر بالمعروف، نہی عن المنکر، جہاد فی

سبیل اللہ، اِنفاق فی سبیل اللہ، سمع وطاعتِ خدا ورسول، صبر، تقوی، خشیت، رشتہ داروں، محتاجوں اور مسافروں کے ساتھ حسنِ سلوک، اور اہلِ کفر سے تبرّی۔

لہٰذا جو شخص اِن امور میں سے جس چیز میں جتنی کوتاہی کرے گا اتنا ہی اُس کے ''عملِ صالح'' میں نقص پیدا ہوگا، اور اس کی وجہ سے عند اللہ اُس کا مرتبہ گھٹے گا، مگر جب تک وہ اللہ کی وحدانیت کا اقرار کررہا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین مانتے ہوئے اپنا رہبر اور رہنما دِل وزبان سے تسلیم کررہا ہے، وہ ''اِسلام'' کے دائرہ سے خارج نہیں ہوگا (اِلا یہ کہ اُس سے کوئی ایسا قول یا عمل پایا جائے جس سے اللہ ورسول کی بات یا آیات کی تکذیب، یا انکار، یا استکبار لازم آتا ہو، جیسا کہ عرض کیا جاچکا)۔

خلاصہ یہ کہ نماز، زکوٰۃ وغیرہ عبادات ''اعمالِ صالحہ'' کا افضل ترین مصداق ہیں، اِسی وجہ سے بعض جگہ اعمال صالحہ کا ذکر کرتے ہوئے بطور مثال صرف انہی کا تذکرہ کردیا گیا ہے: ﴿إن الذين آمنوا وعملوا الصالحات وأقاموا الصلاة وآتَوُا الزكوٰة لهم أجرهم عند ربهم ولا خوف عليهم ولا يحزنون﴾ (البقرة: ۲۷۷)، نہ یہ کہ نعوذ باللہ یہ ''اعمالِ صالحہ'' سے الگ کوئی چیز ہیں، جیسے کہ کوئی شخص انبیائے سابقین علیہم السلام کا ذکر کرتے ہوئے، سیدنا حضرت ابراہیم واسماعیل علیہما السلام کا اسم گرامی خاص طور پر ذکر کردے، یا صحابہؓ کا تذکرہ کرتے ہوئے، حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ کا اسمِ گرامی بطورِ خاص لے لے۔

ج: اور جہاں تک بات اِس کی ہے کہ:

> ''اِس وقت دنیا میں اِنسانی زندگی کو نئی سمت دینے، معیارِ زندگی کو بلند کرنے، خدا کی کائنات کی تسخیر، خشکی، سمندر اور فضاؤں میں بہتر امکانات کی تلاش، رسل ورسائل کی سہولیات، سفر وحضر کی آسائشیں اور اِس جیسے جتنے ''اعمالِ صالحہ'' انجام پارہے ہیں؛ بدقسمتی سے قومی مسلمانوں کا حصہ اِس میں خاصہ کم ہے''

تو اِس اِلزام کے جواب میں تین باتیں قابلِ توجہ ہیں:

۱: مسلمانوں کا مقصد زندگی اور محور بندگی:

پہلی بات تو یہ کہ ''اِسلام'' میں ایک سوچا سمجھا لائحۂ عمل متعین ہے، کہ ''خوردن برائے زیستن، نہ زیستن برائے خوردن''، ہم مسلمانوں کے یہاں کھانا برائے زندگی ہے، اور زندگی برائے بندگی، ہم اِس دنیا کی زندگی کو عارضی اور چند روزہ مانتے ہیں، اصل زندگی آخرت کی زندگی کو تصور کرتے ہیں، اِس لیے جہاں جتنا رہنا ہے وہاں کے لیے اُس سے زیادہ اپنے آپ کو کھپانا حماقت اور بے وقوفی سمجھتے ہیں۔

ہمارا مقصدِ حیات ''عبادت'' ہے، لہٰذا خالق تبارک وتعالیٰ نے (قرآن وحدیث میں) اُس کا جو طریقہ بتایا ہے، اور (انفرادی یا اجتماعی) جس وقت کے لیے جس عمل کا جس طرح سے مطالبہ کیا ہے، ہمارے ذمہ اپنی اپنی بساط بھر اُس کی بجا آوری ہے، باقی اِس کے آگے کا نتیجہ ہمارے اِختیار سے باہر ہے: (المائدۃ: ۱۰۵) ﴿یا أیھا الذین آمنوا علیکم أنفسکم لا یضرکم من ضل إذا اھتدیتم﴾ (اِیمان والو! تم اپنی فکر کرو، اگر تم سیدھے راستے پر ہو تو گم راہ لوگ تمھیں ضرر نہیں پہنچا سکتے)۔

اِسی طرح آج کل کی مزعومہ ترقیات میں حصہ داری کے سلسلے میں بھی ہمارا موقف بالکل واضح ہے کہ ہم اِن ترقیات کو اِس حیثیت سے بالکل لائقِ اعتناء نہیں سمجھتے کہ اِسلام یا مسلمانوں کی کوئی ترقی اِس پر موقوف ہے، جن امور کا اشتغال بندے کو اپنے مالک سے غافل، اور راہِ حق سے گمراہ کردے، وہ ترقی کی بنیاد کیوں کر ہو سکتے ہیں؟

بھلا جس قوم کی منزل جنت ہو اُس کے لیے اِس رہ گذر کے کانٹوں میں الجھنا کہاں کی دانش مندی ہے؟ حدیث شریف میں تو مسلمانوں کی زبوں حالی کا بنیادی سبب ہی: ''حب الدنیا و کراھیۃ الموت'' بتایا گیا ہے، قرآنِ کریم میں بھی ''متاعِ دنیا'' کی فریب کاریوں اور ''حیاتِ دنیویہ'' کے دھوکہ وغرور کو بار بار اسی وجہ سے بیان فرمایا گیا ہے کہ بندے ضرورت سے زیادہ تعیُّش، اور حطامِ دنیا کے حصول، پھر ان کے دوام وبقا کی فکر

وتدابیر میں الجھ کر مقصدِ حیات سے دور نہ جا پڑیں۔

﴿والعصر، إن الإنسان لفي خسر، إلا الذين آمنوا وعملوا الصالحات ......﴾، اور ﴿ثم رددناه أسفل سافلين، إلا الذين آمنوا وعملوا الصالحات......﴾ جیسی آیات میں اِسی مضمون کا بیان ہے، کہ ہر عصر اور ہر زمانہ کے اِنسانوں کے لیے دنیا و آخرت کی تباہی اور خسران سے نکلنے کا واحد راستہ، اور دونوں جہان کی کامیابی کے حصول کا واحد ذریعہ یہی ہے کہ وہ ایمان لائیں، اَعمال صالحہ اِختیار کریں، اور صبر وتقوی والی زندگی گذاریں، اور بس......۔

ہاں جن امور کا مسلمانوں کی (بحیثیت مسلمان کے) حفاظت، ضرورت اور قدرے سہولت سے تعلق ہے، اُن کو حاصل کرنا یقیناً مستحسن ہے، مگر وہ بھی عقائد واعمال کی حفاظت کی شرط پر۔

اور اس کا مناسب اور مجرب طریقہ یہ ہے کہ مقصودِ اصلی دِین اور آخرت کو قرار دیتے ہوئے؛ قوم کے اندر سب سے پہلے اِتحاد، تنظیم، امانت داری اور منصوبہ بندی جیسے بنیادی اوصاف پیدا کرنے کی فکر کی جائے، پھر تقسیمِ کار کے اصول پر عمل کرتے ہوئے، ہر شعبۂ حیات کی اجتماعی ذمہ داریاں انجام دینے کے لیے مخصوص افراد اور جماعتیں تیار کی جائیں، اُس کے بعد اِسلام کی اِشاعت، حفاظت اور شوکت کے ساتھ ساتھ، خدمتِ خلق اور انتظامِ ملکی کے لیے دنیاوی ترقی کی چیزیں وسائل کے طور پر اختیار کی جائیں۔

مگر جب مقصد زندگی صرف دنیا اور آسائشِ دنیا ہی ہو کر رہ جائے پھر تو اِسلام کے حوالے سے ساری گفتگو ہی بے کار، کیوں کہ اِسلام تو دنیوی زندگی کا مزا اصلاً کافروں کا حصہ قرار دیتا ہے: (محمد:۱۲) ﴿والذين كفروا يتمتعون ويأكلون كما تأكل الأنعام، والنار مثوى لهم﴾ (اور جنھوں نے کفر اَپنالیا ہے وہ (دنیا میں) مزے اُڑاتے ہیں اور اِس طرح کھاتے ہیں جیسے جانور کھاتے ہیں، مگر آئندہ اُن کا ٹھکانہ دوزخ ہے)۔

ایک دوسری جگہ تو یہ مضمون خوب ہی واضح کردیا گیا ہے: (الزخرف: ۳۳۔۳۵) ﴿ولولا أن يكون الناس أمةً واحدةً لجعلنا لمن يكفر بالرحمن لبيوتهم سقفاً من فضة ومعارج عليها يظهرون، ولبيوتهم أبواباً وسرراً عليها يتكئون، وزخرفاً، وإن كل ذلك لما متاع الحيوٰة الدنيا، والآخرة عند ربك للمتقين﴾

(اور اگر اِس کا خیال نہ ہوتا کہ سارے لوگ ایک ہی طریقہ کے (کافر اور دنیا کے طالب) ہوجائیں گے تو ہم کافروں کے گھروں کی چھتیں چاندی کی کردیتے، اور سیڑھیاں بھی جن پر وہ چڑھتے ہیں، اور اُن کے گھروں کے دروازے اور تخت (ومسہریاں) بھی جن پر وہ تکیہ لگا کر بیٹھتے ہیں، اور سونے کی بھی (کردیتے)، اور حقیقت میں یہ سب چیزیں (مختصر سی) دنیوی زندگی کا (بے وقعت سا) سامان ہیں، اور آخرت (جہاں کی ہر چیز دائمی ہے) آپ کے رب کے نزدیک تقوی والوں کے خاص ہے)۔

یعنی اللہ کے یہاں اِس دنیوی مال ودولت کی کوئی قدر نہیں، نہ اس کا دِیا جانا اللہ کے یہاں قرب ووجاہت، یا ترقی ومقبولیت کی کوئی دلیل ہے، اور نہ اُس کا نہ دیا جانا ذلت ونکبت، یا پستی ومحرومی کی کوئی علامت ہے، یہ تو ایسی بے قدر چیز ہے کہ اگر اوپر درج مصلحت نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ یہ سب چیزیں صرف کافروں ہی کو دیتے، ایمان والوں کو دنیا کی زیب وزینت اور عیش پسندی کی اجازت ہی نہ دیتے۔

۲: مقصد سے ہماری غفلت:

دوسری بات یہ ہے کہ یہ امر واقعہ ہے کہ بحیثیت مجموعی اِس وقت پوری امت دینی اِعتبار سے شدید انحطاط کا شکار ہے، ایک اَرب مسلمانوں میں سے بمشکل دس بیس فی صد مسلمان اللہ کے دربار میں پنج وقتہ طور پر حاضری دیتے ہیں، اُن میں سے بھی ایک مختصر سی جماعت صحیح معنوں میں اِقامتِ صلوٰۃ کا فریضہ انجام دیتی ہے، اور یہ حال تو نماز کا ہے

جو اہم العبادات اور افضل الاعمال ہے، باقی اِس کے علاوہ عبادات اور اَعمالِ صالحہ کے دیگر شعبوں کا حال اِس سے بھی زیادہ ناگفتہ بہ ہے، معاملات کی خرابی مسلمانوں کی پہچان بن چکی ہے، معاشرت کی بربادی خواص تک کے گھرانوں تک پہنچی ہوئی ہے، اَخلاق کی تو حقیقت بھی ذہنوں سے محو ہوتی جارہی ہے، سیاست کے بارے میں تو مسلمانوں کو یہ یاد ہی نہیں رہ گیا ہے کہ اُس کا بھی شرعیات اور اسلامیات سے کوئی تعلق ہے۔

علمِ دین کے لیے پوری قوم میں سے صرف ایک ڈیڑھ فی صد اَفراد دینی مدارس کا رخ کررہے ہیں، اور اُن ڈیڑھ فی صد میں سے نصف کے قریب مختلف عوامل کی بنا پر ضائع ہوجاتے ہیں، باقی نصف میں سے بمشکل دس فی صد باصلاحیت اور بااستعداد ہوتے ہیں، پھر اُن میں سے بھی معدودے چند ہی صحیح الفکر، سلیم الطبع، متدین اور متقی ہوتے ہیں، غرضیکہ دین کے تمام شعبے اور ''اعمالِ صالحہ'' کے اکثر حصے ہماری عملی زندگی سے خارج ہوچکے ہیں، ایسے میں ہم کس منہ سے اللہ کی غیبی نصرت کے حق دار یا دعویدار ہوسکتے ہیں؟

خدمتِ خلق اور راحت رسانئ مخلوق کا وہ حصہ اور وہ طریقہ جو (بیواؤں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، ضرورت مندوں، رشتہ داروں اور پڑوسیوں وغیرہ کے ساتھ حسنِ سلوک کی شکل میں زکوۃ، صدقہ، خیرات، اور ملی، رفاہی وامدادی کاموں کے ذریعہ) کتاب وسنت میں مشروع، اور قدیم زمانہ سے معمول بہا چلا آرہا ہے، وہ یقیناً اپنانے اور اِہتمام کرنے کی چیز ہے، مگر یہ تلخ حقیقت ہے کہ ہم مسلمانوں سے دین کے اِس اہم شعبے میں بھی بڑی کوتاہی ہورہی ہے، حالاں کہ قرآن وحدیث میں اِن اَعمال کی بڑی اہمیت وارد ہوئی ہے، اور ہمارے اَسلاف کے اِس سلسلہ میں بڑے بڑے واقعات منقول ہیں، لیکن ہم لوگ دین کے اِس شعبے میں بھی اللہ تعالیٰ کے مجرم ہیں، اور ہمارے موجودہ حالات ہماری ایسی ہی بداعمالیوں کا شاخسانہ ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اِستخلاف فی الارض (سیادتِ عالم وقیادتِ انسانیت) کا وعدہ اُن لوگوں سے کیا ہے جو (اللہ و رسول اور قرآن و آخرت پر) ''اِیمان'' رکھنے والے ہیں، اور ''اعمالِ صالحہ'' (عبادات، معاملات، معاشرت، اخلاق اور سیاست) کو شریعت کے مطابق انجام دینے والے ہیں، ورنہ صرف ''قومی مسلمانوں'' سے یقیناً اللہ نے کسی قسم کی نصرت وحمایت کا وعدہ نہیں کیا ہے۔

غرضیکہ اِس وقت ہماری زندگیوں میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے چودہ سو سال قبل آئے ہوئے دین ہی کی ''تجدید'' کی ضرورت ہے، نہ کہ العیاذ باللہ شاز جیسے لوگوں کی طرف سے اِیجاد کردہ ''جدید اِسلام'' کے قبول کرنے کی۔

۳: اہلِ باطل کی دنیوی ترقی کا راز:

تیسری بات یہ کہ آخرت کی نجات اور کامیابی تو یقیناً عقائد وعبادات کی سلامتی پر موقوف ہے، اِس کے بغیر وہاں کی فلاح کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، اور یہ بات بھی طے ہے کہ باطل کے اندر از خود اُبھرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی: (الإسراء:۸۱) ﴿إن الباطل كان زهوقاً﴾ (باطل تو مٹنے والی چیز ہے)۔

مگر دُنیا کی ترقی اور حکومت وسلطنت خالقِ دنیا نے (عام حالات میں) چند ظاہری اعمال اور مخصوص اسباب وعلل سے مربوط کر رکھی ہے، جو قوم بھی اُن اسباب کو اختیار کرے گی وہ دنیوی ترقی کو پا لے گی، اور وہ اسباب ہیں: اَخلاق ومعاشرت کی درستگی اور معاملات کی صفائی، اور شرعی حدود کے اندر تدبیر وسیاست کی فکر۔

اِس لیے کہ اِن امور کی اصلاح کے بغیر (اسباب کے لحاظ سے) یہاں کا نظام چل ہی نہیں سکتا، اور یہ بات پہلے عرض کی جا چکی ہے کہ یہ تمام امور فروعِ اِسلام سے تعلق رکھتے ہیں، اور ''اعمالِ صالحہ'' کا ہی حصہ ہیں، لہٰذا جو قوم یا اَفراد اِن چیزوں کو اِختیار کریں گے اُنہی کو دنیوی جاہ وترقی کا منصب دیا جائے گا۔

اِسی سے معلوم ہو گیا کہ آج کل جو اہلِ باطل ترقی کرتے ہوئے دِکھائی دے رہے ہیں اُس کی وجہ یہ ہے کہ اُنھوں نے دُنیوی ترقی کے لیے اِسلام کے بتائے ہوئے مذکورہ راز کو پالیا ہے، اور ظاہری طور پر ہی سہی (اَخلاق و معاشرت اور سیاست و معاملات کی درستگی کے) اِسلامی گُر کو اپنا لیا ہے، جب کہ اہلِ اِسلام اپنے ہی گھر کے اِس قیمتی نسخہ کو فراموش کر بیٹھے ہیں۔

مگر بہر حال اِس گئی گذری حالت میں بھی ''اِیمان'' کی برکت سے الحمدللہ اہلِ اسلام اپنا وجود برقرار رکھے ہوئے ہیں، ورنہ ایسے حالات میں تو دوسری قومیں اپنا وجود بھی کھو بیٹھیں، اور ترقی کی اصل بنیاد تو اِیمان ہی ہے، جس کی اِن اہلِ باطل کو ہوا بھی نہیں لگی، اگر اِیمان کے ساتھ دیگر خوبیاں بھی جمع ہو جائیں تو آدمی کہاں سے کہاں پہنچ جائے، جیسا کہ صحابۂ کرامؓ اور سلفِ صالحین کا نمونہ سب کے سامنے ہے۔

۲- تقویٰ کے اِسلامی مفہوم میں تحریف:

''وہ کتاب جو ﴿هدى للمتقين﴾ کے دعوے سے شروع ہوتی ہے اُس پر فقہاء کی تعبیرات نے - ایسا محسوس ہوا - دوسری ثقافت کے ''متقین'' کے لیے دروازہ بند کر دیا ہو، وحیٔ ربانی کی خالص فقہی تعبیر اور پھر اِس تعبیر کو مغزِ دین قرار دینے کے نتیجے میں بہت جلد یہ آفاقی امت جسے سیادت عالم کے منصب پر فائز کیا گیا ہے، فرقۂ محمدی کی نفسیات میں محصور ہو گئی، مسائلِ عالم سے اپنا رخ موڑ کر اور عام انسانیت کی فلاح سے دست بردار ہو کر ہماری تمام تر توجہ ایک مخصوص ثقافتی شناخت والی امت مسلمہ پر مرکوز ہوتی گئی، حتی کہ ہمارے فقہاء نے دنیا کو اِسلامی اور غیر اِسلامی سرزمین میں بانٹ ڈالا اور ایسا محسوس ہوا کہ مسلم آبادی کے علاقوں کے علاوہ دنیا کے دوسرے خطوں کا ہم سے کوئی تعلق نہیں......''۔ (اِدراکِ زوالِ امت، حصہ اول، ص ۱۴، از: راشد شاز)۔

اِس اِقتباس میں جہل، دجل اور خلط و تلبیس کی کئی مثالیں جمع ہو گئی ہیں:

الف: یہ کہنا کہ

"وہ کتاب جو ﴿ھدی للمتقین﴾ کے دعوے سے شروع ہوتی ہے اُس پر فقہاء کی تعبیرات نے دوسری ثقافت کے "متقین" کے لیے دروازہ بند کر دیا ہو"

تقوی کا شرعی مفہوم:

(ا) اِس میں ایک تو "تقوی" کے قرآنی تصور میں تحریف کی گئی ہے، اِس لیے کہ "تقوی" قرآنِ کریم میں دو معنوں میں اِستعمال ہوا ہے:

۱: بچنا، پرہیز کرنا: ﴿فالھمھا فجورھا وتقواھا﴾ (الشمس:۸)۔

۲: ڈرنا، خوف کھانا: ﴿ویخش اللہ ویتقہ﴾ (النور:۵۲)۔

پھر تقویٰ کا لفظ "پرہیز گاری" کے معنی میں جہاں جہاں استعمال ہوا ہے وہاں کفر وشرک، محرّماتِ ظاہرہ اور امورِ مشتبہہ سے پرہیز مراد ہے، جس میں کفر وشرک سے پرہیز سب سے پہلا مرحلہ ہے، اور جو شخص سید الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا پیشوا اور رہنمانہ مانتا ہو اُس سے بڑا بد پرہیز اور غیر متقی کون ہوسکتا ہے؟

اور جہاں "ڈرنے" کے معنی میں تقویٰ کا اِطلاق کیا گیا ہے، وہاں اللہ تعالی کی ناراضگی سے ڈر اور خوف مراد ہے، اور اللہ تعالی شرکیہ اعمال کے بعد اِس بات سے زیادہ کس چیز سے ناراض ہوں گے کہ اُس کے حبیبِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور آپ کی اِطاعت کا اِنکار کیا جائے؟ جب کہ قرآن، رسول کی اِطاعت کو خدا کی اِطاعت قرار دے رہا ہے: (النساء:۸۰) ﴿من یطع الرسول فقد أطاع اللہ﴾ (جس نے رسول کی اِطاعت کی تو اُس نے اللہ کی اِطاعت کی)، اور اُس کا صاف اِعلان ہے: (الجن:۲۳) ﴿ومن یعص اللہ ورسولہ فإن لہ نار جھنم خالدین فیھا أبداً﴾ (اور جو لوگ اللہ اور اُس کے رسول کی نافرمانی کریں گے تو یقیناً اُن کے لیے جہنم کی آگ ہوگی جس میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے)۔

اِطاعت کا پہلا زینہ "تسلیم وخود سپردگی" ہے، لہٰذا جو لوگ قرآن کے بنیادی

عقائد ہی کو تسلیم نہیں کرتے؛ "اِسلام" میں اُن کے خوف و خشیت کا کیا اِعتبار ہو سکتا ہے؟

متقی کون؟

اور اَصل بات یہ ہے کہ "تقویٰ" کا معیار اور "متقین" کی شناخت تو قرآن کریم نے واضح الفاظ اور واشگاف انداز میں خود ہی متعین کر دی ہے:

(البقرۃ:۱۷۷) ﴿......ولکن البر من آمن بالله والیوم الآخر والملٰئکۃ والکتاب والنبیین، وآتی المال علی حبه ذوي القربی والیتٰمی والمساکین وابن السبیل والسائلین وفي الرقاب، وأقام الصلوۃ وآتی الزکوۃ، والموفون بعهدهم إذا عاهدوا، والصابرین في البأساء والضراء وحین البأس، أولئک الذین صدقوا، وأولئک هم المتقون﴾

(......اور نیکی (کا کمال) یہ ہے کہ کوئی شخص ایمان رکھے: اللہ تعالیٰ پر، اور قیامت کے دن پر، اور فرشتوں پر، اور کتابِ مخصوص (قرآن) پر، اور پیغمبروں پر، اور اللہ کی محبت میں مال دے: رشتہ داروں کو، اور یتیموں کو، اور محتاجوں کو، اور مسافروں کو، اور سوال کرنے والوں کو، اور (قیدیوں یا غلاموں کی) گردنوں کے چھڑانے میں، اور نماز کی پابندی کرے، اور زکوۃ دیا کرے، اور جو لوگ کہ پیمانِ وفا باندھنے کے بعد اُس کو پورا کرنے والے ہوں، اور فاقہ و تنگی، بیماری و آزاری اور لڑائی کے وقت بھی ثابت قدم رہتے ہوں، یہ ہیں وہ لوگ جو سچے ہیں، اور یہی ہیں وہ لوگ جو متقی ہیں)۔

(۲) مذکورہ بالا اقتباس کی دوسری تلبیس اور جہالت یہ ہے کہ "دوسری ثقافت کے متقین کے لیے دروازہ بند کر دینے" کا ذمہ دار "فقہاء کی تعبیرات" کو ٹھہرایا گیا ہے، حالاں کہ اوّلاً تو قرآن مجید کی اِصطلاح ہی "متقین" کو "اِسلام" اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ماننے والوں کے ساتھ خاص کر رہی ہے، ثانیاً خود قرآن کریم میں دوسری جگہ یہی مضمون "مؤمنین" کی قید کے ساتھ وارد ہوا ہے: (النمل:۱-۳) ﴿طٰسٓ، تلک

آیات القرآن و کتاب مبین، ھدی وبشری للمؤمنین، الذین یقیمون الصلوۃ ویؤتون الزکوۃ وھم بالآخرۃ ھم یوقنون ﴾ (طٰسٓ، یہ قرآن کی اور ایک ایسی کتاب کی آیتیں ہیں جو حقیقت کھول دینے والی ہے، یہ اُن مؤمنوں کے لیے سراپا ہدایت اور خوش خبری بن کر آئی ہے، جو نماز قائم کرتے ہیں، اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، اور وہی ہیں وہ جو آخرت پر یقین رکھتے ہیں)۔

اور یہ معلوم ہے کہ قرآن کریم کی اصطلاح میں ''اہلِ اِیمان'' کا لفظ: یہود ونصاریٰ اور دیگر امم کے بالمقابل امتِ محمدیہ (علی صاحبھا الصلوۃ والسلام) کے لیے بولا جاتا ہے، جیسا کہ: (البقرۃ:۶۲) ﴿إن الذین آمنوا والذین ھادوا والنصاریٰ والصابئین من آمن منھم باللّٰہ والیوم الآخر ...... ﴾ سے ظاہر ہے۔

ب: ''منصبِ امامت''، ''سیادتِ عالَم''، ''قیادتِ انسانیت''، ''زوالِ امت کے اسباب'' اور ''مستقبل کی بازیافت'' وغیرہ خوش نما الفاظ اِس شخص کی تحریروں میں ''ٹیپ کے بند'' کی حیثیت رکھتے ہیں، چنانچہ محولہ بالا اقتباس میں بھی اِسی مصنوعی فکرمندی کا اِظہار موجود ہے:

> ''بہت جلد یہ آفاقی امت جسے سیادت عالم کے منصب پر فائز کیا گیا ہے، فرقۂ محمدی کی نفسیات میں محصور ہوگئی، مسائلِ عالم سے اپنا رخ موڑ کر اور عام انسانیت کی فلاح سے دست بردار ہوکر ہماری تمام تر توجہ ایک مخصوص ثقافتی شناخت والی امت مسلمہ پر مرکوز ہوتی گئی''

مسلمانوں کی سیادت کا میدان اور اُس کے حصول کا شرعی طریقہ:

(۱) پہلی بات تو یہ کہ ''سیادتِ عالَم'' کی مراد نہیں واضح کی گئی کہ اِس غلبہ اور سیادت کا میدان کیا ہے؟ سیاسی واقتصادی غلبہ؟ یا علمی وفکری غلبہ؟ یا دینی واخلاقی غلبہ؟ یہ تعیین اِس لیے ضروری ہے کہ ''فرقۂ محمدی'' کو جو گذشتہ تیرہ سو سالوں تک مسلسل بحیثیت

مجموعی اِن تمام میدانوں میں غلبہ حاصل رہا ہے، یہ معترضین اُس کا کہیں اِعتراف کرتے ہوئے نہیں دکھتے، اور ہمارے یہ معترض صاحب تو اپنے لٹریچر میں "فرقۂ محمدی" کو "اِیرانی فتنہ" کے ذریعہ ہونے والی شہادتِ سیدنا حضرت عثمانؓ کے بعد سے اَب تک مسلسل زوال پذیر دکھاتے ہیں، حالاں کہ اگر سیاسی و اقتصادی غلبہ کی بات ہے؛ تو ابھی دو صدیوں پہلے تک دنیا کی واحد سپر پاور طاقت مسلمانوں ہی کی تھی، پھر اِس کا سر رشتہ "مقتلِ عثمان" سے جوڑنا کیوں کر درست ہوسکتا ہے؟

پھر اہم بات یہ کہ اہلِ اِسلام کے لیے سیاسی و اِقتصادی غلبہ مقصود نہیں ہے، بلکہ موعود ہے، جو اِیمان اور اَعمالِ صالحہ کے پائے جانے پر پورا کیا جاتا ہے: (النور: ۵۵) ﴿وعد اللّٰہ الذین آمنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنهم في الأرض کما استخلف الذین من قبلهم، ولیمکنن لهم دینهم الذي ارتضی لهم، ولیبدلنهم من بعد خوفهم أمناً......﴾

(تم میں سے جو لوگ اِیمان لائیں اور نیک اعمال کریں اُن سے اللہ وعدہ فرماتا ہے کہ اُن کو زمین کی خلافت دے دیگا، جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو دی تھی، اور اُن کے لیے اُس دین کو ضرور اِقتدار بخشے گا جسے اُن کے لیے پسند کیا ہے، اور اُن کو جو خوف لاحق رہا ہے اُس کے بدلے اُنھیں ضرور اَمن عطا کرے گا......)۔

اور اِس اِستخلاف وتمکین کی غایت اور اِمامت وسیادت کا مقصود بھی نماز اور زکوٰۃ وغیرہ اَعمالِ صالحہ ہی کے قیام کو قرار دیا گیا ہے: (الحج: ۴۱) ﴿الذین إن مکناهم في الأرض أقاموا الصلوٰۃ وآتوا الزکوٰۃ وأمروا بالمعروف ونهوا عن المنکر﴾ (یہ ایسے لوگ ہیں کہ اگر ہم انھیں زمین میں اِقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں، اور زکوٰۃ ادا کریں، اور لوگوں کو نیکی کی تاکید کریں، اور برائی سے روکیں)۔

یادرکھنا چاہیے کہ اِسلام کی بنیاد "مادیت" کے بجائے "روحانیت" پر رکھی گئی

ہے، جو اِخلاص اور اتباعِ سنت سے عبارت ہے، اِسی لیے قرآنِ کریم میں اہلِ اِسلام کو ترقی کے جو اَسباب بتائے گئے ہیں وہ یہ ہیں:

(آل عمران:۱۳۹)﴿وأنتم الأعلون إن كنتم مؤمنين﴾(اور غالب تم ہی رہو گے اگر تم پورے مؤمن رہے)۔

اور(البقرة:۱۵۳)﴿يا أيها الذين آمنوا استعينوا بالصبر والصلاة﴾(اے ایمان والو! صبر اور نماز سے سہارا حاصل کرو)۔

(الأنفال:۴۵-۴۶)﴿يا أيها الذين آمنوا إذا لقيتم فئةً فاثبتوا واذكروا الله كثيراً لعلكم تفلحون، وأطيعوا الله ورسوله ولا تنازعوا فتفشلوا وتذهب ريحكم واصبروا، إن الله مع الصابرين﴾

(ایمان والو! جب تم کو کسی سے مقابلہ کا اتفاق ہوا کرے تو ثبات قدمی اختیار کیا کرو، اور اللہ کا ذکر خوب کثرت سے کیا کرو، امید کہ تم کامیاب ہوگے، اور اللہ ورسول کی اطاعت کیا کرو، اور آپس میں اختلاف مت کیا کرو، ورنہ کم ہمت ہو جاؤ گے، اور تمہاری ہوا اُکھڑ جائے گی، اور صبر سے کام لیا کرو، بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہیں)۔

صبر کا شرعی مفہوم:

صبر کے معنی ہیں: جمے رہنا، ثابت قدم رہنا، شریعت میں اِس کا اِطلاق تین معانی پر کیا جاتا ہے:

۱: مصائب ومشکلات کے وقت خود پر قابو رکھنا، اور شکوہ شکایت یا ناجائز تدابیر میں نہ پڑ جانا:(الأحقاف:۳۵)﴿فاصبر كما صبر أولوا العزم من الرسل ولا تستعجل لهم﴾(اے پیغمبر! آپ بھی ایسے ہی صبر سے کام لیجیے، جیسے اولوالعزم پیغمبروں نے صبر کیا ہے، اور ان کافروں کے معاملے میں جلدی نہ کیجیے)۔

۲: گناہوں کے تقاضے اور خلافِ شرع امور کے ارتکاب سے نفس کو روکنا:

(الدھر: ۲۴) ﴿فاصبر لحکم ربک ولاتطع منھم آثماً أو کفوراً﴾ (آپ اپنے پروردگار کے حکم پر ثابت قدم رہیے، اور ان میں سے کسی نافرمان اور کافر کی بات نہ مانیے)۔

(الکھف: ٦۹) ﴿ستجدني إن شاء اللّٰہ صابراً ولا أعصي لک امراً﴾ (موسیٰ علیہ السلام نے خضر علیہ السلام سے فرمایا: آپ ان شاء اللہ مجھے ثابت قدم پائیں گے، اور میں کسی معاملہ میں آپ کی نافرمانی نہیں کروں گا)۔

۳: طاعات اور نیکیوں پر اپنے آپ کو جمانا اور استقامت اختیار کرنا: (طٰہٰ: ۳۲) ﴿وأمر أھلک بالصلوۃ واصطبر علیھا﴾ (اپنے متعلقین کو بھی نماز کا حکم دیجیے، اور خود بھی اس پر جمے رہیے)۔

صبر کے مفہوم میں حسبِ موقع یہ تینوں ہی معانی ہر مسلمان سے ہمہ وقت مطلوب ہیں، اور صبر اپنے اِس وسیع مفہوم کے ساتھ ایسی پرتاثیر چیز ہے کہ اِس سے غیبی مدد متوجہ ہوتی ہے: (آل عمران: ۱۲۵) ﴿بلی إن تصبروا وتتقوا ویأتوکم من فورھم ھذا یمددکم ربکم بخمسۃ آلف من الملائکۃ مسومین﴾

(ہاں کیوں نہیں، اگر تم صبر کروگے اور تقویٰ اختیار کروگے اور پھر دشمن تم پر ایک دم سے آپہنچیں گے تو تمہارا رب تمہاری مدد فرمائے گا پانچ ہزار فرشتوں سے جو ایک خاص وضع بنائے ہوئے ہوں گے)۔

صبر اور تقویٰ کی بدولت دشمنوں کی تدبیریں اور سازشیں اللہ تعالیٰ خود ہی ناکام فرمادیتے ہیں: (آل عمران: ۱۲۰) ﴿وإن تصبروا وتتقوا لایضرکم کیدھم شیئاً﴾ (اور اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اِختیار کرو تو دشمنوں کی تدبیر تمھیں نقصان نہ پہنچا سکے گی)۔

بلکہ یہ صبر تو ایسی چیز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اِس کا اہتمام کرنے والوں کو "منصب اِمامت" تک سے نواز دیا: (السجدۃ:۲۴) ﴿وجعلناھم أئمة یھدون بأمرنا لما صبروا وکانوا بآیاتنا یوقنون﴾ (اور ہم نے اُن میں سے کچھ لوگوں کو، جب اُنھوں نے صبر کیا، ایسا پیشوا اور امام بنا دیا جو ہمارے حکم سے لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے، اور وہ ہماری آیتوں پر یقین رکھتے تھے)۔

سیادتِ عالم کی اِسلامی بنیادیں:

غرض قرآنِ کریم میں اہلِ اِسلام کے ہر طرح کے غلبے کی اَساس و بنیاد: اِیمان ویقین، صبر وتقوی، اِطاعتِ خداوندی، اِتباعِ رسول، ذکر ونماز اور اتحادِ باہمی جیسے روحانی اَعمال کو، اور فرقۂ محمدی کی "سیادت"، "قیادت" اور "اِمامت" کا میدان اِنھی خِصالِ حمیدہ اور اَعمالِ صالحہ کو قرار دیا گیا ہے۔

دراَصل اِسلام میں حیاتِ دنیویہ کے بقاء واِستحکام کا کوئی تصور ہی نہیں ہے، یہاں پر تو اللہ ورسول پر مرمٹنے کو اور "شہادت" کی موت کو حیاتِ جاودانی کہا گیا ہے: (آل عمران:۱۶۹) ﴿بل أحیاء عند ربھم یرزقون﴾ (بلکہ یہ لوگ تو زندہ ہیں اور اپنے رب کے پاس نوازے جارہے ہیں)۔

قرآنِ کریم میں اِس روحانی نیلامی کی کھلی بولی لگادی گئی ہے: (التوبۃ:۱۱۱) ﴿إن اللہ اشتری من المؤمنین أنفسھم وأموالھم بأن لھم الجنة﴾ (اللہ تعالیٰ نے اِیمان والوں سے اُن کی جان اور مال جنت کے بدلے خرید لی ہے)۔

اور اِن اِیمان والوں کی علامت یہ بیان فرمائی ہے: (التوبۃ:۱۱۲) ﴿...... التائبون العابدون الحامدون السائحون الراکعون الساجدون الآمرون بالمعروف والناھون عن المنکر والحافظون لحدود اللہ﴾ (......وہ اللہ کے راستے میں مارنے اور مرنے کے ساتھ ساتھ، اُس کی بارگاہ میں توبہ کرنے والے، بندگی

کرنے والے، شکر کرنے والے، اُس کی راہ میں نکلنے والے (یا روزے رکھنے والے)، رکوع کرنے والے، سجدے کرنے والے، نیک باتوں کا حکم دینے والے، بری باتوں سے روکنے والے اور اللہ کی قائم کردہ حدود کی رعایت رکھنے والے لوگ ہیں)۔

اور اگر شاذ کے مذکورہ اقتباس میں علمی وفکری غلبہ مراد ہے تو علم وفکر کا موضوع کیا ہے؛ دین یا دنیا؟ اگر دین ہے، تو الحمدللہ آج بھی دنیا کے لیے منارۂ نور اور قبلہ نما مسلمانوں ہی کا وہ ''طائفۂ منصورہ'' ہے، جس کے قیامت تک وجود اور بقاء کی بشارت احادیثِ صحیحہ میں متواتر طور پر دی گئی ہے۔

''فرقۂ محمدی'' کی اِس گئی گذری حالت میں بھی الحمدللہ اُن کی ٹوٹی پھوٹی نماز روزے کو دیکھ کر، اُن کے طریقۂ تجہیز وتکفین اور تدفین کو دیکھ کر، اُن کے شرعی پردے کے نظام سے متأثر ہوکر، اُن کی سادہ اِسلامی معاشرت اور سچے اَخلاق کو دیکھ کر، اِسلام قبول کرنے والوں کی عالمی سالانہ تعداد سینکڑوں میں نہیں، ہزاروں میں ہے، جیسا کہ موجودہ حالات سے باخبر لوگوں پر مخفی نہیں، اور دلچسپ بات یہ کہ بعض مرتبہ قبولِ اِسلام کا سبب ایسی اِسلامی تعلیمات بن جاتی ہیں جن کا صریح ذکر قرآن کریم میں نہیں ملتا، بلکہ احادیثِ نبویہ میں ہوتا ہے۔

اور اگر شاذ کے نزدیک علم وفکر کا موضوع: دنیا، مادیت اور دجالی ترقیات ہیں، تو ہمیں ایسی سیادت کے نہ ملنے کا غم تو کیا ہوتا، ہم تو ایسی سیادت اور امامت سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں: (طہ:۱۳۱) ﴿ولا تمدن عینیک إلی ما متعنا به أزواجاً منهم زهرة الحیاة الدنیا، لنفتنهم فیه﴾ (اور آپ دنیوی زندگی کی اُس بہار کی طرف آنکھیں اُٹھا کر بھی نہ دیکھیں جو ہم نے اِن (کافروں) میں سے مختلف لوگوں کو بطور آزمائش کے مزے اُڑانے کے لیے دے رکھی ہے)۔

حاصل یہ کہ اگر کتاب وسنت کی روشنی میں زوالِ امت کا ''اِدراک'' کرنا ہے،

اگر اللہ ورسول کے زیرِ ہدایت ملتِ اسلامیہ کے ''مستقبل کی بازیافت'' کرنی ہے، اگر تعلیماتِ اِسلام کی بنیادوں پر ''مسلمانوں کے عروج'' کی فکر، اور مسلم معاشرہ کی ''تشکیلِ جدید'' کرنی ہے؛ تو اُس کے لیے اِیمان، عملِ صالح، تقویٰ شعاری اور صبر واِستقامت کی تعلیم وتربیت اور تلقین وہدایت ہی کا راستہ متعین ہے۔

اِس کے علاوہ کسی اور راستہ کی رہنمائی، یا کسی اور طریقہ کی تلاش: ہدایت کے بجائے ضلالت ہے، اِصلاح کے بجائے اِفساد ہے: (البقرة:۱۲) ﴿وإذا قيل لهم لا تفسدوا في الأرض قالوا إنما نحن مصلحون، ألا إنهم هم المفسدون ولكن لا يشعرون﴾ (اور جب اُن سے کہا جاتا ہے زمین میں فساد مت پھیلاؤ، تو کہتے ہیں کہ ہم تو اِصلاح کے لیے اُٹھیں ہیں، لوگو! خبردار ہو جاؤ، یہی لوگ اَصل فسادی ہیں، لیکن شعور نہیں رکھتے)۔

(۲) دوسری بات یہ کہ مذکورہ بالا اقتباس میں مسلمانوں کو بطور طنز وتعریض ''فرقۂ محمدی'' کہا گیا ہے:

''......بہت جلد یہ آفاقی امت، جسے سیادتِ عالم کے منصب پر فائز کیا گیا ہے، ''فرقۂ محمدی'' کی نفسیات میں محصور ہو گئی، مسائلِ عالم سے اپنا رخ موڑ کر اور عام انسانیت کی فلاح سے دست بردار ہو کر ہماری تمام تر توجہ ایک مخصوص ثقافتی شناخت والی امت مسلمہ پر مرکوز ہوتی گئی''

ایک اور جگہ اِس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہا جا رہا ہے:

''امت مسلمہ کے زوال کا مطالعہ کسی قوم کے زوال کے بجائے ایک تصورِ حیات کے زوال کی حیثیت سے کیا جانا چاہیے، جبھی یہ ممکن ہے کہ ہم زوال کے جملہ اَبعاد کو مستحضر کر سکیں، ''اِسلامی تہذیب'' ایک گمراہ کن اِصطلاح، ایک خیالِ عبث ہے، اِسلام کو کسی مخصوص تہذیبی قالب میں برتا جانا ممکن نہیں، ایک آفاقی پیغام کو کسی نسلی، لسانی یا مقامی ثقافت کا اسیر نہیں بنایا جا سکتا......''۔ (ادراکِ زوالِ امت، ص۱۱-۱۲)۔

یہ مغرب کی چکا چوند اور جدید تمدنی ترقیات سے مرعوب ذہنوں کی نفسیاتی کمزوری، اور شدید درجہ کا احساسِ کمتری ہے، یہ لوگ اپنے گرد وپیش کے ماحول کے دباؤ کی بناء پر ''مسلم قوم'' سے بھی وابستہ رہنا چاہتے ہیں، اور اپنی اِلحادی تعلیم گاہوں کے زیر اثر، موجودہ عالمی رجحانات کے بھی ہم آغوش رہتے ہیں، اِسی لیے ایسے لوگوں کو اِسلام کی وہ تعلیمات واِصطلاحات بہت گراں محسوس ہوتی ہیں جو ''ترقی یافتہ قوموں'' کے مزاج ومعیار سے ہم آہنگ نہیں ہو پاتیں، لہٰذا یہ لوگ اُن کے سامنے اپنی خفت کم کرنے کے لیے ''اِسلامی تعلیمات واِصطلاحات'' ہی کی اِصلاح وترمیم کا بیڑا اُٹھالیتے ہیں۔

گذشتہ اقتباس سے متعلق چند باتیں:

ا: اِسلامی تہذیب وثقافت اور اسلامی اِصطلاحات:

الف: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا ''اِسلام'' کہلاتا ہے، اور آپ پر اِیمان لانے والوں کا نام سیدنا حضرتِ اِبراہیم علی نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام نے ''امتِ مسلمہ'' اور ''مسلم'' رکھا ہے: (البقرۃ:۱۲۸) ﴿**ومن ذریتنا أمۃً مسلمۃً لک**﴾، اور (الأنبیاء:۷۸) ﴿**ملۃ أبیکم إبراھیم ھو سماکم المسلمین من قبل**﴾ (اپنے باپ ابراہیم کے دِین کو مضبوطی سے تھام لو، اُنھوں نے پہلے ہی سے تمہارا نام ''مسلم'' رکھ دیا تھا)۔

خود سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کا لقب بھی ''مسلم'' ہی تھا: (آل عمران: ۶۷) ﴿**ما کان إبراھیم یھودیاً ولا نصرانیاً ولکن کان حنیفاً مسلماً، وما کان من المشرکین**﴾ (ابراہیم نہ تو یہودی تھے، نہ نصرانی، بلکہ راہِ راست والے مسلمان تھے، اور مشرکوں میں سے بھی نہیں تھے)۔

ب: محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قیامت تک آنے والے تمام جن واِنس کی طرف مبعوث پیغمبر اور رسول ہیں، اور آپ کی بعثت کے بعد سے آپ پر اِیمان لائے بغیر

کسی شخص کا نہ کوئی عقیدہ معتبر ہے، نہ کوئی عمل۔

ج: آپ صلی اللہ علیہ وسلم جن لوگوں کی طرف مبعوث ہوئے، وہ آپ کی ''امت'' (بمعنی قوم) کہلاتے ہیں، اور یہ امت عملی طور پر تین قسموں میں منقسم ہے: امتِ دعوت، امتِ اِجابت اور امتِ اِتّباع۔

۱: ''امتِ دعوت'' میں (جن و اِنس، مسلم و کافر، صالح و فاسق) وہ تمام لوگ شامل ہیں جن کی طرف آپ کی بعثت ہوئی۔

۲: ''امت اِجابت'' وہ لوگ کہلاتے ہیں جو آپ کی نبوت اور رسالت پر اِیمان لائے، اور کفریہ عقائد و اعمال سے اجتناب کیا۔

۳: ''امت اِتباع'' وہ متقین، محسنین اور صالحین ہیں جو اِعتقاداً اور عملاً ہر طرح سے آپ کی ذاتِ مبارکہ کو اُسوہ اور نمونہ مانتے ہیں، اور ہر دور اور ہر زمانے میں بقدرِ استطاعت آپ کی سنتوں کا اِہتمام کرتے ہیں۔

اہلِ علم کے عرف میں ''امت'' کے عمومی مفہوم سے، اِیمان لانے والوں کو ممتاز کرنے کے لیے، آخری دونوں قسموں پر بعض مرتبہ ''امتِ محمدیہ'' کا بھی اِطلاق کردیا جاتا ہے۔

د: اور یہ کہنا کہ:

''اِسلامی تہذیب'' ایک گمراہ کن اِصطلاح، ایک خیالِ عبث ہے، اِسلام کو کسی مخصوص تہذیبی قالب میں برتا جانا ممکن نہیں، ایک آفاقی پیغام کو کسی نسلی، لسانی یا مقامی ثقافت کا اسیر نہیں بنایا جاسکتا......''

''......بہت جلد یہ آفاقی امت، جسے سیادتِ عالم کے منصب پر فائز کیا گیا ہے، ''فرقۂ محمدی'' کی نفسیات میں محصور ہوگئی، مسائلِ عالم سے اپنا رخ موڑ کر اور عام انسانیت کی فلاح سے دست بردار ہوکر ہماری تمام تر توجہ ایک مخصوص ثقافتی شناخت والی امت مسلمہ پر مرکوز ہوتی گئی''

بغض وعناد کی آگ میں جلے بھنے یہ جملے، جس قلبی اِحتراق واِلتہاب کے غماز ہیں، قارئین کے لیے اُس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں، اِن معاندین کو معلوم ہونا چاہیے کہ اِسلام کی آفاقیت موجودہ سیکولرازم جیسی نہیں ہے، جس میں گندے نالے کی طرح سارے شہر کی گندگی جمع ہوتی رہتی ہے، اور وہ کسی نہ کسی صورت میں بہتا ہی رہتا ہے، بلکہ اِسلام کی مثال اُس سبک رَو چشمۂ صافی کی ہے کہ جس راستہ پر اُس کو گذرنے کا موقع دیا جائے، اُس کی گندگیوں کو دھوڈالتا ہے، اور جس طرف بند باندھ دیا جائے، اُدھر سے اپنا رُخ موڑلیتا ہے: (الکہف:۲۹) ﴿فمن شاء فليؤمن ومن شاء فليكفر﴾ (جو چاہے سو اِیمان لائے، اور جو چاہے کفر اِختیار کرے)، اور (البقرۃ:۲۵۶) ﴿لا إكراه في الدين﴾ (دین میں کوئی زبردستی نہیں ہے)۔

جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد سے ''اِسلام'' کا تصور آپ ہی کی ذات سے وابستہ ہو چکا ہے، اور پورے عالم کے خیر کا کل سامان آپ ہی کے اسوہ میں منحصر ہو چکا ہے، تو ظاہر ہے کہ ''اہلِ اِسلام'' کا مصداق صرف آپ ہی کے ماننے والے ہو سکتے ہیں، اَب خواہ کوئی دِل جلا اُن کو ''فرقۂ محمدی'' کہے، خواہ کوئی حاسد ''محمڈن''، لیکن اُن کا آسمانی اور شرعی نام بہر حال ''مسلم'' ہے۔

اور جو مبارک عادات واَخلاق اہلِ دنیا کو اِسلام ہی کے واسطے سے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ذریعے سے ملے ہیں، اُن کو ''اِسلامی تہذیب'' اور ''اِسلامی ثقافت'' کے علاوہ اور کیا کہیں گے؟ معتبر مصانع اور معیاری کارخانوں کی مہر، اور ''میڈ اِن'' کی وضاحت، مصنوعات واِیجادات کو استناد واعتماد بخشتی ہے، تو ''اخلاق'' و ''اعمال'' کے حسن وقبح کو پرکھنے کے لیے اگر ''اِسلام'' کی کسوٹی کو اِستعمال کیا جائے، اور اُس کے معیار پر پورے اترنے والے اعمال واخلاق پر ''اِسلامی تہذیب وثقافت'' کی مہر لگادی جائے، تو اِس میں حرج کیا ہے؟ اِس سے تو اُن کی قدر وقیمت اور وزن واعتبار میں اضافہ ہی ہوگا۔

ھ: اور یہ بات کہ:

''امت مسلمہ کے زوال کا مطالعہ کسی قوم کے زوال کے بجائے ایک تصورِ حیات کے زوال کی حیثیت سے کیا جانا چاہیے''

اِنتہائی درجہ کی مرعوبیت اور فکری التباس کی آئینہ دار ہے، ''اِسلام'' تو دینِ فطرت ہے، فطرت نہ کبھی تبدیل ہوتی ہے، نہ زوال پذیر، اور نہ شکست خوردہ: (الروم: ۳۰) ﴿فطرت اللّٰہ التي فطر الناس علیھا، لا تبدیل لخلق اللّٰہ، ذلک الدین القیم﴾ (اللہ کی بنائی ہوئی اُس فطرت پر قائم رہو جس پر اُس نے تمام لوگوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کی تخلیق تبدیل نہیں ہوا کرتی، یہی ہے سیدھا دین)، ہاں جو لوگ فطرت سے بغاوت پر آمادہ ہوتے ہیں اُن کو ضرور ذِلت اور توہین کا سامنا کرنا پڑتا ہے: (الحج: ۱۸) ﴿ومن یھن اللّٰہ فما لہ من مکرم﴾ (اور جسے اللہ ذلیل کر دے، کوئی نہیں ہے جو اُسے عزت دے سکے)۔

''اِسلام'' کے تصورِ حیات کی بنیاد: اِنسان کے مقصدِ تخلیق (عبادت و بندگی) اور منزلِ سفر (آخرت اور لقائے رب) سے وابستہ ہے، جب تک امت مسلمہ بحیثیت مجموعی اپنے اِس مقصد کے بارے میں سنجیدہ اور اپنی اِس منزل کے بارے میں حساس رہی، وہ رُو بہ ترقی اور منصبِ سیادت پر فائز رہی، اور جب اِس میں تغافل و تکاسل شروع ہوا تو نتیجتاً رُو بہ زوال ہونا شروع ہوگئی: (طہٰ: ۱۲۴) ﴿ومن أعرض عن ذکري فإن لہ معیشۃ ضنکاً﴾ (اور جو میرے ذکر سے رُوگردانی کرے گا تو اُس کی زندگی بڑی تنگ ہو جائے گی)۔

دراَصل جو لوگ خود کو اِسلام کی طرف منسوب کرنے کے باوجود (اپنے عقائد واعمال میں) اِسلامی طرزِ زندگی کو اِختیار نہیں کرتے، وہ اپنی فطری اور روحانی اصل سے منقطع اور اپنے نقطۂ ارتکاز سے منحرف ہو جاتے ہیں، اور دوسری طرف (نعوذ باللہ) کھلم کھلا کفر کر کے مادیت کے اُس مقام تک بھی نہیں پہنچتے جہاں فطرت کی باغی وہ جماعتیں

پہنچ جاتی ہیں جن کے بارے میں قرآن کہتا ہے:
﴿فلما نسوا ما ذكروا به فتحنا عليهم أبواب كل شيء حتى إذا فرحوا بما أوتوا أخذناهم بغتةً فإذا هم مبلسون﴾ (الأنعام:۴۴) (پھر اُنھیں جو نصیحت کی گئی تھی، جب وہ اُسے بھلا بیٹھے، تو ہم نے اُن پر ہر طرح کی نعمتوں کے دروازے کھول دیئے، یہاں تک کہ جو نعمتیں اُنھیں دی گئی تھیں، جب وہ اُن پر اِترانے لگے تو ہم نے اچانک اُن کو آ پکڑا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بالکل مایوس ہو کر رہ گئے)۔

تو اپنے اِس دوہرے رویے اور دوغلے پن کی وجہ سے دینِ فطرت سے وابستہ طائفے مغلوب اور مقہور ہو ہو جاتے ہیں، پس یہ ''تصورِ حیات'' کا زوال نہیں ہے، بلکہ اعلیٰ ترین ''تصورِ حیات'' کی طرف خود کو غلط طور پر یا برائے نام منسوب کرنے والوں کا زوال اور انحطاط ہے، اور چونکہ اِس دور میں کثرت ایسے ہی ''نامی مسلمانوں'' کی ہے، اِس لیے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ (نعوذ باللہ) پورا اِسلامی تصورِ حیات ہی زوال پذیر ہے۔

۲: دارالاسلام اور دارالکفر کی اِسلامی اِصطلاح:

و: اور یہ اِلزام کہ:

> ''حتی کہ ہمارے فقہاء نے دنیا کو اِسلامی اور غیر اِسلامی سرزمین میں بانٹ ڈالا اور ایسا محسوس ہوا کہ مسلم آبادی کے علاقوں کے علاوہ دنیا کے دوسرے خطوں کا ہم سے کوئی تعلق نہیں''

انتہائی جہالت/تجاہل اور حسد وعناد پر مبنی ہے، اِس میں یہ بالکل غلط تأثر دینے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ ''مسلم'' و ''کافر'' کا فرق، یا ''دارالاسلام'' و ''دارالکفر'' کی تقسیم علمائے اِسلام کی خانہ ساز ہے، اِس تفریق وتقسیم کی سب سے بڑی بنیاد تو ''ہجرت'' کا مسئلہ ہے، جو خود قرآنِ کریم میں بھی بہت اہمیت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے: (الأنفال: ۷۲) ﴿والذين آمنوا ولم يهاجروا ما لكم من ولايتهم من شيء حتى

یھاجروا﴾ (جو لوگ ایمان لا چکے مگر اُنھوں نے ہجرت نہیں کی تو ایسے لوگوں سے تمہارا کوئی تعلق نہیں، جب تک وہ ہجرت نہ کرلیں)۔ غور کرنا چاہیے کہ جب تک ''اِسلامی اور غیر اِسلامی سرزمین'' کا فرق نہیں ہوگا تو ہجرت کہاں سے، کس جگہ کی جائے گی؟

۳: سیاسی دنیا کی تقسیم:

قرآنی نصوص، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ اور آپ کے صحابہؓ کی زندگی سے مجموعی طور پر تین طرح کے ماحول اور تین قسم کی زمینوں کا تصور ملتا ہے:

۱: دارالاسلام، جہاں ہر طرح کا غلبہ مسلمانوں ہی کو حاصل ہو، جیسے مدینہ منورہ۔

۲: دارالامن، جہاں حکومت تو اہل کفر کی ہو، مگر آپسی معاہدے اور باہمی اعتماد کا ماحول ہو، جیسے حبشہ۔

۳: دارالکفر، جہاں غلبہ و تسلط سب کافروں کا ہو، اور اہل اِسلام مقہور و مجبور ہوں۔

اِسلام میں جن احکام کا تعلق انفرادی مسائل اور اِختیاری امور سے ہے، وہ تو ہر جگہ اور ہر زمانے میں یکساں رہتے ہیں، اور جن مسائل کا تعلق اجتماعی نظام، غیر اِختیاری حالات اور اِضطراری معاملات سے ہے وہ ماحول کی تبدیلی سے بدل سکتے ہیں، ''دارالاسلام'' میں رہنے کا طریقہ الگ ہے، وہاں کے غیر مسلمین کے حقوق علیحدہ ہیں، ''دارالامن'' میں باہمی معاہدہ کے تحت رہنے کے مسائل الگ ہیں، وہاں کے غیر مسلمین کے اَحکام مختلف ہیں، اور ''دار الحرب'' کے اَحکام اور وہاں کے غیر مسلمین کے مسائل مستقل ہیں۔

۴: مسائلِ عالم:

اور یہ شکوہ کہ:

''مسائلِ عالم سے اپنا رخ موڑ کر اور عام اِنسانیت کی فلاح سے دست بردار

ہو کر ہماری تمام تر توجہ ایک مخصوص ثقافتی شناخت والی امت مسلمہ پر مرکوز ہوتی گئی"

التباسِ فکری سے ناشی اور مسئلے کی تفصیل نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے، معلوم نہیں کہ "مسائلِ عالَم" کا شرعی مصداق بھی معترض کے ذہن میں ہے یا نہیں، ظاہر ہے کہ "مسائلِ عالَم" وہی قابل اعتناء ہو سکتے ہیں جو اِنسان کے مقصد تخلیق سے ہم آہنگ ہوں: (الذاریات:۵۶) ﴿وما خلقت الجن والإنس إلا ليعبدون﴾ (ہم نے جن واِنس کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے)، اور (المؤمنون: ۱۱۵) ﴿أفحسبتم أنما خلقناكم عبثاً، وأنكم إلينا لا ترجعون﴾ (کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے تمھیں یوں ہی بے فائدہ پیدا کیا ہے، اور تمھیں ہمارے پاس لوٹ کر نہیں آنا ہے؟)، اور (النحل:۳۶) ﴿ولقد بعثنا في كل أمة رسولاً أن اعبدوا الله واجتنبوا الطاغوت﴾ (اور ہم نے ہر قوم میں کوئی نہ کوئی پیغمبر اِس پیغام کے ساتھ ضرور بھیجا کہ لوگو! اللہ کی عبادت کرو، اور طاغوت سے بچو)۔

لہٰذا دنیا کی کسی بھی آبادی سے مسلمانوں کا تعلق: لوگوں کو ایک اللہ کی طرف بلانے، نیکی پھیلانے، برائی روکنے، نماز قائم کرنے، زکوۃ دینے وغیرہ دینی امور سے ہے، جیسا کہ قرآنِ کریم میں بھی یہی مضامین مختلف مواقع پر بیان کیے گئے ہیں:

(آل عمران:۱۱۰): ﴿كنتم خير أمة أخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنهون عن المنكر وتؤمنون بالله﴾ (تم ایسی بہترین امت ہو، جو دوسروں کے نفع کے لیے پیدا کی گئی ہے، تم نیکی کا حکم دیتے ہو، برائی سے روکتے ہو، اور خود اللہ پر ایمان رکھتے ہو)۔

(آل عمران:۱۰۴) ﴿ولتكن منكم أمة يدعون إلى الخير ويأمرون بالمعروف وينهون عن المنكر﴾ (اور تمہارے درمیان ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو لوگوں کو خیر کی طرف بلائے، نیکی کی تلقین کرے، اور برائی سے روکے)۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ میں بھی بس اِنہی امور کا تذکرہ ملتا ہے، لہٰذا

اِس پہلو سے اہلِ اِسلام کو اپنا جائزہ لینے کی یقیناً ضرورت ہے کہ اِس میں کتنی کوتاہی ہو رہی ہے۔

پھر اگر حکومت وقوت بھی حاصل ہو تو: عدل و اِنصاف قائم کرنا، ظلم ومعصیت روکنا، حدود اللہ کو نافذ کرنا اور رعیت کی جائز ضروریات اور قدرے سہولیات کا خیال رکھنا بھی اِسلامی حکومتوں کے فرضِ منصبی میں شامل ہو جاتا ہے، اور یہی وہ چیزیں ہیں جو خلافتِ راشدہ کا مبنیٰ اور حکومتِ عادلہ کا مطمحِ نظر ہوتی ہیں، مگر جب سے مسلم حکومتوں سے اِن اعمال میں غفلت شروع ہوئی جبھی سے مسلمانوں کو سیاسی اور اقتصادی زوال کا سامنا ہے، اور ہمارے لیے ''زیاں'' سے زیادہ موجبِ حسرت: ''اِحساسِ زیاں'' کا مفقود ہو جانا، اور ''زوال'' سے زیادہ باعثِ افسوس: ''اَسبابِ زوال'' کا ملتبس ہو جانا ہے، فإلى الله المشتكى، وهو المستعان۔

اور جو مسائل: فطرت سے بغاوت کا نتیجہ ہوں، اور عقل وشرع کو چھوڑ کر جذبات وخواہشات کی پیروی کا فطری انجام ہوں، اُن کا صحیح علاج اُن اَسباب کا دور کرنا ہے جن کی بدولت نوبت یہاں تک پہنچی ہے، اور اُن چیزوں سے پرہیز کرنا ہے جو ازدیادِ مرض کا سبب ہیں، نہ کہ خود بھی اُنہی امراض وحالات کا شکار ہو جانا۔

اور جہاں تک بات ''عام اِنسانیت کی فلاح سے دست برداری'' کی ہے تو ''فلاح'' کے شرعی مفہوم اور ''اِنسانیت'' کے اِسلامی تصور کی تشریح بھی ضروری ہے:

۵: فلاح کا شرعی مفہوم:

''فلاح'' کا شرعی مفہوم متعین کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ لفظ ''فلاح'' کے قرآنی مواقعِ استعمال کا اِستقصاء کر کے سب کا تجزیہ کر لیا جائے، راقم کی تلاش کے مطابق قرآن کریم نے ''فلاح'' کو اِن اعمال پر متفرع کیا ہے: اِیمان بالغیب، ایمان بالآخرہ، اتباعِ قرآن، سمع وطاعت، کافروں سے براءت، اہتمامِ نماز، ادائیگیِ زکوٰۃ، اعمالِ صالحہ

اور اعمالِ خیر، تزکیۂ نفس، سخاوتِ قلب، توبہ و اِنابت، تقوی، تعلق مع اللہ، کثرتِ ذکر، ثبات قدمی، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، مجاہدہ فی سبیل اللہ، اِسلامی سرحدوں کی حفاظت (جغرافیائی ہوں، یا نظریاتی)۔

ہماری تلاش میں تقریباً یہ وہ تمام اعمال ہیں جن پر قرآنِ کریم نے ''فلاح'' (اور کامیابی) کا مژدہ سنایا ہے، لہٰذا اِن کے خلاف جو کام ہوں گے وہ عدم فلاح اور ناکامی کے ہوں گے، اور ویسے بعض اعمال کے بارے میں صراحت بھی وارد ہوگئی ہے کہ یہ فلاح سے دور اور کامیابی کے راستے سے منحرف ہیں: کفر، شرک، اعمالِ شرک، ارتداد، شراب خواری، سود خوری، قمار و جوا، اللہ اور اُس کی آیات میں جھوٹ وافتراء، ظلم، سحر وجادو۔

فلاح و کامیابی کے مذکورہ اعمال میں غور کر لینا چاہیے کہ اِس وقت دنیا میں کون سی قوم، یا کون سی جماعت (جیسی تیسی حالت میں بھی) ان کو اَنجام دے رہی ہے، اور ناکامی اور عدم فلاح کے راستوں سے خود کو بچانے کی حتی الامکان کوشش کر رہی ہے، اور کون سے وہ طبقات اور افراد ہیں جو خیر وشر کے اِن اِسلامی فرق و امتیاز ہی کو میٹ دینے اور ختم کر دینے کی سعیِ مذموم میں مصروف ہیں: (الصف:۸) ﴿یریدون لیطفئوا نور اللّٰہ بأفواھھم، واللّٰہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون ﴾ (یہ لوگ اللہ کے نور کو اپنی پھونکوں سے بجھانا چاہتے ہیں، حالاں کہ اللہ اپنے نور کو پورا کر کے رہے گا، چاہے کافروں کو جتنا بھی برا لگے)۔

۳-: یہودیوں سے خاص مناسبت:

گذشتہ سطور کا مطالعہ کرنے والے اِنصاف پسند قارئین کرام کو راشد شازؔ کی علمی سطح، اور فکری رخ کا بخوبی اندازہ ہوگیا ہوگا، اور یہ بات بھی بخوبی سمجھ میں آگئی ہوگی کہ تحریف وتبدیل، دجل وتلبیس اور فتنہ وتشکیک کے سارے یہودی جراثیم اور بنی اسرائیل

کی بددینی کی تمام خصلتیں ان کی فطرت کا حصہ ہیں۔

اِن کی تحریرات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ صاحب موجودہ مادی ترقیات سے عموماً، اور یہودیوں سے خصوصاً بہت متاثر اور مرعوب (یا اُن کے مبعوث؟) ہیں:

ا: اِنھوں نے اپنے "برج کورس" میں "مذاکرۂ سبت" (سنیچر کے دن کی مجلس) کا ایک مضمون رکھا ہے، اور یہ معلوم ہے کہ سنیچر کا دِن یہودِ بے بہبود کے ہاں بہت تقدس کا حامل ہے، قرآن کریم نے یہود کا تذکرہ کرتے ہوئے مختلف مواقع پر اِس دِن سے اُن کے تعلق کا ذکر کیا ہے:

(البقرة:٦٥) ﴿ولقد علمتم الذين اعتدوا منكم في السبت فقلنا لهم كونوا قردةً خاسئين﴾ (اور تم خوب اچھی طرح جانتے ہو اپنے اُن لوگوں کو جنھوں نے "سبت" کے سلسلے میں حد سے تجاوز کیا تھا، تو ہم نے اُن سے کہہ دیا تھا: تم ہوجاؤ ذلیل بندر)۔

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے: (النساء:٤٧) ﴿......أو نلعنهم كما لعنا أصحاب السبت﴾ (یا ہم اُن پر لعنت برسادیں گے جیسے کہ ہم "سبت" والوں پر لعنت اتار کر چکے ہیں)۔

۲: نبی آخر الزماں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ منورہ پہنچنے پر، جس فرقے نے آپ کی سب سے سخت مخالفت اور مزاحمت کی، وہ قرآن وحدیث اور تاریخ وسیر کے اتفاقی بیان کے مطابق اسرائیل النسل یہود تھے، اِس لیے قرآن مجید میں جابجا ان کی اِس حرکت اور شیطانی فطرت کا تذکرہ کرتے ہوئے اہلِ اسلام کو ان سے دور رہنے کا حکم دیا گیا ہے: (المائدة:٥١) ﴿يا أيها الذين آمنوا لا تتخذوا اليهود والنصارى أولياء، بعضهم أولياء بعض﴾ (اے ایمان والو! یہود ونصاریٰ کو دوست مت بناؤ، یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں)۔

ایک دوسری جگہ یہود کی مسلم دشمنی کو بطور خاص بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ﴿لتجدن أشد الناس عداوةً للذین آمنوا؛ الیهود والذین اشرکوا......﴾ (یقیناً آپ ایمان والوں سے سب سخت دشمنی رکھنے والا یہودیوں اور مشرکوں کو پائیں گے)۔ (المائدۃ:۸۲)

مگر ان سب کے باوجود شاذ کو اہلِ اسلام اور یہودیوں کے درمیان موجود اِس فطری فاصلے کو ختم کرنے کی بہت فکر ہے، یہ اپنی مختلف تحریروں میں اس کی پرزور وکالت کرتے اور جذباتی دعوت دیتے نظر آتے ہیں، مسئلہ فلسطین سے متعلق ''حق کے دو بول'' کے عنوان سے اس موضوع پر انھوں نے مستقل مضمون بھی لکھا ہے، اُس میں لکھتے ہیں: .

''......لیکن مشکل یہ ہے کہ اہل یہود سے متعلق ہمارا فہم، قرآن مجید کے بجائے، سید قطب کے معروف زمانہ کتابچہ **معرکتنا مع الیهود** کا پروردہ ہے، جس میں بلا استثناء تمام ہی یہود شیطانی گروہ کے پراسرار کردار کی حیثیت سے دکھائے گئے ہیں، ہم مدت سے اُن تفسیروں کے اسیر ہیں جن میں ﴿غیر المغضوب علیهم ولا الضالین﴾ سے بالتخصیص یہود ونصاریٰ مراد لیے جاتے ہیں، ہم شدتِ جذبات میں یہ نہیں سوچتے کہ قرآن مجید جو منصفِ اعلیٰ کا کلام ہے؛ عہد رسول کے بعض یہودی قبائل یا افراد کی بدبختی کے لیے اُن کی تمام آئندہ نسلوں پر لعنت کا فیصلہ کرسکتا ہے، قرآن میں اہل قریش کے بعض کردار کی بھی شدید مذمت کی گئی ہے، کفارِ قریش کی دنیوی واخروی خسارے کا مژدہ (؟) سنائے جانے کے باوجود ہمارے گمان میں بھی یہ بات نہیں آتی کہ تا قیامت کفار قریش کی اولادیں مغضوب الغضب ہیں، پھر کوئی وجہ نہیں کہ کسی خاص نسل کی شرارت کے لیے آنے والی تمام نسلوں کو باعث لعنت قرار دیا جائے''۔ (مستقبل کی بازیافت ص ۱۱۱)۔

اس اقتباس میں چند باتیں نوٹس لینے کی ہیں:

الف: یہود سے متعلق مسلمانوں کے خیالات وتصورات کو ماضی قریب کے مشہور اِخوانی لیڈر سید قطب شہید (ت:۱۳۸۶ھ موافق ۱۹۶۶ء) کے افکار ونظریات کا

نتیجہ بتایا گیا ہے، حالاں کہ بنوقُریظہ، بنونُضیر، اور بنوقَینُقاع (جیسے یہودی قبائل) کے غدر، بدعہدی اور حکومتِ اسلامیہ کے خلاف مسلسل ریشہ دوانیوں کی بناء پر، اولاً بزمانۂ رسالت مدینۂ نبویہ سے ذلت آمیز اِخراج، پھر خیبر اور جزیرۃ العرب سے خلافت فاروقی میں جلاوطنی، اور اُس کے بعد ہر دور میں ان کی اوچھی حرکتوں کے نتیجے میں غیور مسلم حکم رانوں کی طرف سے ان کی سرکوبی؛ یہ سب ایسے تاریخی حقائق ہیں، جن کا اِنکار ایک کھلا ہوا کافر بھی نہیں کرسکتا۔

ب: قرآنِ کریم میں جن افراد یا قوموں پر اُن کے اِیمان نہ لانے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سرکشی اختیار کرنے کی بناء پر اِظہارِ غضب اور تذکرۂ لعنت کیا گیا ہے، اُس کی غایت قبولِ اِسلام کو قرار دیا گیا ہے:

﴿فإن آمنوا بمثل ما آمنتم به فقد اهتدوا، وإن تولوا فإنما هم في شقاق، فسيكفيكهم الله﴾ (البقرة: ۱۳۷) (اس کے بعد اگر یہ (اہلِ کتاب) بھی تمہارے ہی جیسا ایمان لے آئیں (جس میں توحید، رسالت، قرآن اور آخرت بطورِ خاص ہیں) تب تو یہ راہ یاب ہوں گے، اور اگر یہ روگردانی کرتے ہیں تو یہ شقاق میں پڑ گئے ہیں، پھر تو آپ کی طرف سے اللہ ہی ان سے نمٹے گا)۔

اِس آیت سے معلوم ہوا کہ جو قبائل یا افراد اپنی بدبختی سے اِسلام نہ لاکر مغضوب الغضب ٹھہرے تھے، ان کے اِس غضب اور لعنت سے نکلنے کا واحد طریقہ: صحابہؓ کے طریقے پر اِسلام قبول کرلینا ہے، جب تک وہ (یا اُن کی نسلیں) اِسلام قبول نہیں کرتے، ہمیشہ ملعون اور مغضوب ہی رہیں گے؛ وإن رغم أنف فلان بن فلان۔

ج: گذشتہ اقتباس میں زمانۂ نبوت کے یہود کی شرارتوں کا موازنہ خاندانِ قریش کی مخالفتوں سے کیا گیا ہے، حالاں کہ دونوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ قریش (بشمول دیگر مشرکینِ عرب) انجام کار مشرف باسلام ہوگئے تھے، جب کہ یہودی قبائل

اپنی فطری ضد اور ہٹ دھرمی پر آخر تک قائم رہے تھے، اور اُن میں کے معدودے چند افراد کے علاوہ کوئی بھی اسلام نہیں لایا تھا۔

پھر یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ شاذ اُس فرقے سے تعلق رکھتے ہیں جو قرآنِ کریم کے زمان ومکان کی حدود وقیود سے آزاد، اور شانِ نزول اور پس منظر کے بیان سے بے نیاز ہونے کا مدعی ہے، تو ایسے لوگوں کو تو قرآن مجید کے عمومی بیانات کو ''تاریخ وآثار'' کی روشنی میں کسی مخصوص عہد وزمان اور موقع ومکان کے ساتھ خاص کرنے کا کوئی حق ہی نہیں ہے۔

د: سورۂ فاتحہ میں مذکور ﴿المغضوب علیھم﴾ سے یہود کے مراد لیے جانے کو ایسے ذکر کیا گیا ہے، جیسے کتاب وسنت سے تائید کے بغیر وہ مفسرین کا کوئی خودساختہ قول ہو، حالاں کہ صرف قرآن کریم ہی میں تین سے زائد موقعوں پر صراحتاً یہود کو ''مغضوب علیھم'' قرار دیا گیا ہے:

(البقرۃ:۶۱) ﴿**ضربت علیھم الذلة والمسکنة وباؤوا بغضب من اللّٰه**﴾ (ان یہودیوں کے اوپر ذلت وبے کسی کا ٹھپہ لگا دیا گیا ہے، اور وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹے ہیں)۔

(البقرۃ:۹۰) ﴿**فباؤوا بغضب علی غضب**﴾ (یہ غضب بالائے غضب لے کر لوٹے ہیں)۔

(المائدۃ:۶۰) ﴿**قل ھل أنبئکم بشر من ذلک مثوبةً عند اللّٰه؛ من لعنه اللّٰه وغضب علیه، وجعل منھم القردة والخنازیر**﴾ (آپ ان سے فرمایئے کہ: کیا میں تمھیں اللہ کے نزدیک اِس سے بھی بدتر انجام والوں کے بارے میں بتاؤں؟ یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت برسائی، جن پر غضب نازل کیا، اور جن میں سے کچھ کو بندر اور کچھ کو سُوَر بنایا)۔

اے کاش! شاذ جیسے لوگ قرآن کریم کے اس مضمون کو سمجھ پاتے کہ اسلام میں یہود دوستی کو بھی منافقوں کا شیوہ اور بد باطن لوگوں کی پہچان بتایا گیا ہے: (المجادلة:۱۴)
﴿ألم تر إلى الذين تولوا قوماً غضب الله عليهم، ما هم منكم ولا منهم، ويحلفون على الكذب وهم يعلمون﴾ (آپ اُن لوگوں کو نہیں دیکھتے جو اُس قوم سے دوستی گانٹھتے ہیں جن پر اللہ کا غضب نازل ہوا، یہ لوگ نہ تمہارے ہیں نہ اُن کے ہیں ۔﴿مذبذبين بين ذلك، لا إلى هؤلاء ولا إلى هؤلاء﴾ ۔ یہ لوگ جھوٹ پر قسمیں کھاتے ہیں، اور اپنی حقیقت کو خوب جانتے ہیں) فاعتبروا يا أولي الألباب۔

۳: دنیوی زندگی سے یہود کی محبت اور اُن کی حبّ مال و جاہ ضرب المثل ہے، قرآن کریم نے بھی اِس کا جا بجا تذکرہ کیا ہے، گذشتہ کچھ عرصہ سے ایک تکوینی نظام کے تحت، بطور اِتمامِ حجت کے اللہ کی طرف سے اِس لعنت زدہ قوم کو آخری مرتبہ (چند روزہ، ظاہری) سنبھالا دیا گیا ہے، جو اَسباب کے اِعتبار سے اپنے محرَّف مذہب کے باقیات سے بغاوت کے پس منظر میں حاصل ہوا ہے، اِس ظاہری تمدن اور ترقی کو دیکھ کر وہ بے ایمان اور ضعیف الایمان لوگ جن کا مبلغِ علم اور مطمحِ نظر دنیا اور صرف دنیا ہے، اِس دجالی ترقی پر مرے جا رہے ہیں، خود تو خود، اِسلام جیسے لازوال اور سدا بہار مذہب سے وابستہ لوگوں کو بھی اُسی مذہبی بغاوت پر آمادہ کر رہے ہیں:

"......اہلِ یہود کے ہاں اِس حیلِ شرعی کے ذریعہ دنیوی علوم پر لگی پابندی کا جو بند ٹوٹا ہے تو پھر یہ سلسلہ رُوکے نہیں رکا، دیکھتے دیکھتے انیسویں اور بیسویں صدی میں قومِ یہود سے علماء و مفکرین کی ایک فوج نکل آئی، جن کے دل و دماغ نے انیسویں اور بیسویں صدی کی بساط سجانے میں کلیدی رول ادا کیا، (اہلِ یہود کے اِس تجربہ میں "ہم مسلمانوں" کے لیے عبرت کا ایک بڑا سامان پوشیدہ ہے)"۔ (مستقبل کی بازیافت، ص۱۵۴، اشاعت ۲۰۰۵ء، از: راشد شاز)۔

تحریکات کے زمانہ میں مسٹر گاندھی، مولانا محمد علی مونگیریؒ کی خدمت میں گئے،

قرآن کریم سے اپنی دلچسپی کا ذکر، اور حضرت ابو بکرؓ و حضرت عمرؓ کی عظمتوں کا تذکرہ کرنے لگے، مولانا نے فرمایا کہ پھر دیر کیسی؟ پڑھیے کلمہ! اِس پر وہ سٹپٹا گئے، اُن کے جانے کے بعد مولانا نے فرمایا کہ شکاری جب شکار کرنے جاتا ہے تو شکار ہی کی بولی بولتا ہے، تاکہ وہ اُس کے قریب آجائے!

اِسی طرح یہ جتنے سازشی اور منافقانہ ٹولے کے لوگ ہوتے ہیں اِسلام کا نام تو صرف مسلمانوں کو لبھانے اور قریب کرنے کے لیے لیتے ہیں، اور ﴿إنما نحن مصلحون﴾ (ہم تو قوم کی اصلاح کے لیے اٹھے ہیں) کے دعوے سے دھوکہ دینا چاہتے ہیں، ورنہ اِن کی اَصل یہ ہوتی ہے: ﴿وإذا خلوا إلى شياطينهم قالوا إنا معكم، إنما نحن مستهزؤون﴾ (جب اپنے شیطان صفت آقاؤں کے پاس جاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو آپ کے ساتھ ہیں، اُن کو تو ہم بے وقوف بنا رہے تھے)۔ شاز کا لٹریچر دیکھ کر تو بے ساختہ قرآن مجید کی یہ آیت زبان پر آتی ہے: (آل عمران:۱۱۸) ﴿......ودوا ما عنتم، قد بدت البغضاء من أفواههم، وما تخفي صدورهم أكبر﴾ (یہ لوگ چاہتے ہیں کہ تم ضرر میں پڑ جاؤ، یہ بغض و دشمنی تو اِن کے منھ سے ظاہر ہوگئی، اور جو اِن کے سینوں نے چھپا رکھی ہے وہ اِس سے بھی بڑھ کر ہے)۔

۴: یہ شخص دجالی ترقیات کا یہاں تک دِل گرفتہ اور دِل دادہ ہو چکا ہے کہ (نعوذ باللہ) اِس دنیا ہی کو ''جنتِ خلد'' سمجھنے لگا ہے:

> ''...... کتنے ہی بے لوث اہل فن، جن کے ناموں سے بھی ہم واقف نہیں، انھوں نے ''عمل صالح'' کی اس مہم جوئی میں اپنی زندگیاں دے ڈالیں، جب ہی یہ ممکن ہوا کہ آج ہم اکیسویں صدی کی ابتداء میں سائبر اسپیس کے شہری کی حیثیت سے ''حقیقی دنیا سے بھی پرے'' ایک ایسی دنیا میں سانس لینے کی پوزیشن میں ہیں جو اطلاعات کے غیر مرئی تاروں کے علاوہ کہیں اور وجود نہیں رکھتی......''۔
>
> (تشکیلِ جدید، ص ۴۹، از: راشد شاز)۔

یھـاجروا﴾ (جولوگ اِیمان لاچکے مگراُنھوں نے ہجرت نہیں کی تو ایسے لوگوں سے تمہارا کوئی تعلق نہیں، جب تک وہ ہجرت نہ کرلیں)، غور کرنا چاہیے کہ جب تک ''اِسلامی اور غیر اِسلامی سرزمین'' کافرق نہیں ہوگا تو ہجرت کہاں سے، کس جگہ کی جائے گی؟

۳: سیاسی دنیا کی تقسیم:

قرآنی نصوص، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ اور آپ کے صحابہؓ کی زندگی سے مجموعی طور پر تین طرح کے ماحول اور تین قسم کی زمینوں کا تصور ملتا ہے:

۱: دارالاسلام، جہاں ہر طرح کا غلبہ مسلمانوں ہی کو حاصل ہو، جیسے مدینہ منورہ۔

۲: دارالامن، جہاں حکومت تو اہل کفر کی ہو، مگر آپسی معاہدے اور باہمی اعتماد کا ماحول ہو، جیسے حبشہ۔

۳: دارالکفر، جہاں غلبہ وتسلط سب کافروں کا ہو، اور اہل اِسلام مقہور ومجبور ہوں۔

اِسلام میں جن احکام کا تعلق انفرادی مسائل اور اِختیاری امور سے ہے، وہ تو ہر جگہ اور ہر زمانے میں یکساں رہتے ہیں، اور جن مسائل کا تعلق اجتماعی نظام، غیر اِختیاری حالات اور اِضطراری معاملات سے ہے وہ ماحول کی تبدیلی سے بدل سکتے ہیں، ''دارالاسلام'' میں رہنے کا طریقہ الگ ہے، وہاں کے غیر مسلمین کے حقوق علیحدہ ہیں، ''دارالامن'' میں باہمی معاہدہ کے تحت رہنے کے مسائل الگ ہیں، وہاں کے غیر مسلمین کے اُحکام مختلف ہیں، اور ''دار الحرب'' کے اُحکام اور وہاں کے غیر مسلمین کے مسائل مستقل ہیں۔

۴: مسائلِ عالم:

اور یہ شکوہ کہ:

''مسائلِ عالم سے اپنا رخ موڑ کر اور عام اِنسانیت کی فلاح سے دست بردار

ہوکر ہماری تمام تر توجہ ایک مخصوص ثقافتی شناخت والی امت مسلمہ پر مرکوز ہوتی گئی“

التباسِ فکری سے ناشی اور مسئلے کی تفصیل نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے، معلوم نہیں کہ ”مسائلِ عالم“ کا شرعی مصداق بھی معترض کے ذہن میں ہے یا نہیں، ظاہر ہے کہ ”مسائلِ عالم“ وہی قابل اعتناء ہوسکتے ہیں جو اِنسان کے مقصد تخلیق سے ہم آہنگ ہوں: (الذاریات:۵٦) ﴿وما خلقت الجن والإنس إلا ليعبدون﴾ (ہم نے جن واِنس کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے)، اور (المؤمنون: ۱۱۵) ﴿أفحسبتم أنما خلقناكم عبثاً، وأنكم إلينا لا ترجعون﴾ (کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے تمھیں یوں ہی بے فائدہ پیدا کیا ہے، اور تمھیں ہمارے پاس لوٹ کر نہیں آنا ہے؟)، اور (النحل:۳٦) ﴿ولقد بعثنا في كل أمة رسولاً أن اعبدوا الله واجتنبوا الطاغوت﴾ (اور ہم نے ہر قوم میں کوئی نہ کوئی پیغمبر اِس پیغام کے ساتھ ضرور بھیجا کہ لوگو! اللہ کی عبادت کرو، اور طاغوت سے بچو)۔

لہٰذا دنیا کی کسی بھی آبادی سے مسلمانوں کا تعلق: لوگوں کو ایک اللہ کی طرف بلانے، نیکی پھیلانے، برائی روکنے، نماز قائم کرنے، زکوۃ دینے وغیرہ دینی امور سے ہے، جیسا کہ قرآنِ کریم میں بھی یہی مضامین مختلف مواقع پر بیان کیے گئے ہیں:

(آل عمران:۱۱۰): ﴿كنتم خير أمة أخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنهون عن المنكر وتؤمنون بالله﴾ (تم ایسی بہترین امت ہو، جو دوسروں کے نفع کے لیے پیدا کی گئی ہے، تم نیکی کا حکم دیتے ہو، برائی سے روکتے ہو، اور خود اللہ پر ایمان رکھتے ہو)۔

(آل عمران:۱۰۴) ﴿ولتكن منكم أمة يدعون إلى الخير ويأمرون بالمعروف وينهون عن المنكر﴾ (اور تمہارے درمیان ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو لوگوں کو خیر کی طرف بلائے، نیکی کی تلقین کرے، اور برائی سے روکے)۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ میں بھی بس اِنہی امور کا تذکرہ ملتا ہے، لہٰذا

اِس پہلو سے اہلِ اِسلام کو اپنا جائزہ لینے کی یقیناً ضرورت ہے کہ اِس میں کتنی کوتاہی ہو رہی ہے۔

پھر اگر حکومت وقوت بھی حاصل ہو تو: عدل و اِنصاف قائم کرنا، ظلم ومعصیت روکنا، حدود اللہ کو نافذ کرنا اور رعیت کی جائز ضروریات اور قدرے سہولیات کا خیال رکھنا بھی اِسلامی حکومتوں کے فرضِ منصبی میں شامل ہو جاتا ہے، اور یہی وہ چیزیں ہیں جو خلافتِ راشدہ کا مبنیٰ اور حکومتِ عادلہ کا مطمحِ نظر ہوتی ہیں، مگر جب سے مسلم حکومتوں سے اِن اعمال میں غفلت شروع ہوئی جبھی سے مسلمانوں کو سیاسی اور اقتصادی زوال کا سامنا ہے، اور ہمارے لیے ''زیاں'' سے زیادہ موجبِ حسرت: ''اِحساسِ زیاں'' کا مفقود ہو جانا، اور ''زوال'' سے زیادہ باعثِ افسوس: ''اَسبابِ زوال'' کا ملتبس ہو جانا ہے، فالی اللہ المشتکی، وھو المستعان۔

اور جو مسائل: فطرت سے بغاوت کا نتیجہ ہوں، اور عقل وشرع کو چھوڑ کر جذبات وخواہشات کی پیروی کا فطری انجام ہوں، اُن کا صحیح علاج اُن اَسباب کا دور کرنا ہے جن کی بدولت نوبت یہاں تک پہنچی ہے، اور اُن چیزوں سے پرہیز کرنا ہے جو ازدیادِ مرض کا سبب ہیں، نہ کہ خود بھی اُنہی امراض وحالات کا شکار ہو جانا۔

اور جہاں تک بات ''عام اِنسانیت کی فلاح سے دست برداری'' کی ہے تو ''فلاح'' کے شرعی مفہوم اور ''اِنسانیت'' کے اِسلامی تصور کی تشریح بھی ضروری ہے:

۵: فلاح کا شرعی مفہوم:

''فلاح'' کا شرعی مفہوم متعین کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ لفظ ''فلاح'' کے قرآنی مواقعِ استعمال کا اِستقصاء کر کے سب کا تجزیہ کر لیا جائے، راقم کی تلاش کے مطابق قرآن کریم نے ''فلاح'' کو اِن اعمال پر متفرع کیا ہے: اِیمان بالغیب، ایمان بالآخرہ، اتباعِ قرآن، سمع وطاعت، کافروں سے براءت، اہتمامِ نماز، ادائیگیٔ زکوٰۃ، اعمالِ صالحہ

اور اعمالِ خیر، تزکیۂ نفس، سخاوتِ قلب، توبہ و اِنابت، تقوی، تعلق مع اللہ، کثرتِ ذکر، ثبات قدمی، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، مجاہدہ فی سبیل اللہ، اِسلامی سرحدوں کی حفاظت (جغرافیائی ہوں، یا نظریاتی)۔

ہماری تلاش میں تقریباً یہ وہ تمام اعمال ہیں جن پر قرآنِ کریم نے ''فلاح'' (اور کامیابی) کا مژدہ سنایا ہے، لہٰذا اِن کے خلاف جو کام ہوں گے وہ عدم فلاح اور ناکامی کے ہوں گے، اور ویسے بعض اعمال کے بارے میں صراحت بھی وارد ہوگئی ہے کہ یہ فلاح سے دور اور کامیابی کے راستے سے منحرف ہیں: کفر، شرک، اعمالِ شرک، ارتداد، شراب خواری، سود خوری، قمار و جوا، اللہ اور اُس کی آیات میں جھوٹ و افتراء، ظلم، سحر وجادو۔

فلاح وکامیابی کے مذکورہ اعمال میں غور کر لینا چاہیے کہ اِس وقت دنیا میں کون سی قوم، یا کون سی جماعت (جیسی تیسی حالت میں بھی) ان کو انجام دے رہی ہے، اور ناکامی اور عدم فلاح کے راستوں سے خود کو بچانے کی حتی الامکان کوشش کر رہی ہے، اور کون سے وہ طبقات اور افراد ہیں جو خیر و شر کے اِن اِسلامی فرق و امتیاز ہی کو میٹ دینے اور ختم کر دینے کی سعیٔ مذموم میں مصروف ہیں: (الصف:۸) ﴿یریدون لیطفئوا نور اللہ بافواھھم، واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون﴾ (یہ لوگ اللہ کے نور کو اپنی پھونکوں سے بجھانا چاہتے ہیں، حالاں کہ اللہ اپنے نور کو پورا کر کے رہے گا، چاہے کافروں کو جتنا بھی برا لگے)۔

۳-: یہودیوں سے خاص مناسبت:

گذشتہ سطور کا مطالعہ کرنے والے اِنصاف پسند قارئین کرام کو راشد شاؔز کی علمی سطح، اور فکری رخ کا بخوبی اندازہ ہو گیا ہوگا، اور یہ بات بھی بخوبی سمجھ میں آگئی ہوگی کہ تحریف و تبدیل، دجل و تلبیس اور فتنہ و تشکیک کے سارے یہودی جراثیم اور بنی اسرائیل

کی بددینی کی تمام خصلتیں ان کی فطرت کا حصہ ہیں۔

اِن کی تحریرات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ صاحب موجودہ مادی ترقیات سے عموماً، اور یہودیوں سے خصوصاً بہت متاثر اور مرعوب (یا اُن کے مبعوث؟) ہیں:

ا: اِنھوں نے اپنے ''برج کورس'' میں ''مذاکرۂ سبت'' (سنیچر کے دن کی مجلس) کا ایک مضمون رکھا ہے، اور یہ معلوم ہے کہ سنیچر کا دِن یہودِ بے بہبود کے ہاں بہت تقدس کا حامل ہے، قرآن کریم نے یہود کا تذکرہ کرتے ہوئے مختلف مواقع پر اِس دِن سے اُن کے تعلق کا ذکر کیا ہے:

(البقرۃ:٦٥) ﴿ولقد علمتم الذين اعتدوا منكم في السبت فقلنا لهم كونوا قردةً خاسئين﴾ (اور تم خوب اچھی طرح جانتے ہو اپنے اُن لوگوں کو جنھوں نے ''سبت'' کے سلسلے میں حد سے تجاوز کیا تھا، تو ہم نے اُن سے کہہ دیا تھا: تم ہوجاؤ ذلیل بندر)۔

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے: (النساء:٤٧) ﴿......أو نلعنهم كما لعنا أصحاب السبت﴾ (یا ہم اُن پر لعنت برسا دیں گے جیسے کہ ہم ''سبت'' والوں پر لعنت اتار کر چکے ہیں)۔

۲: نبی آخر الزماں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ منورہ پہنچنے پر، جس فرقے نے آپ کی سب سے سخت مخالفت اور مزاحمت کی، وہ قرآن وحدیث اور تاریخ وسیر کے اتفاقی بیان کے مطابق اسرائیل النسل یہود تھے، اِس لیے قرآن مجید میں جابجا ان کی اِس حرکت اور شیطانی فطرت کا تذکرہ کرتے ہوئے اہلِ اسلام کو ان سے دور رہنے کا حکم دیا گیا ہے: (المائدۃ:٥١) ﴿يا أيها الذين آمنوا لا تتخذوا اليهود والنصارى أولياء، بعضهم أولياء بعض﴾ (اے ایمان والو! یہود ونصاریٰ کو دوست مت بناؤ، یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں)۔

ایک دوسری جگہ یہود کی مسلم دشمنی کو بطور خاص بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

﴿لتجدن أشد الناس عداوةً للذین آمنوا؛ الیھود والذین أشر کوا......﴾ (المائدۃ:۸۲) (یقیناً آپ ایمان والوں سے سب سخت دشمنی رکھنے والا یہودیوں اور مشرکوں کو پائیں گے)۔

مگر اِن سب کے باوجود شاذ کو اہلِ اِسلام اور یہودیوں کے درمیان موجود اِس فطری فاصلے کو ختم کرنے کی بہت فکر ہے، یہ اپنی مختلف تحریروں میں اس کی پرزور وکالت کرتے اور جذباتی دعوت دیتے نظر آتے ہیں، مسئلہ فلسطین سے متعلق ''حق کے دو بول'' کے عنوان سے اس موضوع پر انھوں نے مستقل مضمون بھی لکھا ہے، اُس میں لکھتے ہیں:

''......لیکن مشکل یہ ہے کہ اہل یہود سے متعلق ہمارا فہم، قرآن مجید کے بجائے، سید قطب کے معروف زمانہ کتابچہ **معرکتنا مع الیھود** کا پروردہ ہے، جس میں بلا استثناء تمام ہی یہود شیطانی گروہ کے پراسرار کردار کی حیثیت سے دکھائے گئے ہیں، ہم مدت سے اُن تفسیروں کے اسیر ہیں جن میں ﴿غیر المغضوب علیھم ولا الضالین﴾ سے بالتخصیص یہود ونصاریٰ مراد لیے جاتے ہیں، ہم شدتِ جذبات میں یہ نہیں سوچتے کہ قرآن مجید جو منصفِ اعلیٰ کا کلام ہے؛ عہد رسول کے بعض یہودی قبائل یا افراد کی بدبختی کے لیے اُن کی تمام آئندہ نسلوں پر لعنت کا فیصلہ کرسکتا ہے، قرآن میں اہل قریش کے بعض کردار کی بھی شدید مذمت کی گئی ہے، کفارِ قریش کی دنیوی واخروی خسارے کا مژدہ (؟) سنائے جانے کے باوجود ہمارے گمان میں بھی یہ بات نہیں آتی کہ تاقیامت کفار قریش کی اولادیں مغضوب الغضب ہیں، پھر کوئی وجہ نہیں کہ کسی خاص نسل کی شرارت کے لیے آنے والی تمام نسلوں کو باعث لعنت قرار دیا جائے''۔ (مستقبل کی بازیافت ص۱۱۱)۔

اِس اقتباس میں چند باتیں نوٹس لینے کی ہیں:

الف: یہود سے متعلق مسلمانوں کے خیالات وتصورات کو ماضی قریب کے مشہور اِخوانی لیڈر سید قطب شہید (ت:۱۳۸۶ھ موافق ۱۹۶۶ء) کے افکار ونظریات کا

نتیجہ بتایا گیا ہے، حالاں کہ بنو قُریظہ، بنونَضیر، اور بنو قَینُقاع (جیسے یہودی قبائل) کے غدر، بدعہدی اور حکومتِ اسلامیہ کے خلاف مسلسل ریشہ دوانیوں کی بناء پر، اولاً بزمانۂ رسالت مدینۂ نبویہ سے ذلت آمیز اِخراج، پھر خیبر اور جزیرۃ العرب سے خلافت فاروقی میں جلاوطنی، اور اُس کے بعد ہر دور میں ان کی اوچھی حرکتوں کے نتیجے میں غیور مسلم حکم رانوں کی طرف سے ان کی سرکوبی؛ یہ سب ایسے تاریخی حقائق ہیں، جن کا اِنکار ایک کھلا ہوا کافر بھی نہیں کرسکتا۔

ب: قرآنِ کریم میں جن افراد یا قوموں پر اُن کے اِیمان نہ لانے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سرکشی اختیار کرنے کی بناء پر اِظہارِ غضب اور تذکرۂ لعنت کیا گیا ہے، اُس کی غایت قبولِ اِسلام کو قرار دیا گیا ہے:

(البقرۃ:۱۳۷)﴿فإن آمنوا بمثل ما آمنتم به فقد اهتدوا، وإن تولوا فإنما هم في شقاق، فسيكفيكهم الله﴾ (اس کے بعد اگر یہ (اہلِ کتاب) بھی تمہارے ہی جیسا ایمان لے آئیں (جس میں توحید، رسالت، قرآن اور آخرت بطورِ خاص ہیں) تب تو یہ راہ یاب ہوں گے، اور اگر یہ روگردانی کرتے ہیں تو یہ شقاق میں پڑ گئے ہیں، پھر تو آپ کی طرف سے اللہ ہی ان سے نمٹے گا)۔

اِس آیت سے معلوم ہوا کہ جو قبائل یا افراد اپنی بدبختی سے اِسلام نہ لاکر مغضوب الغضب ٹھہرے تھے، ان کے اِس غضب اور لعنت سے نکلنے کا واحد طریقہ: صحابہؓ کے طریقے پر اِسلام قبول کرلینا ہے، جب تک وہ (یا اُن کی نسلیں) اِسلام قبول نہیں کرتے، ہمیشہ ملعون اور مغضوب ہی رہیں گے؛ وإن رغم أنف فلان بن فلان۔

ج: گذشتہ اقتباس میں زمانۂ نبوت کے یہود کی شرارتوں کا موازنہ خاندانِ قریش کی مخالفتوں سے کیا گیا ہے، حالاں کہ دونوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ قریش (بشمول دیگر مشرکینِ عرب) انجام کار مشرف باسلام ہوگئے تھے، جب کہ یہودی قبائل

اپنی فطری ضد اور ہٹ دھرمی پر آخر تک قائم رہے تھے، اور اُن میں کے معدودے چند افراد کے علاوہ کوئی بھی اسلام نہیں لایا تھا۔

پھر یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ شاذ اُس فرقے سے تعلق رکھتے ہیں جو قرآنِ کریم کے زمان ومکان کی حدود وقیود سے آزاد، اور شانِ نزول اور پس منظر کے بیان سے بے نیاز ہونے کا مدعی ہے، تو ایسے لوگوں کو تو قرآن مجید کے عمومی بیانات کو ''تاریخ وآثار'' کی روشنی میں کسی مخصوص عہد وزمان اور موقع ومکان کے ساتھ خاص کرنے کا کوئی حق ہی نہیں ہے۔

د: سورۂ فاتحہ میں مذکور ﴿المغضوب علیھم﴾ سے یہود کے مراد لیے جانے کو ایسے ذکر کیا گیا ہے، جیسے کتاب وسنت سے تائید کے بغیر وہ مفسرین کا کوئی خودساختہ قول ہو، حالاں کہ صرف قرآن کریم ہی میں تین سے زائد موقعوں پر صراحتاً یہود کو ''مغضوب علیھم'' قرار دیا گیا ہے:

(البقرۃ:٦١) **﴿ضربت علیھم الذلة والمسكنة وباؤوا بغضب من الله﴾** (ان یہودیوں کے اوپر ذلت وبے کسی کا ٹھپہ لگا دیا گیا ہے، اور وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹے ہیں)۔

(البقرۃ:٩٠) **﴿فباؤوا بغضب على غضب﴾** (یہ غضب بالائے غضب لے کر لوٹے ہیں)۔

(المائدۃ:٦٠) **﴿قل هل أنبئكم بشر من ذلك مثوبةً عند الله؛ من لعنه الله وغضب عليه، وجعل منهم القردة والخنازير﴾** (آپ ان سے فرمائیے کہ: کیا میں تمھیں اللہ کے نزدیک اِس سے بھی بدتر انجام والوں کے بارے میں بتاؤں؟ یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت برسائی، جن پر غضب نازل کیا، اور جن میں سے کچھ کو بندر اور کچھ کو سُور بنایا)۔

اے کاش! شاؔز جیسے لوگ قرآن کریم کے اس مضمون کو سمجھ پاتے کہ اسلام میں یہود دوستی کو بھی منافقوں کا شیوہ اور بد باطن لوگوں کی پہچان بتایا گیا ہے: (المجادلۃ:۱۴)

﴿ألم تر إلى الذين تولوا قوماً غضب الله عليهم، ما هم منكم ولا منهم، ويحلفون على الكذب وهم يعلمون﴾ (آپ اُن لوگوں کو نہیں دیکھتے جو اُس قوم سے دوستی گانٹھتے ہیں جن پر اللہ کا غضب نازل ہوا، یہ لوگ نہ تمہارے ہیں نہ اُن کے ہیں -﴿مذبذبين بين ذلك، لا إلى هؤلاء ولا إلى هؤلاء﴾-، یہ لوگ جھوٹ پر قسمیں کھاتے ہیں، اور اپنی حقیقت کو خوب جانتے ہیں) فاعتبروا يا أولي الألباب۔

۳: دنیوی زندگی سے یہود کی محبت اور اُن کی حبّ مال وجاہ ضرب المثل ہے، قرآن کریم نے بھی اِس کا جا بجا تذکرہ کیا ہے، گزشتہ کچھ عرصہ سے ایک تکوینی نظام کے تحت، بطور اِتمامِ حجت کے اللہ کی طرف سے اِس لعنت زدہ قوم کو آخری مرتبہ (چند روزہ، ظاہری) سنبھالا دیا گیا ہے، جو اَسباب کے اِعتبار سے اپنے محرَّف مذہب کے باقیات سے بغاوت کے پس منظر میں حاصل ہوا ہے، اِس ظاہری تمدن اور ترقی کو دیکھ کر وہ بے اِیمان اور ضعیف الایمان لوگ جن کا مبلغِ علم اور مطمحِ نظر دنیا اور صرف دنیا ہے، اِس دجالی ترقی پر مرے جا رہے ہیں، خود تو خود، اِسلام جیسے لازوال اور سدا بہار مذہب سے وابستہ لوگوں کو بھی اُسی مذہبی بغاوت پر آمادہ کر رہے ہیں:

"......اہلِ یہود کے ہاں اِس حیلِ شرعی کے ذریعہ دنیوی علوم پر لگی پابندی کا جو بند ٹوٹا ہے تو پھر یہ سلسلہ رُوکے نہیں رکا، دیکھتے دیکھتے انیسویں اور بیسویں صدی میں قومِ یہود سے علماء و مفکرین کی ایک فوج نکل آئی، جن کے دل ودماغ نے انیسویں اور بیسویں صدی کی بساط سجانے میں کلیدی رول ادا کیا، (اہلِ یہود کے اِس تجربہ میں "ہم مسلمانوں" کے لیے عبرت کا ایک بڑا سامان پوشیدہ ہے)"۔ (مستقبل کی بازیافت، ص ۱۵۴، اشاعت ۲۰۰۵ء، از: راشد شاز)۔

تحریکات کے زمانہ میں مسٹر گاندھی، مولانا محمد علی مونگیریؒ کی خدمت میں گئے،

قرآن کریم سے اپنی دلچسپی کا ذکر، اور حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کی عظمتوں کا تذکرہ کرنے لگے، مولاناؒ نے فرمایا کہ پھر دیر کیسی؟ پڑھیے کلمہ! اِس پر وہ سٹپٹا گئے، اُن کے جانے کے بعد مولاناؒ نے فرمایا کہ شکاری جب شکار کرنے جاتا ہے تو شکار ہی کی بولی بولتا ہے، تاکہ وہ اُس کے قریب آ جائے!

اِسی طرح یہ جتنے سازشی اور منافقانہ ٹولے کے لوگ ہوتے ہیں اِسلام کا نام تو صرف مسلمانوں کو لبھانے اور قریب کرنے کے لیے لیتے ہیں، اور ﴿إنما نحن مصلحون﴾ (ہم تو قوم کی اصلاح کے لیے اٹھے ہیں) کے دعوے سے دھوکہ دینا چاہتے ہیں، ورنہ اِن کی اَصل یہ ہوتی ہے: ﴿وإذا خلوا إلى شياطينهم قالوا إنا معكم، إنما نحن مستهزؤون﴾ (جب اپنے شیطان صفت آقاؤں کے پاس جاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو آپ کے ساتھ ہیں، اُن کو تو ہم بے وقوف بنا رہے تھے)۔

شاؔز کا لٹریچر دیکھ کر تو بے ساختہ قرآن مجید کی یہ آیت زبان پر آتی ہے: (آل عمران:۱۱۸) ﴿......ودوا ما عنتم، قد بدت البغضاء من أفواههم، وما تخفي صدورهم أكبر﴾ (یہ لوگ چاہتے ہیں کہ تم ضرر میں پڑ جاؤ، یہ بغض و دشمنی تو اِن کے منھ سے ظاہر ہو گئی، اور جو اِن کے سینوں نے چھپا رکھی ہے وہ اِس سے بھی بڑھ کر ہے)۔

۴: یہ شخص دجالی ترقیات کا یہاں تک دِل گرفتہ اور دِل دادہ ہو چکا ہے کہ (نعوذ باللہ) اِس دنیا ہی کو "جنتِ خلد" سمجھنے لگا ہے:

> "......کتنے ہی بے لوث اہل فن، جن کے ناموں سے بھی ہم واقف نہیں، انھوں نے "عمل صالح" کی اس مہم جوئی میں اپنی زندگیاں دے ڈالیں، جب ہی یہ ممکن ہوا کہ آج ہم اکیسویں صدی کی ابتداء میں سائبر اسپیس کے شہری کی حیثیت سے "حقیقی دنیا سے بھی پرے" ایک ایسی دنیا میں سانس لینے کی پوزیشن میں ہیں جو اطلاعات کے غیر مرئی تاروں کے علاوہ کہیں اور وجود نہیں رکھتی......"۔
>
> (تشکیلِ جدید، ص ۴۹، از: راشد شاز)۔

''......جن لوگوں کو اِس بات پر اِصرار ہو کہ اُن کے پاس آج بھی ''جنت بنانے'' کا فارمولہ موجود ہے، وہ ''غیابِ جنت'' کے لیے اِس کے علاوہ اور کیا دلیل پیش کر سکتے ہیں کہ اُن کی اِسکیم شیطان کی سازش کی نذر ہو گئی ہے ......''۔

اِس اقتباس کو ذہن میں رکھتے ہوئے، بخاری و مسلم میں موجود ایک صحیح حدیث شریف ملاحظہ فرمائیے، اور اُس کی معنویت پر غور کرتے ہوئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت، صداقت اور معجزہ پر اپنے اِیمان کو تازہ کیجیے، اور (آنکھوں دیکھے مشاہدات کی روشنی میں بھی) احادیث شریفہ کی حجیت کو تسلیم کیجیے:

مسلم (۲۹۳۴) کے الفاظ یہ ہیں: ''الدجال ...... معه جنة و نار، فناره جنة، وجنته نار'' (دجال کے ساتھ جنت بھی ہوگی جہنم بھی، مگر اُس کی دوزخ حقیقت میں جنت ہوگی، اور اُس کی جنت حقیقت میں جہنم ہوگی)۔

برادرانِ اِسلام! ہمارا یہ دور ''فتنوں'' کا دور ہے، جس میں اچھے اچھے لوگ بھی غیر شعوری طور پر گمراہ کن افکار و نظریات کا شکار ہوتے جا رہے ہیں، شریعت کے کھلے ہوئے واضح اَحکام میں بھی دیکھتے دیکھتے لوگوں کے نظریات بدلتے جا رہے ہیں، جن چیزوں کو کل تک ناجائز اور حرام سمجھا جا رہا تھا، وہ آج جائز ہی نہیں ''ضروری'' قرار دی جا رہی ہیں؟ جن چیزوں کو کل تک فرض اور ضروری سمجھا جا رہا تھا آج اُن کے بارے میں بھی گومگو کی کیفیت ہو گئی ہے، شریعت کی جو تعبیرات و تشریحات اور اُن کے سیدھے سادے مفاہیم و معانی کل تک بدیہی اور مسلَّم خیال کیے جاتے تھے، وہ آج شکوک و شبہات کے دائرے میں آتے جا رہے ہیں۔

حضرت ابن عُمرؓ سے مروی ایک حدیث کے یہ الفاظ ملاحظہ فرمائیے (ابوداود: ۴۲۷۰): ''...... ثم فتنة الدُّهيماء، لا تدع أحداً من هذه الأمة إلا لطمته لطمة، فإذا قيل: انقضت تمادت، يصبح الرجل فيها مؤمناً ويمسي كافراً، حتى يصير الناس إلى فُسطاطين: فسطاط إيمان لا نفاق فيه، وفسطاط نفاق لا إيمان فيه،

فإذا كان ذاكم فانتظروا الدجال من يومه أو من غده"۔

(...... پھر قربِ قیامت میں ایسے تاریک (دِینی) فتنہ وآزمائش کا سلسلہ ہوگا کہ اُس کے اثر سے اِس امت کا کوئی فرد بچ نہیں پائے گا، جب لوگ سمجھیں گے کہ اب شاید ختم ہوجائے پھر دراز ہوجائے گا، اُس میں (پوری طرح سے مبتلا ہوجانے والا) آدمی صبح تو کرے گا اِیمان کی حالت میں، اور شام ہوتے ہوتے (اُس کا نظریہ بدل جائے گا یہاں تک کہ) وہ (نعوذ باللہ) کافر ہوجائے گا، اُس زمانہ میں میری امت کے لوگ دو طرح کے ہوجائیں گے: ایک پکے اِیمان والے، جن کے یہاں نفاق کا گذر نہیں ہوگا، دوسرے منافقین، جن کے اندر سے اِیمان پوری طرح سے نکل چکا ہوگا، جب ماحول یہاں تک پہنچ جائے تو پھر "دجال" کا انتظار کرنا کہ وہ آج ہی کل میں ظاہر ہوجائے گا)۔

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ایک حدیث میں ہے (مسلم شریف :۱۶۹):

"يصبح الرجل مؤمناً ويمسي كافراً ...... يبيع دِينه بعَرَض من الدنيا "(کہ ایمان وکفر کا یہ سودا دُنیا کے مال ومتاع، عہدہ ومنصب اور شہرت ونام وَری کے بدلہ میں ہوگا)۔ نعوذ باللّٰه من الكفر بعد الإيمان، والحور بعد الكور۔

۴-: ڈاکٹر کی شاذ کی علمی لیاقت اور دینی حیثیت:

میرے دینی بھائیو! "مذہب" کے سلسلہ میں یہ چند مثالیں ہیں جو شاذ کی تلبیسات وتشکیکات کے ڈھیر میں سے (بادلِ نخواستہ) نکال کر دکھائی گئی ہیں۔

ان مثالوں اور تفصیلات سے قارئین کرام کو اچھی طرح اندازہ ہوگیا ہوگا کہ ڈاکٹر شاز "مذہب" اور "دینی مسائل" کے سلسلے میں یا تو پرلے درجے کے جاہل، ناواقف اور بدفہم ہیں، یا پھر (کسی کے آلۂ کار کے طور پر؟) انتہائی مکاری، عیاری اور دجل وتلبیس سے کام لیتے ہیں۔

ہمارا یہاں مقصد اُن کے پورے لٹریچر کا پوسٹ مارٹم کرنا نہیں ہے، بلکہ اپنے

قارئین کے اندر ایسے افراد کے تئیں بصیرت پیدا کرنا ہے، تاکہ خذ ما صفا ودع ما کدر (حق وباطل میں امتیاز) کی اہلیت پیدا ہونے سے پہلے ایسے گمراہ اور جادۂ حق سے منحرف لوگوں سے احتیاط رکھی جائے، اوران کی تحریر وتقریر، اور تصنیف وتالیف کو ''شجرۂ ممنوعہ'' قرار دے کر خود بھی احتراز کیا جائے، اور اپنے ماتحتوں کو بھی بچایا جائے۔

اگر کسی سے بالقصد کی گئی ایک بھی دینی تحریف ثابت ہو جائے، تو اللہ تعالی کے نزدیک وہ شخص انتہائی مبغوض اور ملعون ہو جاتا ہے، بالفرض اگر نبی سے بھی ایسی غلطی کا ارتکاب ہو جاتا، تو اُن کے بارے میں بھی قرآن کا لہجہ ملاحظہ ہو:

(الحاقۃ: ۴۴-۴۷) ﴿ولو تقوّل علينا بعض الأقاويل، لأخذنا منه باليمين، ثم لقطعنا منه الوتين، فما منكم من أحد عنه حاجزين﴾ (اگر یہ ہماری طرف کوئی جھوٹی بات منسوب کر دیتے، تو ہم ان کا داہنا ہاتھ پکڑتے اور ان کی رگ جاں کاٹ ڈالتے، پھر تم میں سے کوئی اس سزا سے ان کو بچانے والا بھی نہ ہوتا)۔

اور یہاں تو اِحاطہ واستقصا کا قصد کیے بغیر بھی شاز کی طرف سے ''اُصول وفروعِ اِسلام'' میں کی گئی اتنی ساری تحریفات وتلبیسات کی مثالیں جمع ہو گئیں، ایسے میں شرعی طور پر دینی حیثیت سے ڈاکٹر شاز پر کیا حکم لگے گا؟ اس کا فیصلہ تو اہل افتاء فرمائیں گے، باقی حق کے طلبگار ہمارے مسلمان بھائیوں کو ایسے لوگوں سے ہوشیار ہو جانا بہر حال ضروری ہے ﴿وما علينا إلا البلاغ المبين﴾۔

اِس کے بعد بعونہ تعالیٰ ''مذہب'' کو سمجھنے کی سب سے پہلی اور اہم بنیاد ''علم'' سے متعلق کچھ ضروری تفصیلات نذرِ قارئین کی جاتی ہیں، اللہ تعالیٰ نافع فرمائیں۔

دوسرا باب

علم

کسی بھی بحث یا گفتگو کے لیے ''علم'' کا ہونا سب سے بنیادی شرط ہے، کہ علم ہی ہر ظلمت کے لیے نور اور ہر تاریکی کے لیے روشنی ہے، علم ہی ہر جہالت کا علاج اور ہر ناواقفیت کا مداوا ہے، اور یہ درحقیقت اللہ رب العزۃ کی صفت ہے، مخلوق کو تو اُس کا ایک معمولی سا حصہ عطا ہوا ہے: (الإسراء:۸۵)﴿وما أوتيتم من العلم إلا قليلاً﴾ (اور تم کو صرف تھوڑا سا علم دیا گیا ہے)، زمخشری نے اِس حقیقت کو خوب ہی بیان کیا ہے:

العلم للرحمن جل جلاله　　　وسواه في جهلاته يتقمقم

ما للعلوم وللتراب وإنما　　　يحيى ليعلم أنه لا يعلم

(علم تو حقیقی معنوں میں اللہ جل جلالہ کی صفت ہے، اور اُس کے سوا تمام لوگ اپنی جہالتوں میں غوطہ لگا رہے ہیں، خاک کے اِس پتلے (اِنسان) کا ''علم'' جیسی باعظمت چیز سے کیا جوڑ؟ یہ تو صرف اتنا جاننے کے لیے زندہ رہتا ہے (اور علم حاصل کرتا ہے) کہ اسے پتہ چل جائے کہ میں کچھ جانتا نہیں)۔

جس طرح اِنسان اپنی اصل کے اعتبار سے جاہل اور بے وقعت ہے، مگر علم کے ذریعے اللہ رب العزۃ کی صفتِ ''عزیزی'' کا مظہر جمال بن کر معاشرہ میں عزت کا مقام پا جاتا ہے، اِسی طرح یہ ضعیف البنیان مخلوق اپنی فطرت کے لحاظ سے فانی اور مٹ

جانی والی ہے، مگر ''علم'' ہی کے ذریعے بعض اوقات حيٌّ لا يموت کی صفتِ ''حیاۃ'' کا پرتوِ کمال بن کر زندہ جاوید ہو جاتی ہے:

يموت قوم فيحيي العلم ذكرهم والجهل يلحق أحياءً بأموات

(کچھ لوگ مر جاتے ہیں، مگر علم اُن کے تذکرے کو زندہ رکھتا ہے، جب کہ جہالت زندوں کو بھی مُردوں کی صف میں شامل کر دیتی ہے)

۱- علم کی تعریف:

''علم'' کی تعریف کتبِ لغت میں مختلف عنوانات سے کی گئی ہے، سب کا ماحصل ہے: العلم ملكة يتميز بها الصحيح عن الغلط والحق عن الباطل والصدق عن الكذب (علم اُس فہم وبصیرت کو کہتے ہیں جس سے صحیح وغلط، حق وباطل اور سچ وجھوٹ کے درمیان تمیز کا ملکہ پیدا ہو جائے)۔

یعنی کسی چیز کی گہرائی تک اِس طرح رسائی کہ اُس کی ماہیت، خاصیت اور مصلحت پوری طرح آشکارا ہو جائے، اور فن، غیر فن سے ممتاز ہو جائے، مثلاً فن طب میں ایسی مہارت کہ اَمراض اور اُن کی اَدوِیہ کی ماہیت، اُن کے خواص، اور فوائد سب کی معرفت ہو جائے، اور ہر مرض اور ہر دوا اپنی علامات اور خواص کے ذریعے دوسرے امراض اور ادویہ سے منفرد ہو جائے، اور پھر اُس کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ افراد واحوال کے اعتبار سے تشخیص اور تجویز کا ملکہ بھی پیدا ہو جائے۔

یا مثلاً دین کی ایسی واقفیت کہ کتاب وسنت میں بیان کردہ شرعی احکام کی تفصیلات، اُن کے مواقعِ عمل، اور اُن کی وجوہِ مشروعیت سب معلوم ہو جائیں، اور دین، غیر دین سے، شریعت غیر شریعت سے، اور شرعی دلائل، غیر شرعی باتوں سے متمیز ہو جائیں، اور اس کا کمال یہ ہے کہ افراد واحوال پر اُن کے انطباق کی صلاحیت بھی حاصل ہو جائے۔

کسی بھی چیز کے ''علم'' میں اِس مرتبہ تک پہنچنے کے لیے اُس سے ایک مدت تک اِشتغال، اور ایک عرصہ تک وابستگی بالکل بدیہی ضرورت ہے، پھر اِس کے پہلو بہ پہلو عقل وفہم، لیاقت واہلیت اور میدانی قابلیت کا تفاوت بھی بطور خاص اثر انداز ہوتا ہے۔

ہر فن اور ہر شعبہ کا علم مستقل ہوتا ہے، ایک شخص کسی خاص فن میں باکمال ہوتے ہوئے، دوسرے فن میں ایک عامی جیسا ہوسکتا ہے، ایک ماہرِ فن بیرسٹر، انجیرنگ میں بالکل ناواقف ہوسکتا ہے، ایک ماہرِ طب، شرعیات میں صفر ہوسکتا ہے، عربی کا مشہور مقولہ ہے: لکل فن رجال (ہر فن کے ماہرین الگ ہوتے ہیں)۔

لہٰذا جس علم وفن میں گفتگو کی جائے اُس میں اِعتماد وتقلید کے لیے تو کسی مہارت کی ضرورت نہیں، مگر کسی طرح کی رائے زنی اور مشورے کے لیے، پہلے اُس علم وفن سے اپنی فنی مناسبت اور درک وبصیرت ثابت کرنی ضروری ہے، اُس کے بعد ہی وہ شخص اہلِ فن کے درمیان بیٹھنے اور کسی فنی موضوع پر گفتگو کرنے کا اہل ہوسکتا ہے۔

۲-: حصولِ علم کے ذرائع:

کائنات میں پائی جانے والی اشیاء تین طرح کی ہیں: محسوس، معقول، غائب:

۱: محسوس: وہ اَشیاء جن کا علم حواسِ خمسہ ظاہرہ سے حاصل ہوتا ہے، یعنی آنکھ سے دیکھ کر، کان سے سن کر، ناک سے سونگھ کر، زبان سے چکھ کر، یا ہاتھ (یا بدن کے کسی حصہ) سے چھوکر، مشاہدات وتجربات سے حاصل ہونے والا علم بھی اِسی میں داخل ہے۔

۲: معقول: وہ اشیاء جو قوتِ مدرِکہ اور عقل سے سمجھی جاتی ہیں۔

۳: غائب (مغیبات): وہ اشیاء جو اپنا وجود تو رکھتی ہیں، مگر ہر ایک کے حواس یا عقل کی دسترس میں نہیں ہوتیں، اِس لیے اُن کے علم کا حصول کسی مخبر کے خبر دینے یا کسی مشاہد کے نقل کرنے پر موقوف ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ حصولِ علم کے مجموعی طور پر تین ذرائع ہو سکتے ہیں: اِحساس ومشاہدہ، عقل وشعور، اور نقل وخبر۔

۳-: ذرائعِ علم کی حدودِ کار:

حواس اور عقل کی اپنی اپنی حدود ہیں، جو چیزیں اِحساس اور مشاہدہ سے تعلق رکھتی ہیں، عقل اُن میں عاجز، جیسے علامات سے عاری چیزوں کی حرارت یا برودت کا فیصلہ، یا اُن کے لون وعیب کا فیصلہ، کہ بے چھوئے، یا بے دیکھے اِس طرح کا حکم محض عقلی بنیاد پر نہیں لگایا جاسکتا، اور جو چیزیں عقل سے ہی سمجھی جاتی ہیں، حواس اُن میں بے بس، جیسے دو دو چار کا حساب، کہ نہ چھونے میں آسکتا، نہ دیکھنے میں، اُن چیزوں کو عقل سے سمجھنا ہی ضروری ہے، اور جو چیزیں حواس کی دسترس سے باہر اور عقل کے اِدراک سے بالاتر ہوں، دونوں اُس میں درماندہ، لہٰذا اُن کو جاننے اور ماننے کا اِس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں کہ کسی جاننے والے کی خبر اور اطلاع پر یقین کرلیا جائے۔

اَب اگر وہ چیز سارے ہی انسانوں (کے حواس وعقل) کی رسائی سے ماوراء ہو تو شریعت کی اِصطلاح میں ''غیب'' کہلاتی ہے، اُس پر کسی مخلوق کا ازخود مطلع ہونا ممکن نہیں، جب تک اللہ تعالیٰ ہی نہ بتادیں، اِس لیے ''مغیبات'' (جن میں اولین اور اساسی چیز: ہر کام اور اِقدام سے متعلق اللہ کی رضا وعدم رضا کی اطلاع ہے، ان سب) کے علم کا مدار ''خبرِ صادق'' اور ''نقلِ صحیح'' پر ہے۔

۴-: علمی دلائل:

کسی مسئلہ کے اِثبات کے لیے علمی مباحث کی بنیاد: یا تو حواس سے حاصل ہونے والا علم ہوتا ہے، کہ (اگر ممکن ہو تو) مشاہدہ یا سماع یا ذائقہ وغیرہ کے ذریعے فیصلہ کرلیا جائے، یا عقل سے سمجھا جانے والا علم ہوتا ہے، کہ عقلی اور منطقی اصولوں سے مسئلے کو سمجھا دیا جائے، یا نقل اور خبر کے ذریعے حاصل ہونے والا علم ہوتا ہے، کہ مثلاً جو چیزیں

(فی الحال) نہ ہمارے حواس میں آسکتیں، نہ عقل کی رسائی وہاں تک ہوسکتی، تو کسی (بلاواسطہ یا بالواسطہ) جاننے والے کی خبر کو مان لیا جائے۔

جن چیزوں کا علم حواس سے حاصل ہوتا ہے، عام طور پر اُن میں اختلاف نہیں ہوتا، یا اگر ہوتا بھی ہے تو اُس کا فیصلہ نسبتاً آسان ہوتا ہے، اِس لیے کہ حواسِ ظاہرہ کی قوتوں میں عموماً تفاوت نہیں ہوتا، اور تفاوت ہو بھی تو اُس کی تلافی سہل ہوتی ہے، البتہ جو چیزیں عقل یا نقل کے ذریعہ معلوم ہوتی ہیں اُن میں اختلاف کے مواقع زیادہ ہوتے ہیں، کیوں کہ عقلیں بھی متفاوِت ہوتی ہیں، اور خبر دینے والے بھی صادق وکاذب، فہیم وبلید وغیرہ مختلف قسم کے ہوتے ہیں، اِس لیے کسی علمی گفتگو میں بالعموم جن دعاوِی اور دلائل سے بحث کی جاتی ہے وہ یا "عقلی" ہوتے ہیں، یا "نقلی"۔

۵-: علم کی ممکنہ تقسیم:

جس طرح "رؤیت" (بمعنی دیکھنا) ایک غیر منقسم اکائی ہے، اور کسی بھی چیز کے دیکھنے پر "رؤیت" کا اِطلاق کیا جاسکتا ہے، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنا شریعت میں جو مرتبہ رکھتا ہے، وہ کسی اور کے دیکھنے کا نہیں ہوسکتا، کعبۂ شریفہ کی رؤیت کی جو فضیلت ہے، وہ کسی اور جگہ کی رؤیت سے نہیں حاصل ہوسکتی۔

اِسی طرح "علم" (بمعنی دانستن / جاننا) اگرچہ اپنے آپ میں کسی تقسیم وتجزّی کا تصور نہیں رکھتا، بلکہ علی الاطلاق کسی بھی چیز کے جاننے کو "علم" کہا جاسکتا ہے، اور اِسی وجہ سے لغت میں اور بعض مرتبہ شرعی نصوص میں بھی کسی چیز کی تہہ تک پہنچنے پر "علم" کے لفظ کا استعمال ہوا بھی ہے، لیکن چونکہ علم کسی مخصوص چیز (شئ معلوم) سے متعلق ہوئے بغیر مفہوم ومتصور نہیں ہوسکتا، اِس لیے اپنے موضوعات ومعلومات کے لحاظ سے اُس کی تقسیم اور اقسام میں فرقِ مراتب ناگزیر ہے۔

بعد از تقسیم جن علوم کا تعلق راست طور پر اللہ ورسول سے، اور بلاواسطہ اُن کے

کلام اور اَحکام سے ہوگا، اُن کے مرتبہ وفضیلت کا معاملہ الگ ہوگا، اور جن علوم کا تعلق اُن سے بالواسطہ ہوگا، اُن کا درجہ الگ ہوگا، اور جن اُمور کا اُن سے بلاواسطہ یا بالواسطہ کسی طرح کا تعلق نہ ہو، اُن کے جاننے کو لغت کے اعتبار سے چاہے ''علم'' کہہ لیا جائے، مگر شرعی اصطلاح کے اعتبار سے یہ اس لفظ کا بے محل اطلاق ہے۔

جیسے کہ لغت کے اعتبار سے لفظِ ''صحابی'' کا اِطلاق کسی کے ساتھ بھی رہنے والے پر کیا جاسکتا ہے، مگر ظاہر ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہنے والوں پر اس کا اِطلاق ایک الگ مفہوم، ایک مستقل خصوصیت اور ایک علیحدہ ہی شرف ومنزلت رکھتا ہے، اِس لیے شرعی اصطلاح میں ''صحابی'' کا لفظ انہی خاصان خدا کے لیے مخصوص ہے، سیاق وسباق اور قرائن کی رعایت کے بغیر کسی اور کے لیے اس کا استعمال غلط اور وجہِ خلط والتباس ہے۔

۶-: علمی موضوعات اور اُن میں فرقِ مراتب:

بحیثیت اِنسان اور مسلمان کے ہمارے علمی موضوعات کیا کیا ہوسکتے ہیں؟ پھر اُن کے درجات ومراتب کیا ہوسکتے ہیں؟ یہ بھی ایک اہم موضوع ہے، آیئے پہلے فطری اصولوں اور عقلی تقاضوں کی روشنی میں اِس موضوع پر غور کرتے ہیں:

ایک شخص کو کسی کمپنی میں ملازمت دی گئی تو سب سے پہلے اُس کو کن باتوں کی معلومات حاصل کرنا ضروری ہے؟ ظاہر ہے کہ اُس کی سلامتی طبع اور اِصابت عقل کا تقاضا یہی ہے کہ وہ معلوم کرے کہ اُس کمپنی کا ذمہ دار کون ہے؟ کون اُس کے مشاہرہ وراتب کا انتظام کرے گا؟ اُس کمپنی میں اُس کی حیثیت کیا ہوگی؟ اُس کے مفوّضہ امور کیا ہوں گے؟ اور کس طرح اُنجام دینے ہوں گے؟ کمپنی میں کن اصول کی پاسداری ضروری ہوگی؟ خلاصہ یہ کہ کن کاموں کا کرنا ضروری ہوگا؟ اور کن کاموں سے بچنا ضروری ہوگا؟

اِسی طرح اِس دنیا میں آنے والے اِنسان کے لیے اولاً یہ غور کرنا ضروری ہے؟

کہ ہم کون ہیں؟ ہمیں کس نے پیدا کیا ہے؟ کیوں پیدا کیا ہے؟ اور اِس دنیوی زندگی میں کون سے کام ہم سے متعلق ہیں؟ کس کام پر ہم کو کیا ملے گا؟ اور کون دے گا؟

اپنے مقصد تخلیق کے بارے میں اگر مذکورہ سوالات کے جوابات ''عقل'' کی گرفت سے باہر ہو رہے ہوں، تو ''نقل'' کی طرف رجوع کرلیا جائے، مثلاً قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے: (الذاریات:۵۶) ﴿وما خلقت الجن والإنس إلا ليعبدون﴾ (میں نے جن واِنس کو صرف اپنی عبادت ہی کے لیے پیدا کیا ہے)۔

ایک اور جگہ اِرشاد ہے: (البینۃ:۵) ﴿وما أمروا إلا ليعبدوا الله مخلصين له الدين حنفاء، ويقيموا الصلوٰة ويؤتوا الزكوٰة، وذلك دين القيمة﴾ (لوگوں کو صرف اِس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ وہ اللہ کی بندگی کریں اِس طرح، کہ بندگی ہو اِخلاص کے ساتھ صرف اُسی کی، بالکل اُسی کے ہوکر، اور نماز قائم کریں، زکوۃ دیا کریں، اور یہی سیدھی سچی امت کا دین ہے)۔

اِس آیت میں بتا دیا گیا کہ اِنسان کا مقصد تخلیق: عبادتِ خالق اور طاعتِ رب ہے، اور بس۔

اس کے بعد یہ دیکھنا چاہیے کہ ایک انسان کے لیے ممکنہ طور پر ''علم'' کے کیا کیا موضوعات ہوسکتے ہیں؟ راقم کی نظر میں مجموعی موضوعات تین قسموں میں آجاتے ہیں: (۱) اپنے خالق ومالک کی معرفت (۲) اپنے مقصد وجود کی معرفت (۳) کائنات اور نظامِ کائنات کی معرفت۔

تینوں موضوعات میں سے ہمارے مقصد تخلیق سے ہم آہنگ صرف پہلے دو موضوعات ہیں: خالق ومالک کی معرفت اور اپنے مقصد وجود کی معرفت، لہٰذا جو علوم اِن دونوں کے لیے جس قدر مفید اور معاون ہوں گے، اُسی قدر ضروری اور اہم قرار پا کر مقصودِ اصلی ٹھہریں گے، اور جو علوم تکمیلِ مقصد میں جس حد تک مانع اور حارج ہوں گے

اتنے ہی مضر اور مذموم قرار پائیں گے۔

"مذہب" سے متعلق ابتدائی گفتگو میں یہ بات عرض کی جا چکی ہے کہ مذہب: خداوند تعالیٰ کے مقرر کردہ دستورِ زندگی اور ضابطۂ حیات کا نام ہے، لہٰذا مذہبی کتابیں ہی ہمارے اصل مقصد تخلیق کو جاننے، سمجھنے اور اپنانے میں مفید ہو سکتی ہیں، اِس بنا پر یہ بات بھی بالکل برحق ٹھہرتی ہے کہ وہ "علم" جو ہمارے مقصد وجود سے ہم آہنگ ہے، وہ صرف "مذہبی علم" ہے، جس کا مدار "نقل صحیح" پر ہے۔

اور نقل صحیح کا مصداق کیا کیا چیزیں ہو سکتی ہیں، اِس سے متعلق اِن شاء اللہ العلیم آئندہ عرض معروض کی جائے گی، ہاں اتنی بات یہیں صاف ہو جانی ضروری ہے کہ جو چیزیں "نقلِ صحیح" کا مصداق ہیں: مذہب میں مقصودِ اصلی تو یقیناً وہی ہیں، مگر ان مقاصد تک پہنچنے کے جو جائز اور مشروع ذرائع ہیں، سبب اور وسیلے کی حیثیت سے وہ بھی مطلوب اور مقصود ہو جاتے ہیں۔

اور رہا علم کا تیسرا موضوع: "کائنات اور نظامِ کائنات کی معرفت"، تو یہ اپنی ذات کے اعتبار سے ہمارے مقصد تخلیق کے لیے راست طور پر مفید اور معاون نہیں، البتہ بالواسطہ اِس کو بھی اصل مقاصد کا کسی حد تک وسیلہ اور ذریعہ بنایا جا سکتا ہے؛ بشرطیکہ اصل مقصود کے حصول اور اَدائیگی میں رکاوٹ نہ بنے۔

پھر جس طرح کمپنی کے ملازمین میں، اصل معیارِ خوبی و تحسین اپنے اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی ہوتی ہے، نہ کی امور مفوضہ سے غافل رہ کر، دوسرے کاموں میں دلچسپی اور دخل اندازی، اسی طرح، بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ ایک انسان کا کمال یہ ہے کہ وہ اِس دنیا میں آ کر صرف اور صرف اپنے خالق و مالک کو پہچاننے اور اپنے اوپر اُس کے حقوق کو جاننے، اور اُن کو ادا کرنے کی فکر اور کوشش کرے۔

اگر وہ یہ فرض بقدر استطاعت ادا کر رہا ہے، تو وہ اپنی زندگی میں پوری طرح

ہے کامیاب وکامران اور بامراد ہے، اور اگر اِس فریضے کی ادائیگی میں اُس سے کوتاہی ہورہی ہے، تو وہ کچھ بھی کررہا ہو، جتنی بھی صلاحیتوں کا مالک ہو، سب بے کار، بے اعتبار اور بے فائدہ ہیں: ﴿والعصر، إن الإنسان لفي خسر، إلا الذين آمنوا وعملوا الصالحات......﴾۔

۶۔ علم کی شرعی وغیر شرعی تقسیم:

جب معلومات وموضوعات کے اعتبار سے ''علم'' کی اقسام اور ان میں فرقِ مراتب کا اِثبات ہوگیا، تو یہیں سے ''علم'' کی شرعی اور غیر شرعی تقسیم کا مسئلہ بھی صاف ہوگیا، کہ جو چیزیں شریعت میں جس درجہ میں مطلوب ہوں گی اُن کا ''علم'' بھی اُسی درجہ میں مطلوب ہوگا، اور جو چیزیں جس حد تک ناپسندیدہ اور مذموم ہوں گی، اُسی حد تک اُن کا ''علم'' بھی ناجائز اور ممنوع ہوگا۔

جن معلومات کا تعلق اللہ ورسول اور شریعت سے ہوگا، اُن کا ''علم'' شرعی کہلائے گا، اور اللہ ورسول کے نزدیک اُن کا خصوصی مقام ومرتبہ ہوگا، اور جن کا تعلق ان سے نہ ہوگا تو اُن کا ''علم'' شرعی نہ کہلائے گا، اور اُن کا وہ مقام ومرتبہ نہ ہوگا جو اُن سے وابستہ علوم کا ہے، جن چیزوں کا تعلق صرف کھانے، کمانے اور مادی ترقیات سے ہوگا، اُن کا ''علم'' دنیوی علم کہلائے گا، اور جن امور کا تعلق اللہ کی معرفت، رسول کے اتباع، فکرِ آخرت اور احکامِ دین سے ہوگا، اُن کا ''علم'' دینی علم کہلائے گا۔

۷۔ شرعی علم:

اُب صرف یہ دیکھنا ہے کہ ہمارے علمی دائرۂ کار کی کون سی چیزیں ''شریعت'' کے نزدیک مطلوب ہیں؟ کون سی چیزیں نہیں؟ اور جو مطلوب ہیں وہ کس درجہ میں؟ اور اس کا سب بڑا معیار خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی اور آپ کی حیاتِ طیبہ

ہے، کہ آپ نے اپنی ذاتِ مبارکہ کے لیے اور اپنے تربیت یافتہ اصحابؓ کے لیے کون سے موضوعات اور اُن کے ''علم'' کا اِنتخاب فرمایا؟ آیتِ کریمہ: (البقرۃ: ۱۵۱) ﴿ويعلمكم ما لم تكونوا تعلمون﴾ (اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم تمھیں وہ علوم سکھاتے ہیں جو تم نہیں جانتے تھے) میں کس چیز کا علم تھا جو صحابہؓ خود نہیں جانتے تھے، رسول کے واسطے ہی سے اُنھوں نے سیکھا؟

کون سے ایسے علوم اُنھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھ لیے تھے کہ قرآن کریم اپنے اِس فرمان میں اُنھیں ''اہل علم'' کہہ رہا ہے: (محمد: ۴۷۱۲) ﴿حتى إذا خرجوا من عندك قالوا للذين أوتوا العلم ما ذا قال آنفاً﴾ (حتیٰ کہ یہ منافقین جب آپ کی مجلس سے نکلتے ہیں تو ''اہل علم'' سے پوچھتے ہیں کہ ابھی آپ کیا فرما رہے تھے؟)۔

دورِ صحابہؓ میں حجاز وشام سے لے کر عراق وایران، افریقہ وافغان تک کن مسائل وموضوعات کو محورِ زندگی بنایا گیا، اور کن چیزوں کے ''علوم'' کی درسگاہیں قائم کی گئیں؟ سورۂ عنکبوت (۴۹) ﴿بل هو آيات بينات في صدور الذين أوتوا العلم﴾ (بلکہ یہ (قرآن) ایسی روشن آیات ہیں جو اہل علم کے سینوں میں محفوظ ہیں) میں کن لوگوں کے سینوں کو ''اہل علم'' کا سینہ کہا جا رہا ہے؟

قرآنِ کریم میں جابجا ﴿فما اختلفوا إلا من بعد ما جاء هم العلم﴾ (اہلِ کتاب ''علم'' ہوتے ہوئے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اختلاف کر رہے ہیں) کا مضمون وارد ہوا ہے؟ آخر وہ کون سا علم تھا جس کے ہوتے ہوئے رسول کو نہ پہچان پانا حیرت کی بات تھی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہود ونصاریٰ کے طریقہ سے بچنے کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا جا رہا ہے: (البقرۃ: ۱۲۰) ﴿ولئن اتبعت أهواء هم بعد الذي جاءك من العلم مالك من الله من ولي ولا نصير﴾ (اگر علم آجانے کے

باجود آپ اُن کی خواہشات پر چلے تو اللہ سے بچانے والا نہ آپ کا کوئی دوست ہوگا نہ کوئی مددگار)؛ اِس طرح کی آیات میں یہود ونصاریٰ کے طریقوں سے بچانے کے لیے کون سے ''علم'' کے آنے نہ آنے سے آپ کو مجوج کیا جارہا ہے؟

اِس کے برخلاف "أعلمكم بالله أنا" (بخاري: ۲۰، ومسلم: ۱۱۱۰) (اللہ کا علم سب سے زیادہ میں رکھتا ہوں) کا ارشاد فرمانے والی ذات کی طرف سے "أنتم أعلم بأمرِ دنيا كم" (مسلم: ۲۳۶۳) (اپنی دنیا کے معاملات تم زیادہ جانتے ہو) میں کون سے ''علم'' کا اِنکار ہورہا ہے؟

تمدنی اور اقتصادی ترقیات کے شعبے قائم کرنے کا ذکر، علاج معالجہ اور سائنسی علوم کا باقاعدہ تذکرہ (مقصود کے درجے میں) قرآن وحدیث میں کہیں نہیں ملتا، قرآنِ کریم میں دنیوی زندگی سے متعلق فرمایا گیا تو کیا؟

(الحدید: ۲۰) ﴿اعلموا أنما متاع الحياة الدنيا لعب ولهو وزينة وتفاخر بينكم وتكاثر في الأموال والأولاد، كمثل غيث أعجب الكفار نباته، ثم يهيج فتراه مصفراً، ثم يكون حُطاماً، وفي الآخرة عذاب شديد، ومغفرة من الله ورضوان، وما الحياة الدنيا إلا متاع الغرور﴾

(یادرکھو! دنیوی زندگی کا حاصل تو صرف کھیل کود، زیب وزینت، آپسی تفاخر، اور مال واولاد میں ایک دوسرے سے تقابل ہے، جیسے بارش کہ اُس سے ہونے والی پیداوار شروع میں کاشتکاروں کو بڑی اچھی لگتی ہے، پھر جب خشک ہوجاتی ہے تو زرد دکھائی دینے لگتی ہے، اور انجام کار وہ بالکل ہی چورا (اور بے فائدہ) ہوجاتی ہے۔ اِسی طرح دنیا کی زندگی چندروزہ بہار ہے، اُس کے بعد زوال واضمحلال۔، اور آخرت میں یا تو (کفر کی وجہ سے ہمیشہ ہمیش کے لیے) عذابِ شدید کا سامنا کرنا پڑے گا، یا (ایمان کی بدولت دائمی طور پر) اللہ کی طرف سے معافی اور خوشنودی مل جائے گی، مگر دنیوی زندگی تو دھوکہ

کے سوا کچھ نہیں ہے)۔

تو ایسی بے وقعت جگہ رہنے کا گُر سیکھنے کو، اور ایسی معمولی چیز کی حصول یابی کے ذریعہ کو "علم" کہنا لغتاً تو درست ہوسکتا ہے، مگر عرفاً اور اصطلاحاً یہ وضع الشيء في غير محله ہے۔

قارون کے قصہ میں قرآنِ کریم نے اِس مضمون کو کس لطیف پیرایہ میں بیان فرمایا ہے: (القصص:۷۹-۸۰) ﴿فخرج على قومه في زينته قال الذين يريدون الحياة الدنيا يا ليت لنا مثل ما أوتي قارون إنه لذو حظ عظيم، وقال الذين أوتوا العلم ويلكم، ثواب الله خير لمن آمن وعمل صالحاً، ولا يلقاها إلا الصابرون﴾

(قارون لوگوں کے سامنے اپنی آن بان کے ساتھ نکلا، تو دنیوی زندگی کے طالبین، حسرت بھرے انداز میں بولے: اے کاش! ہمیں بھی ایسی ہی زندگی نصیب ہوجاتی، یہ تو بڑے نصیبے والا ہے، مگر جو لوگ "علم" کی دولت سے سرفراز کیے گئے تھے اُنھوں نے کہا: تم پر افسوس ہے، اللہ کی طرف سے ملنے والا ثواب (بشکلِ جنت) اُن لوگوں کے لیے کہیں بہتر ہے جو ایمان رکھتے ہیں اور نیک اعمال کرتے ہیں، اور یہ جنت نہیں ملے گی مگر -دنیا کی آلائشوں سے- صبر کرنے والوں ہی کو)۔

۸-علم دین اور علم دنیا کا فرق:

لہٰذا ہر زمانے کے ایسے مباح عصری فنون جن سے لوگوں کی روز مرہ کی ضروریات وابستہ ہوں؛ اُن کی اپنی جگہ ضرورت واہمیت، اور اِس وجہ سے اُن کے سیکھنے کا جواز، اور ترغیب (بلکہ فرض کفایہ کے طور پر وجوب بھی)، یہ ایک الگ مضمون ہے، جو معقول بھی ہے، اور قابلِ قبول بھی، بلکہ اگر اُن کو انسان کے مقصدِ تخلیق سے ہم آہنگ کرکے معرفتِ خداوندی کا ذریعہ، علومِ شرعیہ کی تحصیل اور اعمال صالحہ کی انجام دہی کا وسیلہ، اور

خدمتِ خلق اور نصحِ اِنسانیت کا آلہ بنالیا جائے تو یہ ایک حدتک مطلوب اور محمود بھی ہے۔

مگر ان فنون کو ''علم'' کہہ کر پیش کیا جائے، اور اِس کے پس پردہ ''علم'' کے شرعی مفہوم میں خلط کر کے، شرعی اور غیر شرعی، دینی اور دنیوی تقسیم، اور ان کے مابین فرقِ مراتب کا انکار کیا جائے، یہ ایک خطرناک خلط و تلبیس ہے۔

لہٰذا بنیادی طور پر اتنا ''علم دین'' حاصل کرنا ہر اِنسان، خصوصاً مسلمان پر شرعاً اور عقلاً فرضِ عین ہے، جس سے وہ اپنے خالق و مالک کو پہچان سکے، اور اپنے مقصد تخلیق سے واقف ہو کر، ہر مرحلۂ حیات کے متعلقہ فرائض کو جان سکے۔

اس کے برخلاف انفرادی و اجتماعی ضرورتوں کے لیے مفید اور ضروری دنیوی علوم کا حاصل کرنا فرضِ کفایہ ہے، جس کے لیے ہر دور اور ہر علاقہ میں زراعت، تجارت، طبابت، اور حرفت وصنعت وغیرہ مباح فنون کے جاننے اور اپنانے والوں کا اتنی تعداد میں ہونا ضروری ہے جس سے اُس زمانہ اور اُس علاقہ کے لوگوں کی بشری ضروریات پوری ہوسکیں۔

اور یہ چیز چونکہ انسان کے فطری تقاضوں کا حصہ ہے، اس لیے ہمیشہ سے یہ سلسلہ بغیر کسی ترغیب و تحریض کے دنیا میں چلا آرہا ہے، اس کے لیے نہ کسی نبی کی ضرورت ہے، نہ پیغامبر یا ریفارمر کی، اس بارے میں شریعت کا کردار صرف اتنا ہے کہ کوئی بھی انسان اپنے جذباتی تقاضوں یا عقلی فیصلوں کی بنا پر اپنی معاشی ضرورت یا دنیوی ترقی کے لیے جو قدم اٹھانا چاہتا ہے، وہ یہ دیکھ لے کہ اُس کا یہ قدم اللہ و رسول کی مرضی کے مطابق، اور شرعی دائرے کے اندر ہے یا نہیں؟ اور اُس کا یہ مشغلہ مقصد تخلیق (عبادتِ خالق اور طاعت رب) کی طرف توجہ میں مخل اور حارج تو نہیں ہو رہا ہے؟ اور بس۔

۹-:علم نافع اور غیر نافع:

گذشتہ تفصیلات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ معلومات کے اعتبار سے علم کی دو

قسمیں ہیں: ایک شرعی علم، ایک غیر شرعی علم، اُس کے بعد یہ بات بھی بطورِ خاص جاننے کی ہے کہ شرعی علم میں بھی نافع اور غیر نافع کی تقسیم ہے، جس علم کے نتیجہ میں اللہ کا خوف اور خشیت پیدا ہو، تقوی حاصل ہو، عمل کی توفیق ہو، وہ تو ہے ''علمِ نافع''، حدیث میں اُس کی دعا سکھائی گئی ہے: (ابن ماجہ) اللّٰهم إني أسألك علماً نافعاً وعملاً متقبلاً۔

اور جس علم سے دوسروں کو مرعوب کرنے، اور اپنی دھاک بٹھانے کا شوق پیدا ہو، اپنے گناہوں کی تاویل کا موقع ہاتھ لگے، وہ ہے ''غیر نافع'': (ترمذی وابن ماجہ) ''من طلب العلم ليجاري به العلماء، أو ليماري به السفهاء، أو يصرف به وجوه الناس إليه؛ أدخله اللّٰه النار'' (جو شخص علماء سے مناظرہ اور مقابلہ کے لیے، یا جاہلوں پر رعب بٹھانے کے لیے، یا لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے ''علم'' حاصل کرے، اللہ تعالیٰ اُس کو دوزخ میں ڈالیں گے)، ایسے علم سے پناہ مانگی گئی ہے: (مسلم) اللّٰهم إني أعوذ بك من علم لا ينفع، ومن قلب لا يخشع۔ بقولِ سعدیؒ:

علمے کہ رہ بحق نماید، جہالت است

(جو علم راہِ حق نہ دکھائے وہ جہالت ہے)

علم چنداں کہ بیشتر خوانی چوں عمل در تو نیست نادانی

(علم جتنا بھی حاصل کرلو، اگر عمل نہیں ہے تو تم جاہل ہی مانے جاؤگے)

امام شافعیؒ کا مشہور قطعہ ہے:

شكوت إلى وكيع سوء حفظي

فأرشدني إلى ترك المعاصي

فإن العلم نور من إله

ونور اللّٰه لا يُعطى لعاص

(میں نے اپنے استاذ امام وکیعؒ سے حافظے کی کمزوری کا ذکر کیا، تو حضرت نے

ترکِ معاصی کے اہتمام کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرمایا: کہ علم اللہ کی طرف سے ملنے والا ایک نور (اور روشنی) ہے، اور اللہ کا نور اُس کے نافرمانوں کو نہیں دیا جاتا)
جیسے کہ دنیوی حکومتیں اپنے باغیوں کو بجلی (روشنی) اور پانی وغیرہ کی سہولیات نہیں فراہم کرتیں!

۱۰-: عالم کون؟

اَب تک کے بیان سے "علم" کی حقیقت بھی عیاں ہوگئی اور شریعت میں مطلوب علم کی تعیین بھی ہوگئی، اس کے بعد اگر کوئی یہ سوال کرے کہ اسلام میں "عالم" کس کو کہا جاتا ہے؟ تو جواب واضح ہے کہ جس کو ایسا "علم" حاصل ہو جو شریعت میں بالذات اور براہِ راست مطلوب ہے، اور وہ ہے "مذہبی علم"، نہ کہ معاشی، تمدنی، اقتصادی اور سائنسی علوم، جو کہ محمود ہونے کے باوجود مقصود اور مقصد تخلیق سے راست طور پر ہم آہنگ نہیں ہیں۔

۱۱-: عالمِ دین کے وظائف:

"دین" اور "مذہب" کوئی خانہ ساز چیز تو ہیں نہیں، یہ تو اللہ احکم الحاکمین کے اوامر ونواہی اور اَحکام وفرامین کے اُس مجموعے کا نام ہے جو حضراتِ انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ذریعے بندوں کے پاس بھیجا جاتا ہے، لہٰذا دین ومذہب کی حقیقت متعین کرنے کے لیے، پھر اُس کو اختیار کرنے کا طریقہ اور اُس پر عمل کرنے کی صورت معلوم کرنے کے لیے، حضراتِ انبیاء علیہم السلام کی سیرتوں کا سامنے ہونا ضروری ہے، اور یہ پتہ ہونا ضروری ہے کہ انبیاء کا مقصد بعثت کیا ہوتا ہے؟ وہ اپنی حیاتِ طیبہ میں کس چیز کی طرف دعوت پر مامور ہوتے ہیں؟ اور پھر اُن کے جانشینوں کی اصل ذمہ داری اور فرضِ منصبی کیا قرار پاتا ہے؟

اِسلام میں "جانشینی" کسی منصبِ افتخار وتفاخر کا نام نہیں، بلکہ یہ ایک ذمہ داری اور مسؤولیت کا نام ہے، اِس لیے جو شخص بھی انبیائے کرام علیہم الصلاۃ والسلام کے مقاصد

بعثت اور وظائفِ حیات کو سامنے رکھتے ہوئے، اُصولِ صحیحہ کے مطابق دین کی خدمت اَنجام دے گا، وہ ''وارثِ انبیاء'' کہلائے گا، اَب دیکھنا یہ ہے کہ قرآن مجید نے انبیاء (خصوصاً خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہم وسلم) کے مقاصد بعثت کیا شمار کرائے ہیں؟

۱: قرآنِ کریم میں ایک جگہ ارشاد ہے: (النحل: ۱۲۵) ﴿ادع إلى سبيل ربک بالحكمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتي هي أحسن﴾ (اپنے رب کے راستے کی طرف لوگوں کو دعوت دیجیے حکمت کی باتوں، اور اچھی نصیحتوں کے ذریعے، اور –ضرورت پڑنے پر– اُن سے اچھے انداز میں مباحثہ بھی فرمایئے)۔

۲: دوسری جگہ یہ ارشاد ہے: (آل عمران: ۱۶۴) ﴿يتلو عليهم آياته ويزكيهم ويعلمهم الكتاب والحكمة﴾ (یہ رسول اُن کے سامنے قرآن کی تلاوت کرتے ہیں، اُن کے نفوس کا تزکیہ کرتے ہیں، اور کتاب وحکمت کی انھیں تعلیم دیتے ہیں)۔

۳: ایک اور جگہ یہ ارشاد ہے: (الأعراف: ۱۵۷) ﴿يأمرهم بالمعروف وينهاهم عن المنكر ويحل لهم الطيبات ويحرم عليهم الخبائث ويضع عنهم إصرهم والأغلال التي كانت عليهم ......﴾ (یہ رسول انھیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہیں، حلال چیزوں کی حلت بتلاتے ہیں، حرام چیزوں کی حرمت واضح کرتے ہیں، اور (معاشرے کی رسوم وبدعات کا، یا پہلی امتوں کے سخت احکام کا) جو بوجھ اور طوق اُن پر مسلط ہے اُس کو اُن سے دور کرتے ہیں......)۔

۴: ایک اور موقع پر یہ فرمان ہے: (المائدۃ:) ﴿يا أيها الرسول بلغ ما أنزل إليک من ربک﴾ (اے رسول! آپ کے رب کی طرف سے آپ پر جو کچھ نازل کیا گیا ہے، وہ آپ دوسروں تک پہنچا دیں)۔

معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہم وظائف میں سے: (۱) دعوت الی اللہ (۲) تلاوتِ قرآن (۳) تعلیمِ کتاب وحکمت (۴) تزکیہ نفوس وتربیتِ اخلاق

(۵) علمی مباحثہ ومناظرہ (۶) امر بالمعروف (۷) نہی عن المنکر (۸) حلت وحرمت کے مسائل (۹) ردّ رسوم وبدعات اور (۱۰) اَحکام دین کی تبلیغ واشاعت جیسے امور ہیں، لہٰذا اقتداءً اور اتباعاً ایک امتی خصوصاً ''عالم دین'' کے بھی یہی وظائف ہونے چاہئیں۔

جاننے والے جانتے ہیں کہ الحمد للہ قدیم طرز کے مدارسِ اسلامیہ کا نصاب ونظام، بحیثیتِ مجموعی اِسی محورِ فکر پر مبنی ہے، جس میں تفسیر، حدیث اور فقہ کی کتابوں کے ذریعے: موت سے لے کر حیات تک، طہارت سے لے کر میراث تک، اور ذاتیات سے لے کر اجتماعیات تک کے سارے احکامِ دین پڑھے پڑھائے، اور دوسروں تک پہنچائے جاتے ہیں، اور امت کی دینی ہدایت ورہنمائی کے تعلُّق سے جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا گیا ہے سب کی ''تبلیغ'' کی جاتی ہے۔

۱۲-: فضیلتِ علم سے متعلق دو حدیثیں:

ا: علم کی ضرورت واہمیت کے سلسلے میں ایک حدیث زباں زد عام وخاص ہے:

''طلب العلم فریضة علی کل مسلم'' (علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے)، اِس کی تخریج ابن ماجہ (رقم: ۲۲۴) وغیرہ محدثین نے کی ہے، یہ مجموعۂ طرق کے اِعتبار سے ''حَسَن'' کے مرتبے کی ہے، کچھ لوگ اِس کے آخر میں ''ومسلمة'' کا اِضافہ کردیتے ہیں جو محدثین کے نزدیک روایت کے اعتبار سے بے اصل ہے۔

اِس حدیث میں ''العلم'' سے مراد: علم دین ہے، جیسا کہ ''علم'' پر داخل ہونے والا ''الف ولام'' اِس پر دلالت کر رہا ہے، اِس لیے کہ اگر اِس کو اِستغراق کا مانا جائے تو مطلب ہوگا کہ تمام علوم کا حاصل کرنا ہر ہر مسلمان پر فرض ہے، ظاہر ہے کہ یہ ایک ناممکن العمل فریضہ ہے، جو شریعت کے اصول: (البقرۃ: ۲۸۶) ﴿لا یکلف اللہ نفساً إلا وسعها﴾ کے خلاف ہے، اور اگر جنس کا مانا جائے تو مطلب ہوگا کہ مطلق کسی بھی علم کا حاصل کرنا فرض ہے، حالاں کہ جب تک شریعت کے فرائض کا علم نہ ہو اُس وقت تک

تحصیلِ علم کا فریضہ پورا ہی نہیں ہوسکتا، لہٰذا یہ الف ولام: عہد اور تخصیص کا ماننا متعین ہے، اور وہ مخصوص علم وہی فرض ہوگا جو شریعت کے فرض کردہ اعمال سے متعلق ہوگا۔

لہٰذا جو اعمال فرضِ عین ہیں، اُن کا علم بھی فرضِ عین ہوگا (اور یہی اِس حدیث کی مراد ہے، جیسا کہ ''کل مسلم'' اِس پر نص ہے)، اور جو اعمال فرضِ کفایہ ہیں اُن کا علم بھی فرضِ کفایہ ہوگا، اور جو فنون مباح ہیں اُن کو سیکھنا اور جاننا بھی مباح ہوگا، اور جو چیزیں ناجائز اور ممنوع ہیں اُن کی تحصیل بھی ممنوع ہوگی۔

جب یہ بات ثابت ہوگئی، تو یہ مضمون بھی سمجھ لینا چاہیے کہ جو لوگ اِس حدیث کو ''علم دین'' کے بجائے، ''دنیوی علوم'' کے لیے پڑھتے، لکھتے، یا بیان کرتے ہیں، وہ تحریفِ نصوص اور تبدیلِ دین کے مرتکب ہوتے ہیں، جو انتہائی سنگین جرم ہے۔

۲: ایک اور جملہ بطور حدیث کے مشہور بین العوام ہے: ''اطلبوا العلم ولو بالصین'' (علم حاصل کرو خواہ چین جا کر)، پہلی بات تو یہ کہ یہ جملہ حدیث کے طور پر ثابت ہی نہیں ہے، جیسا کہ محدثین نے اِس کی صراحت کی ہے، دوسری بات یہ کہ اِس میں بھی ''العلم'' الف ولام کے ساتھ ہے، اگر یہ حدیث ہوتی تو بھی مطلب یہی ہوتا کہ علم دین حاصل کرو چاہے اُس کے لیے جتنا طویل اور پر مشقت سفر کرنا پڑے، جیسا کہ سلفِ صالحین نے ایک ایک مسئلے اور ایک ایک حدیث کی تحقیق کے لیے سیکڑوں میل کے اسفار کیے، حالاں کہ اُس وقت موجودہ سفری سہولیات کا بھی تصور نہیں تھا۔

اور اِس جملے کے تحت یہ کہنا کہ اُس زمانے میں ملکِ چین میں چونکہ علمِ دنیا ہی تھا، اِس لیے اِس سے دنیوی علوم کی اہمیت کا ثبوت ہو رہا ہے، انتہائی درجے کی بد فہمی ہے، اِس لیے کہ اگر یہ مقصود ہوتا تو ''ولو'' (اگرچہ) کا اِضافہ کیوں کیا جاتا؟ اور اگر یہی مقصود تھا تو صحابہؓ نے (اور اُن کے بعد تابعین وتبع تابعین نے) اِس پر عمل کیوں نہیں کیا؟ کوئی ایک صحابی تو ''دنیوی علوم'' اور ''کائناتی نظام'' کے علوم سیکھنے نکلا ہوتا۔

علم کے سلسلے میں شاؔز کے بعض تلبیسی مغالطات کا اِزالہ:

(ا) امید کہ گذشتہ معروضات سے ''علم'' کے شرعی مفہوم، اور اُس کی شرعی اور غیر شرعی تقسیم کے سلسلہ میں دیئے جانے والے اِس طرح کے مغالطات کا اِزالہ ہو گیا ہو گا:

پہلا مغالطہ:

ا: ''علوم کی شرعی اور غیر شرعی تقسیم اَصحابِ فن کا اِنفرادی فیصلہ تھا، جس کے لیے وحیِ ربانی سے کوئی دلیل نہیں لائی جا سکتی، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ علوم جو شرعی قرار دیئے گئے؛ قرآن مجید کی روشنی میں اُن کا شرعی ہونا بھی محلِ نظر ہے (!!) کسی مخصوص عہد کے اصحابِ فن کے التباسِ فکری کو مستقبل کی تمام نسلوں کے لیے سدِراہ اور حجت قرار نہیں دیا جا سکتا''۔ (مسلم ذہن کی تشکیلِ جدید، ص ۱۳۵، از: راشد شاز)۔

۲: ''البتہ یہ خیال کہ یہ حضرات حاملینِ علوم نبوت ہیں، ان کا علم علمِ شرعی ہے اور یہ وارثینِ انبیاء ہیں، یہ وہ خیالات ہیں جن کی بازگشت کم از کم ابتدائی دو صدیوں کے دوران نہیں سنائی دیتی، مسلمانوں میں جب یونانی علوم کے زیرِ اثر کلامی بحثوں کا سلسلہ چل نکلا اور جب اِس صورتِ حال نے ایک دانشورانہ انارکی کی کیفیت پیدا کر دی تب پہلی بار یہ سوال ہمارے لیے اہمیت اختیار کر گیا کہ کون سے علوم واقعتاً مفید ہیں اور کن علوم کو لائقِ استراد (استرداد؟) سمجھنا چاہیے......''۔ (ص ۱۳۱)

۳-: ''موجودہ علومِ اسلامیہ جنہیں ہم آج تفسیر و تاویل، جرح و تعدیل، روایت و درایت، اصول الفقہ، منطق و فلسفہ اور عروض و بلاغت سے موسوم کرتے ہیں، یہ علوم اپنی موجودہ شکلوں میں عہدِ رسول میں نہیں پائے جاتے تھے''۔ (ص ۱۳۴)

محولہ بالا سطور میں سے بعض باتیں تو كلمة حق أريد بها الباطل کا مصداق ہیں، اور زیادہ تر باتیں شاؔز کی بکواس اور ایجادِ بندہ ہیں:

۱: گذشتہ سطور میں بتوفیقہ تعالیٰ علم کی حقیقت، اُس کی اقسام اور اُن میں فرقِ مراتب، پھر علم کی شرعی اور غیر شرعی تقسیم کے سلسلے میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے، مضمون نگار کی یہ باتیں یا تو اُن تفصیلات سے جہل پر مبنی ہیں، یا دجل و تلبیس کا مظہر ہیں۔

۲: جب اِسلام کی ابتدائی دو صدیوں میں مسلمانوں کے درمیان قرآن، حدیث اور فقہ کے حلقوں کے ذریعہ قال اللّٰہ و قال الرسول، اور یجوز و لا یجوز کے علاوہ کسی اور ''علم'' کا رواج ہی نہ تھا، اور علومِ شرعیہ کے علاوہ کسی اور علم و فن سے عمومی اشتغال ہی نہ تھا؛ تو اُس وقت شرعی اور غیر شرعی کی بحث کی نوبت کہاں سے آجاتی؟

۳: جب اصطلاحات مقرر کرکے، ہر فن کی مستقل کتابیں لکھنے کا چلن ہی نہ تھا تو مذکورہ بالا اصطلاحی علوم کہاں سے آجاتے؟

۴: جب کسی حدیث کی روایت کے لیے ''سلسلۂ سند'' ہی نہ تھا، بلکہ ایک دو واسطوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے انتساب ہو جاتا تھا؛ تو جرح و تعدیل کا سوال ہی کہاں پیدا ہو سکتا تھا؟ جب گمراہ افراد اور منحرف جماعتوں کا زور ہی نہیں تھا، تو اُن کے فکری اور عملی توڑ کی ضرورت ہی کیا تھی؟ پھر روافض کے ذریعے ایرانی فتنوں کے آنے، خوارج کے ذریعے عراقی فتنوں کے داخل ہونے، اور معتزلہ کے ذریعے عقل پرستوں کے سر ابھارنے کے بعد ہی اِس طرح کے تحفظات اور حفاظتی انتظامات کی ضرورت محسوس کی گئی۔

چنانچہ جیسے جیسے اِس طرح کے زہر اور جراثیم امت کے درمیان پھیلتے گئے، ویسے ویسے اُن کے تریاق اور علاج علمائے امت دریافت کرتے گئے، اِس آخری دور میں اگر نیچریوں اور تجدد پسندوں کی تحریفات و تلبیسات سامنے نہ آئی ہوتیں تو شاید اہلِ حق کی طرف سے ''بیان القرآن''، ''سیرۃ المصطفیٰ''، ''اسلام اور عقلیات''، ''احکامِ اسلام عقل کی نظر میں''، ''مذہب اور سائنس'' اور ''حجیت حدیث'' جیسی کتابیں وجود میں نہ آتیں،

لکل فرعون موسی تو مشہور ہی ہے۔

دوسرا مغالطہ:

سیکولر ایجوکیشن (لامذہبی نظام تعلیم) کے ماحول میں غلط بیانی اتنی آسان ہوگی؛ مجھے اِس کا بالکل اندازہ نہیں تھا، شاؔز نے کتنی ڈھٹائی کے ساتھ یہ خلاف واقعہ بات لکھی ہے:

”علوم شرعیہ کی اصطلاح جس نے ہمارے ہاں دینی اور دنیوی علوم کی ثنویت کے غیر قرآنی تصور کو عام کرنے میں اہم رول انجام دیا ہے، اس کے ذکر سے قرآن وحدیث کے صفحات خالی ہیں، ابوعبداللہ الکاتب الخوارزمی (المتوفی ۳۸۷ھ) نے پہلی مرتبہ علومِ شرعیہ کی اصطلاح استعمال کی، جس نے آگے چل کر وارثین علوم نبوت کا ایک حلقہ پیدا کردیا“ (متحدہ اِسلام کا منشور ص ۲۷)۔

حالاں کہ خوارزمی سے تقریباً دو سو سال قبل اِمام شافعیؒ (ت: ۲۰۴ھ) نے اپنے ایک شعر میں فرمایا ہے (دیوان الشافعی ص ۱۱۸، وطبقات الشافعیۃ الکبریٰ ۱: ۲۹۷):

كل العلوم سوى القرآن مشغلة

إلا الحديث وإلا الفقه في الدين

العلم ما كان فيه ”قال: حدثنا“

وما سوى ذاك وسواس الشياطين

(قرآن، حدیث اور فقہ کے علاوہ تمام علوم وقت ضائع کرنے والے ہیں، علم تو وہی ہے جس میں ”قال: حدّثنا“ کہا جاتا ہو، اور اس کے سوا سب چیزیں شیطانی وساوس ہیں)۔

اور اِمام شافعی سے بھی پچاس سال پہلے کے معروف اِمام اوزاعیؒ (ت: ۱۵۷) کا مقولہ مشہور ہے (جامع بیان العلم وفضلہ لابن عبدالبر ۱: ۷۶۹): **العلم ما جاء عن أصحاب محمد صلى الله عليه وسلم، وما لم يجىء عن واحد منهم فليس بعلم** (علم وہ ہے جو صحابہ سے منقول ہو، اور جو باتیں اُن سے منقول نہ ہوں وہ علم

کہے جانے کے لائق نہیں)۔

اور پہلی صدی ہجری کے معروف تابعی اِمام محمد بن سیرینؒ (ت: ۱۱۰ھ) کا یہ قول بھی مشہور ہے (کما في مقدمة مسلم): إن هذا العلم دين، فانظروا عمن تأخذون دينكم (یہ "علم" دِین ہے، لہٰذا جس سے علم سیکھنا ہو پہلے اُس کا کیرکٹر دیکھ لیا کرو)۔

خلیفۂ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ (ت: ۱۰۱ھ) کا یہ جملہ "صحیح بخاری" میں تعلیقاً اور "موطأ محمد" میں سنداً مروی ہے: انظر ما كان من حديث رسول الله صلى الله عليه وسلم فاكتبه، فإني خفت دروس العلم وذهاب العلماء (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث تلاش کر کر کے لکھو، ورنہ مجھے "علم" کے ضائع ہو جانے اور علماء کے ختم ہو جانے کا اندیشہ ہے)۔

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ "سنن ابوداود" (۲۸۸۵) اور "سنن ابن ماجہ" (۵۴) کی روایت میں مرفوعاً مروی ہے: "العلم ثلاثة، وما سوى ذلك فهو فضل: آية محكمة، أو سنة قائمة، أو فريضة عادلة" (اصل علم تو تین ہیں، اُن کے علاوہ علوم اِضافی ہیں: قرآنی آیات، حدیثی روایات اور میراث کے مسائل)۔

تیسرا مغالطہ:

قرآنِ کریم کی لفظی تحریف کی کوششیں کرنے والے تو علماءِ حق کی بدولت اپنے منہ کی کھا گئے، مگر معنوی تحریف کی سعیٔ مذموم ابھی جاری ہے:

۱: اسی کا نمونہ ہے کہ: (فاطر: ۲۸) ﴿إنما يخشى الله من عباده العلمٰؤا﴾ (اللہ سے صحیح معنوں میں اہلِ علم ہی ڈرتے ہیں) کے اِس ارشادِ ربانی کو معہود ومتبادر "اہلِ علم" کے بجائے، آج کل اُن سائنس دانوں پر منطبق کیا جا رہا ہے جو اللہ سے ڈرتے تو کیا، اُس پر ایمان بھی نہیں رکھتے، حالاں کہ اِس سے ذرا قبل موجود (فاطر: ۱۸)

﴿إنما تنذر الذين يخشون ربهم بالغيب وأقاموا الصلوة﴾ (اے نبی! آپ تو بس اُن لوگوں کو اِنذار فرمائیں جو اپنے رب سے بِن دیکھے ڈرتے ہیں، اور نماز قائم کرتے ہیں)۔

یہ اِرشاد صاف بتا رہا ہے کہ یہاں ''العلماء'' سے کون سا طبقہ مراد ہے، اور ''العلماء'' میں الف ولام کون سا ہے، ظاہر ہے کہ ''خشیت'' (ڈرنا) ''اِنذار'' (ڈرانے) کا نتیجہ ہوتی ہے، اور اِنذار کا حکم بن دیکھے ڈرنے والوں کے لیے ہے، تو پھر وہی لوگ اصل صاحبِ ''خشیت'' ٹھہریں گے۔

پھر آیت مذکورہ سے متصلاً بعد بھی تلاوتِ آیات کرنے والوں، نماز پڑھنے والوں اور اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے والوں کا تذکرہ ہے، جو ''العلماء'' کے متعین مصداق کو مزید مؤکد کر رہا ہے: (فاطر:۲۹) ﴿إن الذين يتلون كتاب الله وأقاموا الصلاة وأنفقوا مما رزقناهم سراً وعلانيةً يرجون تجارةً لن تبور﴾۔

اِس کے برعکس اہلِ تلبیس کا اصرار ہے کہ:

''قرآن کے نزدیک حقیقی عالم وہی ہے جو اِن آیات پر غور کرے کہ آسمان سے بارش کے چند قطرے ایک ہی زمین سے مختلف رنگوں اور اقسام کے پیڑ پودے کیسے اگاتے ہیں؟ اور اِس عجیب وغریب اِنتظامِ قدرت پر اِس کا دل خشیت الٰہی سے معمور ہوجائے''۔ (مسلم ذہن کی تشکیلِ جدید، ص ۴۹، اشاعت ۲۰۰۸ء، از: راشد شاز)۔

اور ''خدا خود یہ چاہتا ہے کہ اُس کے اصحابِ علم بندے تسخیرِ کائنات کا یہ عمل جاری رکھیں، کہ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں قرآن کی زبان میں ''اصل عالم'' کہا جاسکتا ہے: ﴿إنما يخشى الله من عباده العلماء﴾......''۔ (حوالۂ بالا، ص ۳۱)۔

جب نظامِ کائنات میں تدبر وتفکر کے ذریعہ یا معجزات وبینات سے مجوج ہوکر حاصل ہونے والے اِیمان کے بالمقابل ''ایمان بالغیب'': اصل اور افضل ایمان ہے، تو پھر ''خشیت بالغیب'': آیات وعلامات کے ذریعہ حاصل ہونے والی خشیت

سے اعلیٰ وارفع کیوں نہ ہوگی؟! قرآنی فیصلہ ہے: (الملک: ۱۲) ﴿إن الــذيـن يـخشـون ربهـم بـالغيب لهم مغفرة وأجر كبير﴾ (جولوگ اپنے رب سے غائبانہ طور پر ڈرتے ہیں یقیناً اُن کے لیے مغفرت اور بہت بڑے اجر کی بشارت ہے)، کیا اُن لوگوں کا ایمان سیدنا ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ کے ایمان کے پاسنگ بھی ہوسکتا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر بے ساختہ لبیک کہنے کے بجائے، آپ کے معجزات، آیاتِ بینات اور غلبۂ اسلام سے مرعوب ہوکر اسلام میں داخل ہوئے؟!۔

چوتھا مغالطہ:

''تفقہ فی الدین'' کا مفہوم ایسا بدیہی ہے کہ اُس پر کوئی دلیل قائم کرنے کی بھی ضرورت نہ تھی، مگر شاذ کے مدرسۂ تلبیس نے ایسے بدیہی مفہوم کو بھی نظری بنادیا، ملاحظہ ہو یہ جملہ:

> ''واضح رہے کہ قرآن مجید میں لفظ ''دین'' سے مراد رسومِ عبودیت، فقہی علوم، یا نماز، روزے اور طہارت کے مسائل نہیں ہیں، بلکہ اس سے مراد خداشناسوں کا اجتماعی نظام ہے، اور کسی اجتماعی نظام کو چلانے کے لیے امورِ اجتماعیت کے ایسے ماہرین، جو دحی کی غایت سے واقف ہوں، اُن کی اہمیت سے اِنکار نہیں کیا جاسکتا، البتہ یہ کہنا کہ اِس آیت کے مخاطب موجودہ دور کے طبقۂ علماء ہیں، تو یہ دراصل قرآن مجید کی اِس آیت کا مذاق اڑانا ہے، جب یہاں ''دین'' سے مراد علماء کا مزعومہ دین نہیں تو پھر اس ''دینِ علماء'' کے ماہرین، قرآن کے مخاطب کیسے ہوسکتے ہیں'' (تشکیلِ جدید، ص ۲۷-۲۸، از: راشد شاز)۔

یہ کہنے والے نے اتنا بھی نہ سوچا کہ اِن ''متفقہ فی الدین'' حضرات کا وظیفہ کیا متعین کیا جارہا ہے: ﴿ولينذروا قومهم إذا رجعوا إليهم﴾ (کہ یہ تفقُّہ فی الدین حاصل کرنے والے، جہاد سے واپس آنے والوں کو ''اِنذار'' کیا

کریں)، اور یہ معلوم ہے کہ قرآنِ کریم میں ''اِنذار'' کس معنی میں استعمال ہوتا ہے: (مریم:۳۹) ﴿وانذرهم يوم الحسرة﴾، (اِبراہیم:۴۴) ﴿وانذر الناس يوم يأتيهم العذاب﴾ (آپ لوگوں کو اُس دن سے ڈرائیں جس دن انھیں عذاب آلے گا)، سورۂ یٰسٓ میں ہے: (یٰسٓ:۱۱) ﴿إنما تنذر من اتبع الذكر وخشي الرحمن بالغيب، فبشره بمغفرة وأجر كريم﴾ (آپ تو بس اُن لوگوں کو ڈرائیں جو قرآن کا اِتباع کرتے ہیں، اور رحمٰن سے بے دیکھے ڈرتے ہیں، آپ اُن کو گناہوں کی معافی کی اور شاندار بدلے کی خوش خبری دے دیں)۔

مگر جن کا مطمحِ نظر صرف دنیا ہی ہو جائے ظاہر ہے کہ اُن کو دین میں بھی دنیا ہی کا پہلو سمجھ میں آئے گا، قرآنِ کریم فرماتا ہے (الروم:۷): ﴿يعلمون ظاهراً من الحياة الدنيا وهم عن الآخرة هم غافلون﴾ (اِن کا مبلغِ علم صرف دنیوی زندگی کی ظاہری چمک دمک ہے، اور آخرت سے تو یہ لوگ بالکل غافل ہیں)۔

آیات اللہ فی الکون:

قرآنِ کریم میں جابجا آیات الله في الكون (کائناتی نظام) میں تدبر و تفکر کی دعوت دی گئی ہے، جس سے موجودہ سائنسی انکشافات سے مرعوب ذہنیت کے حاملین ''علم'' کا اصل مصداق ہی اسی تدبر و تفکر کو دینے لگے ہیں، حالاں کہ یہاں چند امور قابلِ توجہ ہیں:

الف: قرآن کریم میں پچاس سے زائد جگہ ﴿إن في ذلك لآيات﴾ (بے شک اُن چیزوں میں نشانیاں ہیں ...) جیسی تعبیرات استعمال کی گئی ہیں، جن میں ''آیات'' کا لفظ کہیں تو انذار اور دھمکی کے لیے آیا ہے، کہیں موعظت و نصیحت کے لیے، کہیں دلائل و براہین کے معنی میں، کہیں کسی مسئلۂ فقہی بتانے کے ضمن میں، اور کہیں کائناتی نظام میں دعوتِ تدبر کے لیے بھی۔

ب: قرآن کریم میں جن جن چیزوں میں کائناتی نظام میں غور وفکر کی دعوت دی گئی ہے وہ راقم کی تلاش کے مطابق مجموعی طور پر یہ اشیاء ہیں:

آسمانوں اور زمینوں کی پیدائش، لیل ونہار کی گردش، سطحِ آب پر کشتیوں کی روش، سمندر سے (مچھلی کی صورت میں) رزق کا انتظام، کرۂ ارضی کا ثبات، روئے زمین پر بھاری بھرکم پہاڑوں کا جماؤ، بغیر کسی سہارے کے فضا میں بادل کا اور اُس سے اوپر آسمانوں کا ٹھہراؤ، ہواؤں کا جریان، پرندوں کا طیران، دریاؤں اور نہروں کا سلسلہ، راستوں کی سہولت، تقویم وساعات اور تنویر وروشنی کے لیے شمس وقمر کی تسخیر، ہدایت طلبی وراہ نمائی کے لیے ستاروں کی تعیین، حصولِ رزق کے لیے دن کی اور سونے کے لیے رات کی تجویز۔

ایک بے وقعت سے گندے پانی سے مختلف رنگ وروپ اور لب ولہجہ کے انسانوں کی، اور مختلف النوع حیوانات کی تخلیق، اِنسان کے ایک چھوٹے سے وجود میں قدرت کی نوع بنوع کرشمہ سازیاں، شخصِ واحد (حضرت آدم علیہ السلام) سے اِنسانوں کی اتنی بڑی نسل کی افزائش، زوجین کے مابین انس ومحبت اور مودت ورحمت کی تودیع، بے جان اور مردہ سے ذی روح کا، اور جاندار وزندہ سے بے جان کا وجود۔

بجلی کی کڑک اور چمک، بارش کا نزول، اور اُس سے ارضِ موات کی زرخیزی، پھر اُس سے جانوروں اور چوپایوں کا انتفاع، اناج کے کھیت، انگور وانار کے باغ، اور کھجور کے نخلستان جیسی مختلف الانواع اور متفاوت الانتفاع چیزوں کی ایک ہی طرح کے پانی (بارش) سے سیرابی، ایک چھوٹے سے دانے اور ایک حقیر سی گٹھلی سے پودوں اور درختوں کی رُستگی، پھر اُن میں طرح طرح کے اناج، پھل اور میووں کا ظہور، تمام جانداروں کے رزق کا انتظام، بقدر حصہ ہر ایک تک رسائی، ایک مکھی کے بطن سے شہد جیسی شیریں اور لطیف چیز کی برآمدگی، اور اُس میں لوگوں کے لیے شفایابی کی تاثیر، جس غذا کے پیٹ اور

معدے میں جانے سے ایک طرف گوبر اور لید جیسے فضلات بنتے ہیں، دوسری طرف خون جیسی ناپاک اور نجس چیز تیار ہوتی ہے، اُسی غذا سے اور اُسی معدے سے دودھ جیسے ستھرے، شفاف اور پاکیزہ مشروب کی صناعی: (المؤمنون:۱۴) ﴿فتبارک اللہ أحسن الخالقین﴾ (کیسی بڑی شان والا ہے اللہ، تمام صناعوں سے بڑھ کر)۔

ج: مذکورہ بالا اشیاء میں غور کرنا چاہیے کہ اُن میں سے کون سی چیز ایسی ہے جس سے عبرت پذیری کے لیے موجودہ سائنس اور ٹیکنالوجی کا علم ضروری ہے، قرآنِ کریم کے مخاطبِ اولیں: عرب کے بادیہ نشین، حجاز کے اُمّیین، اور مکہ کے مشرکین تھے؛ ان میں سے کون قادر تھا چاند پر کمندیں ڈالنے، اور مریخ پر جھنڈا گاڑنے پر؟ حالاں کہ اُنھیں اِن "آیات" کی طرف توجہ دلاتے ہوئے اِیمان کا مطالبہ کیا جارہا ہے: (الجاثیۃ: ٦) ﴿تلک آیات اللّٰہ نتلوها علیک بالحق، فبأي حدیث بعد اللّٰہ و آیاته یؤمنون﴾ (یہ اللہ کی نشانیاں ہیں جو ہم آپ کے سامنے ٹھیک ٹھیک بیان کرتے ہیں، اَب یہ لوگ اللہ اور اُس کی نشانیوں کے بعد آخر کس چیز پر اِیمان لائیں گے)۔

د: قرآنِ کریم میں بعض جگہ ﴿ما في السماوات والأرض﴾ (زمین وآسمان کی تمام چیزوں) میں بھی غور وفکر کی دعوت دی گئی ہے، تو یہ قرآن کا کلمۂ اِعجاز ہے، کہ قیامت تک کائنات کی جتنی چیزیں بھی لوگوں کے سامنے عیاں ہوتی جائیں گی وہ سب اپنے خالق وصانع کے وجود پر دلیل بنتی چلی جائیں گی۔

ہ: قرآن کریم نے جن لوگوں کو دعوتِ تفکر وتدبر دی ہے اُن کو بحیثیت مجموعی اِن اوصاف سے ملقب فرمایا ہے:

"لقوم یوقنون"، "لقوم یؤمنون"، "لقوم یتقون"، "لقوم یعقلون"، "لقوم یفقهون"، "لقوم یتفکرون"، "لقوم یذّکّرون"، "لقوم یسمعون"، "لقوم یشکرون"، "لقوم یعلمون"، "للعالِمین"، " للمؤمنین"، "لأولي

الألباب"، "لأولي النُّهى"، "لكل صَبَّار شَكور"، "لكل عبدٍ منيبٍ"۔

اِس کا خلاصہ یہ ہوسکتا ہے کہ کائناتی نظام میں نشانیاں ہیں: اُن لوگوں کے لیے جو عقل وفہم رکھتے ہیں، تاکہ وہ کلمہ کی دعوت سنیں، اُس میں غور کریں، پھر اُس سے نصیحت حاصل کریں، اور پھر اللہ اور اُس کے رسول پر ایمان لائیں، علم حاصل کریں، خوف وخشیت اور تقوی پیدا کریں، اور ساتھ ہی اللہ کی نعمتوں پر اپنے قول وعمل سے شکر کرتے رہیں، طاعات پر ثابت قدم رہیں، اور آزمائشوں پر صبر کرتے رہیں، اور سرد وگرم ہر حال میں رجوع الی اللہ ہوتے رہیں۔

و: بعض مواقع پر کائناتی اِحسانات شمار کرانے کے بعد "لعلّهم يَرجعون"، اور "لعلَّكم تُسلِمون" جیسے الفاظ کے ذریعہ دعوتِ تفکر کی غرض بھی واضح کردی گئی ہے، سورۂ یونس میں اِرشادِ باری ہے (۱۰۱): ﴿قل انظروا ما ذا في السماوات والأرض، وما تغني الآيات والنذر عن قوم لايؤمنون﴾ (آپ ان سے فرمایئے کہ آسمانوں اور زمین میں غور کرو (مگر جانے دیجیے!) یہ نشانیاں اور یہ ڈرانے والے پیغمبر، ایمان نہ لانے والوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے)۔

ایک موقع پر تو قرآنِ مجید نے غور وفکر کا عملی نمونہ اور غایتِ تدبر بھی بیان فرمادیا ہے: (الأنعام: ۷۵) ﴿وكذلك نري إبراهيم ملكوت السماوات والأرض وليكون من الموقنين ......﴾ (اور اسی طرح ہم اِبراہیم کو آسمانوں اور زمین کی اپنی حکومت دِکھلاتے تھے، تاکہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہوجائیں)، ایک جگہ اِرشاد ہے: (حم السجدة: ۵۳) ﴿سنريهم آياتنا في الآفاق وفي أنفسهم حتى يتبين لهم أنه الحق﴾ (آئندہ ہم اُن کو نشانیاں دکھائیں گے عالَم کی پہنائیوں اور وسعتوں میں بھی، اور لوگوں کی ذات اور وجود میں بھی، تاکہ یہ بات کُھل کر سامنے آجائے کہ قرآن ہی حق ہے)۔

دراَصل آیات اللّٰہ في الکون (کائناتی نظام) میں شرعی نقطۂ نظر سے غور وفکر کے تین مرحلے ہیں:

۱: اشیائے عالم کے وجود سے اُن کے خالق اور صانع کے وجود پر استدلال۔

۲: اُن کے ہمہ وقتی نشو ونما اور تسلسل آمیز تغیرات میں غور کر کے اُن کے مدبر اور مؤثرِ حقیقی کی تلاش۔

۳: ان اشیائے عالم کے طبی اور تکوینی منافع ومفادات میں غور کر کے اُن سے استفادہ وانتفاع، اور اُن کے خالق ومالک کا تشکر وامتنان۔

قرآنِ کریم کے موضوعات میں سے اِن میں سے صرف پہلا مرحلہ ہے، حضرات صحابہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تھا کہ چاند کے گھٹنے بڑھنے کی کیا وجہ ہے؟ اِس پر یہ آیت نازل ہوئی: (البقرۃ:۱۸۹) ﴿یسئلونک عن الأھِلّۃ، قل ھي مواقیت للناس والحج﴾ (لوگ آپ سے چاند کے بارے میں تحقیق کرتے ہیں، آپ فرمادیجئے کہ وہ چاند حج وغیرہ عبادات کے لیے آلۂ شناختِ اوقات ہیں)، جس میں چاند سے متعلق سائنسی انکشاف کرنے کے بجائے، اُس کے دینی اور شرعی فوائد بتائے گئے۔

اور اِس پہلی حیثیت سے غور وفکر کا سلسلہ قرآن کریم کے اولین مخاطبین (حضراتِ صحابہؓ) کے دور ہی سے قائم ہے، حتی کہ عرب کے ایک دیہاتی کا یہ استدلال مشہور ہے: ''البعرۃ تدل علی البعیر، وأثر الأقدام علی المسیر، فسماء ذات أبراج، وأرض ذات فجاج، لاتدل علی اللطیف الخبیر؟'' (راستوں میں پڑی ہوئی اونٹ کی مینگنیاں بتاتی ہیں کہ اِدھر سے اونٹ گذرے ہیں، نشاناتِ قدم بتاتے ہیں کہ لوگ گذرے ہیں، تو کیا یہ برجوں والا آسمان، اور یہ پیچ در پیچ راستوں والی زمین نہیں بتائے گی کہ اُسے کسی نے پیدا کیا ہے؟)۔

اور رہی بات سائنسی انکشافات کے قرآن کریم سے اِثبات کی، تو یہ قرآن کریم کا موضوع نہیں ہے، اور نہ ہی اُس کے کمال، جامعیت یا حقانیت کی کوئی دلیل، سائنسی انکشافات ہوتے رہیں گے، تحقیقات بدلتی رہیں گی، مگر خالقِ کائنات کے الفاظ و معانی ازلی، ابدی اور سرمدی ہیں، اُن میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کا کوئی اِمکان نہیں ﴿لا تبديل لكلمات الله﴾۔

ز: انقلابِ دہر کی نیرنگیوں کی یہ کتنی عبرت ناک مثال ہے کہ وہ اشرف المخلوقات جس کے لیے خالقِ کائنات نے یہ کائناتی نظام مسخر فرمایا تھا، وہ خود ہی اِس نظام کی زلفِ گرہ گیر کا اسیر ہو کر رہ گیا، جو خادم تھا مخدوم ہو گیا، جو تابع تھا متبوع ہو گیا، جو مسخر تھا تسخیر کار بن گیا، اور ایسا کیوں نہ ہوتا؟ یہ سب بساط سجائی ہی گئی تھی اِنسان کی آزمائش کے لیے: (الکھف: ۷) ﴿إنا جعلنا ما على الأرض زينةً لها لنبلوهم أيهم أحسن عملاً، وإنا لجاعلون ما عليها صعيداً جُرُزاً﴾ (بے شک ہم نے روئے زمین کو جو زینت بخشی ہے وہ لوگوں کے اعمال کے امتحان کے لیے، اور ہم آئندہ اُس کو چٹیل میدان بنا دیں گے)، اور حضرت انسان جو ٹھہرے پیدائشی ظلوم وجہول: (الأحزاب: ۷۲) ﴿إنه كان ظلوماً جهولاً﴾، سو کھا گئے دھوکہ ﴿غرَّتهم الحياة الدنيا﴾ (الأنعام: ۷۰)۔

پانچواں مغالطہ:

اِن مذکورہ نِکات کے روشن ہو جانے سے الحمد للہ اِس سلسلہ میں پیدا کی جانی والی اِس طرح کی الجھنوں سے بھی نجات کا سامان ہو گیا:

”......خدا خود یہ چاہتا ہے کہ اُس کے اصحابِ علم بندے تسخیرِ کائنات کا یہ عمل جاری رکھیں، کہ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں قرآن کی زبان میں ”اصل عالم“ کہا جا سکتا ہے: ﴿إنما يخشى الله من عباده العلماء﴾، اِس کے برعکس اگر ہم صرف یہ فیصل

کرنے بیٹھ گئے کہ دیگر قومیں جو تسخیرِ کائنات کا فریضہ انجام دے رہی ہیں؛ اُن کا کون سا عمل شریعت میں مباح ہے اور کون سا حرام؟ یا یہ کہ ان کی کون سی ایجادات کو لائق استعمال قرار دیا جاسکتا ہے اور کون سی ایجاد پر عدم جواز کا فتویٰ چسپاں کیا جاسکتا ہے؟ تو یہ ذہنی رویہ ہمیشہ ہمیں محض ان کے تعاقب میں مشغول رکھے گا اور ہم کبھی اِس لائق نہیں ہوسکیں گے کہ دنیا ہماری اتباع اور اقتداء میں چلے......''۔

(مسلم ذہن کی تشکیلِ جدید، ص ۳۱، از: راشد شاز)۔

۱: گزشتہ صفحات میں بتوفیقہ تعالی یہ بات اچھی طرح واضح کی جاچکی کہ اللہ کے نزدیک ''دین'' کس تصورِ حیات کا نام ہے؟ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیائے کرام علیہم الصلاۃ والسلام کے مقاصد بعثت کیا رہے ہیں؟ ''اُسوۂ رسول'' کی روشنی میں ''علم'' کسے کہا جاسکتا ہے؟ ''عالم'' کا اِطلاق کس پر ہوسکتا ہے؟ اور اُس کے وظائفِ حیات کیا ہوسکتے ہیں؟ حلت وحرمت اور کراہت واباحت کے فیصلے ''عالمِ دین'' کا فرض منصبی ہیں یا نہیں؟

۲: ''تسخیر کائنات'' نبوت کے مقاصد میں داخل ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اِس سلسلہ میں سقراط، بقراط، ارسطو اور افلاطون جیسے قدماء کے اِفادات کے برابر بھی، کچھ منقول کیوں نہیں ہے......؟

۳: ہم دنیا کے لیے کن امور میں متبوع اور نمونہ بنائے گئے ہیں؟ استخلاف فی الارض (منصبِ خلافت) کن اعمال پر موعود ہے؟ اور تمکین فی الارض (خلافت مل جانے) کے بعد کن اعمال کا مطالبہ ہے؟ عباد الرحمٰن کی کیا شان بتائی گئی ہے؟ ہم کو اللہ کے یہاں کس معاملہ کے گواہ کے طور پر پیش ہونا ہے؟ ﴿......لیکون الرسول شھیداً علیکم وتکونوا شھداء علی الناس فاقیموا الصلوٰۃ وآتوا الزکوٰۃ واعتصموا باللّٰہ﴾ (......تاکہ رسول تمھارے گواہ رہیں، اور تم دوسرے لوگوں کے، سو نماز قائم کرو، زکوۃ ادا کرو، اور اللہ کی رسی مضبوطی سے تھامے رہو) میں اہلِ اِسلام کو کن

امور کا مکلف بنایا جا رہا ہے؟............؟

اِن سوالات کے اگر درست جواب فراہم کر لیے جائیں تو قرآن کی اصطلاح میں ''اصل عالم'' کن لوگوں کو کہا جاتا ہے؛ یہ خود بخود متعین ہو جائے گا۔

چھٹا مغالطہ: علم پر علماء کی اجارہ داری:

آج کل ایک اعتراض یہ بھی بہت عام ہے کہ ''دین پر کسی کی اجارہ داری نہیں''، ''علماء دین کے ٹھیکیدار بنے بیٹھے ہیں''، یہ جارحانہ اعتراض بھی دراصل مغرب کی مذہب بیزار فضا سے مسموم اذہان ہی کی طرف سے اُٹھایا جاتا ہے:

> ''خود قرآن مجید میں رسول اللہ کی دعوت کا ذکر کرتے ہوئے یہ کہنا کہ آپ لوگوں کی گردنوں کو اِصر و اَغلال سے نجات دلاتے ہیں، دراَصل اِسی خیال کو ذہن نشین کراتا ہے کہ خدا نے اپنے دین کی تشریح و تعبیر کا حق کسی طبقۂ مخصوص کو نہیں دے رکھا ہے، اور یہ کہ محمد رسول اللہ کی دعوتِ اِنقلاب کسی ربائیت، پاپائیت یا مولویت کے اِدارے کو برداشت نہیں کر سکتی''۔ (مستقبل کی بازیافت، ص ۷۰، از: راشد شاز)۔

۱: عیسائیوں کے ہاں چرچ کا جو مقام اور مذہبی پیشواؤں کی جو حیثیت تھی، وہ سیاسی حکومتوں سے بھی زیادہ اثر ورسوخ والی تھی، مگر جب اُن کے اندر بے اعتدالیاں پیدا ہوئیں تو اُن کے حد سے بڑھے ہوئے اختیارات معاشرہ کے لیے ایک ناسور بن گئے، چرچ اور پوپ کے ذریعہ حکومت سے لے کر رعیت تک، خواص سے لے کر عوام تک، ہر شخص اور ہر طبقہ کا استحصال ہونے لگا، مغربی دنیا میں اس مذہبی ادارہ کے ذریعہ ظلم وناانصافی کی ایک خوف ناک تاریخ رقم ہوئی، جس کے ردِّ عمل میں وہاں کے لوگ مذہب ہی سے برگشتہ ہو گئے، اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ مذہب کی طرف منسوب ہر ہر چیز سے اُنھیں نفرت ہو گئی۔

۲: جب ہمارے مسلمان بھائی اہلِ مغرب کی کتابیں پڑھتے ہیں، اور اُن کے اپنے مذہبی حلقوں کے بارے میں تند وتیز جملے نظر سے گذرتے ہیں، تو وہ اُن کو مسلمان

مذہبی پیشواؤں پر چسپاں کرنے لگتے ہیں، اِس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے ہاں بھی بعض افراد اور بعض فرقے اسی قسم کی بے اعتدالی کا شکار ہیں، مگر پڑھنے والے تو دیدۂ بینا رکھتے ہوں گے، اُن کو تو ''کھرے'' اور ''کھوٹے''، ''اصلی'' اور ''نقلی'' میں فرق کرنا چاہیے۔

اُنھیں غور کرنا چاہیے کہ ہمارا مذہبی بنیادی اثاثہ: قرآن اور حدیث ہے، اور یہ دونوں ہی ہر زمانہ میں علمی کتب خانوں پر کھلے عام دستیاب رہے ہیں، ہر شخص کی دسترس میں ہیں، کبھی علماء نے کسی پر دین پڑھنے یا سمجھنے پر پابندی نہیں لگائی، دینی مدارس ہر ایک کے لیے کھلے ہوئے ہیں، جہاں (ہندوستانی تناظر میں) بنگال سے لے کر کشمیر تک کے طلبہ، مسلمانوں کے ہر طبقہ اور ہر برادری سے آتے ہیں، اُنھیں وہ سب کچھ پڑھایا جاتا ہے جو کسی بھی مدرسہ کا نصاب ہوتا ہے، تو بتایئے کہ ''اجارہ داری'' کہاں ہے؟

۳: پھر دارالافتاء کا نظام ایسا شفاف اور مثالی نظام ہے کہ ہر شخص وہاں اپنے شرعی مسائل لے کر جا سکتا ہے، اور بغیر کسی رشوت اور معاوضہ کے اپنے دینی مسائل حل کر سکتا ہے، پھر اُس پر عمل کرنے نہ کرنے میں وہ خود مختار ہوتا ہے، کبھی کسی صورتِ مسئلہ کے سمجھنے میں، یا مسئلہ کے بتانے میں کسی مفتی سے (بشری تقاضے سے) غلطی بھی ہو سکتی ہے، مگر الحمدللہ ''اہلِ حق'' کا پورا سلسلہ بحیثیتِ مجموعی اُن تمام رذیل اوصاف سے ابھی کافی حد تک محفوظ ہے جن کا مشاہدہ اور تجربہ دنیا کے کسی اور شعبے اور محکمے میں شبانہ روز ہوتا رہتا ہے۔

۴: بات دراَصل یہ ہے کہ دین کا علم حاصل کرنا شرعاً ہر مسلمان پر فرض تھا، وہ لوگوں نے چھوڑ دیا، جس کی وجہ سے وہ اُس سے ناواقف اور جاہل ہوگئے، اب دین پر عمل کرنے کی اِس کے علاوہ کیا صورت رہ جاتی ہے کہ جن لوگوں نے اُس کو پڑھا ہے، اور اپنی زندگی کے بہترین اوقات اُس پر صرف کیے ہیں، اُن سے پوچھا جائے، اور اُن پر اعتماد کیا جائے، آخر دیگر فنون و موضوعات میں ساری عقل و فہم ہوتے ہوئے بھی، عام لوگ ماہرین و محققین کی فہم و بصیرت اور تحقیق واکتشافات پر اعتماد کرتے ہیں یا نہیں؟

جب (اسباب کے درجہ میں) سب کی دوا اور شفا کا راز اِسی کائنات میں پوشیدہ ہے فیہ شفاء للناس، اور سب کے انتفاع واستمتاع کے وسائل اِسی عالمِ رنگ و بو سے وابستہ ہیں فیھا منافع للناس، اور کائنات میں مخفی اسرار تک ہر ایک کی رسائی بھی ہوسکتی ہے؛ تو یہ سوال کیوں نہیں اُٹھایا جاتا کہ امریکہ ویورپ کے ڈاکٹروں اور گنتی کے چند سائنس دانوں نے اِس پر اپنی اِجارہ داری کیوں قائم کر رکھی ہے؟ ....؟

کیا یہ سب تقلید نہیں ہے؟ جمود نہیں ہے؟ کوئی اُن بڑے بڑے پروفیسرز، لکچررز، ماسٹرز، ڈاکٹرز، اور اسکالرز کو احمق، بے وقوف اور مقلد نہیں کہتا جو لاکھوں روپے کے وظیفے اور تنخواہ لینے کے باوجود، دوسروں کی دی ہوئی تھیوریاں ہی پڑھتے پڑھاتے اور سیکھتے سکھاتے ہیں، عقلی جمود اور تعطل کا مجرم اُنھیں نہیں ٹھہرایا جاتا!

۵: خیر! یہ تو ایک سخن گسترانہ بات تھی، ہمیں کہنا یہ ہے کہ ''علماء نے اجارہ داری قائم نہیں کی''، بلکہ لوگوں نے اپنے طرزِ عمل سے ازخود اُن کو ''اجارہ دار'' اور ''ٹھیکیدار'' بنادیا، کہ خود دین پڑھا نہیں، اُنہی کے ذمہ رکھا۔

پھر جب قرآنی اِرشاد ﴿الحافظون لحدود اللہ﴾ (التوبۃ:۱۱۲) کے مطابق دِین کی حفاظت اور علم صحیح کی نشر واشاعت: علماء کا فرضِ منصبی ہی ٹھہرا تو اُنھوں نے بحیثیت خادمِ دین کے، بلاخوفِ لومۃ لائم، اِس فریضہ کو مقدور بھر انجام دیا۔

علمی، فکری تلبیسات کرنے والوں کو ٹوکا، عملی بے اعتدالیاں کرنے والوں کو روکا، خود ساختہ دانشوروں اور ڈاکٹروں کو علم ودانش کا آئینہ دکھایا، شاہانِ سلطنت کو برسرِ دربار غیرت مند علماء کی گرفتوں کا سامنا کرنا پڑا، بڑے بڑے مشائخ وقت کو متصلّب علماء کی جرحوں سے گذرنا پڑا۔

ہمارے اسلاف کی روشن تاریخ میں تو یہاں تک ہے کہ امام علی بن المدینیؒ (ت: ۲۳۴ھ) نے اپنے والد گرامی کے پورے ادب واحترام کے باوجود، اُن کی علمی

غلطی کو لا محاباة في الإسلام۔ کے اُصول کا حوالہ دیتے ہوئے برسرِ عام ظاہر فرمایا، امام ابوداودؒ (ت:۲۷۵ھ) نے اپنے جلیل القدر بیٹے کی علمی کمزوری پر برملا تبصرہ فرمایا۔

۶: یہ حفاظتِ دین کا غیبی نظام ہے، جس کے لیے اللہ رب العزت ہر دور میں، مسلمانوں ہی میں سے کچھ سعید روحوں کا انتخاب فرماتے رہتے ہیں، اعتراض کرنے والوں نے کبھی سوچا کہ جو قرآن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر چودہ سو سال قبل نازل ہوا تھا، وہ مِن وعَن آج بھی ہمارے ہاتھوں میں کیسے موجود ہے؟

﴿إنا نحن نزلنا الذکر وإنا له لحافظون﴾ کے ذریعے حفاظت قرآن کا جو وعدہ کیا گیا تھا؛ غور کرنا چاہیے کہ اُس کے لیے امت کے کس طبقے کا انتخاب ہوا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک حدیث، آپ کی ایک ایک ادا کیسے آج تک پوری طرح محفوظ ہے؟ دین کی ہر ہر بات کے لیے سلسلۂ سند کا جو نظام علماء نے قائم فرمایا ہے، اِس کی کوئی نظیر کسی اور قوم میں بھی ہے؟

بڑے اِحسان ناشناس اور سفاک دل ہیں وہ لوگ جو اپنے محسنوں کے ساتھ اِحسان فراموشی کا معاملہ کرتے ہیں، اور انتہائی بے دردی سے اُن کی چودہ سو سالہ دینی خدمات کا خون کر دینے پر آمادہ ہیں۔

یاد رکھیے! ''علم'' ہی ساری جہالتوں کا واحد علاج ہے، اور ہر چیز کا ''علم'' اُس کے ماہرین ہی سے حاصل ہو سکتا ہے، سعودی عرب میں ایک ڈاکٹر کو صرف اِس بات پر جیل ہو گئی کہ اُس نے کوئی دوا اِیجاد کی تھی، اور حکومت کی لیبارٹری میں اُس کی جانچ اور تجزیہ کرائے بغیر از خود مریضوں کو دینی شروع کر دی تھی، تو کیا ہمارا ''دین'' اتنا بے وقعت ہو گیا ہے کہ اُس کی اِصلاح کے نام پر آنے والی دواؤں کو ہم کسی مستند ادارے کی تصدیق کے بغیر قبول کر لیا کریں؟

مقامِ حیرت بھی ہے، عبرت بھی کہ جس امت کے نبی سے خطابِ خاص کے

ذریعہ یہ ارشاد فرمایا گیا تھا: (آل عمران:۱۹۶) ﴿لا یغرنک تقلب الذین کفروا في البلاد، متاع قلیل، ثم ماواهم جهنم﴾ (اے نبی! آپ کو دھوکہ میں نہ ڈالدے کافروں کا ملکوں میں دندناتے پھرنا، یہ تو بس تھوڑا سا مزا ہے، پھر اِن کا ٹھکانہ جہنم ہے)، اُسی نبیؐ اُمّی فِداہ أبي و أمي کی طرف منسوب لوگ کس آسانی سے کافروں کی دندناہٹ سے دھوکہ میں پڑتے جارہے ہیں، فیاللإسلام، ویا للمسلمین۔

آخر میں اِس پہلو کی طرف توجہ دلاتے ہوئے ''علم'' سے متعلق یہ گفتگو ختم کی جاتی ہے کہ مدرسہ کے سند یافتہ ہر فارغ کو، یا قرآن وحدیث کا حوالہ دینے والے ہر شخص کو ''عالم'' نہ سمجھا جائے، بلکہ تجربہ سے جس کا ''عالمِ دین'' ہونا متحقق ہو جائے، دین کے سلسلہ میں صرف اُسی پر اعتماد کیا جائے۔

ایک شخص ٹرینوں اور بسوں پر لوگوں کی بیماریوں اور اُن کے (گارنٹڈ) علاج کا پرچار کرتا ہے، ایک شخص میڈیکل اسٹور سے غیر قانونی طور پر علاج کرتا ہے، ایک شخص بغیر ڈگری کے کلینک کھولے ہوئے ہے، اور ایک شخص ایسا ہے جس نے ڈاکٹری اور معالجہ کی اعلیٰ درجہ کی سند حاصل کرنے کے لیے ایک مدت تک جان، مال اور وقت کی قربانیاں پیش کی ہیں، اور اِس فن کے حصول میں اپنی بہترین توانائیوں اور صلاحیتوں کو خرچ کیا ہے، تو کیا آپ کے نزدیک سب ایک ہی درجے میں ہیں؟

حالاں کہ ''ڈاکٹروں'' کی ان سب قسموں کے الفاظ واصطلاحات بھی ایک ہوں گے، امراض اور بیماریوں کا تذکرہ بھی ایک ہی جیسا ہوگا، بلکہ ممکن ہے کہ بعض مرتبہ مصنوعی ڈاکٹر زیادہ لفّاظ اور لسّان ہو، مگر کوئی تو ایسا فرق ہے کہ ایک کو پانچ سو روپئے فیس دیتے ہوئے بھی دِل نہیں دُکھتا، اور ایک سے دس روپئے والا چورن بھی خریدتے ہوئے، کھٹک سی ہوتی رہتی ہے!! دعوتِ تدبر ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے۔

اَب اِس کے بعد ''عقل'' سے متعلق کچھ معروضات حاضر خدمت ہیں۔

تیسرا باب

عقل

کسی ہوش وحواس رکھنے والے شخص سے اِختیاری طور پر جو بھی قول یا عمل صادر ہوتا ہے، اُس کی مقتضی اور داعی: تین چیزوں میں سے کوئی ایک چیز ہوتی ہے:

(۱) عقل (۲) جذبات (۳) نفسانیت:

۱-: **عقل:** عربی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی ہیں "روکنا اور لگام دینا"، اسی لیے اونٹ کو سنبھالنے کے لیے اُس کی گردن میں ڈالی جانے والی رسی کو "عِقال" کہا جاتا ہے، حیوانات خصوصاً اِنسانوں کے اندر اللہ تعالیٰ نے ایک قوتِ مُدرکہ، شیٔ لطیف کی شکل میں ودیعت فرمائی ہے، جو اُن کو کسی بھی عمل یا ردِّ عمل کا نفع ونقصان سمجھاتی ہے، پھر نفع کے پہلو پر ابھارتی اور ضرر کے پہلو سے بچاتی ہے، اِسی قوت کو "عقل" کہا جاتا ہے۔

جذبات: طبیعت کے اُس تغیر اور ہیجان کو کہتے ہیں جو کسی پیش آنے والے واقعہ سے ناشی ہوتا ہے، مثلاً کسی بات پر غصہ آجانا، کسی کی حمایت یا عداوت کا داعیہ پیدا ہوجانا، وغیرہ۔

خواہشات: محض تلذذ اور تفریح کے طور پر، نفس کی طرف سے کیے جانے والے بجا اور بے جا تقاضوں کو کہا جاتا ہے، خواہ اُس کا کوئی خارجی محرک ہو یا نہ ہو، اور خواہ وہ مفید ہو یا مضر، یا لایعنی اور بے فائدہ۔

عقل، جذبات اور خواہشات کے اِن تینوں دواعی کے مقتضا پر عمل کرنے کے سلسلہ میں اُصول یہ ہے کہ جذبات وخواہشات کو تو پوری طرح سے عقل کے تابع رکھا جائے، اور عقل کو ﴿سمعنا وأطعنا﴾ کے مطابق اللہ ورسول کے حکم کے تابع رکھا جائے، تفصیل آگے آتی ہے۔

۲-: "عقل" کے مختلف درجات اور اُس کا مطلوبہ معیار:

قوتِ عقل: اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا عطیہ اور بیش بہا نعمت ہے، دنیا کی کوئی دولت اِس کا بدل نہیں ہوسکتی، اِنسان کے امانتِ خداوندی کے متحمل ہونے کی بنیاد یہی عقل ہے، جب تک عقل نہ ہو، یا کامل نہ ہو؛ اِنسان شرعی احکام کا مکلف بھی نہیں ہوتا، ہر قوت کی طرح قوتِ عقلیہ میں بھی تین درجے ہیں: اِفراط (حد سے بڑھی ہوئی)، اعتدال (بقدرِ ضرورت)، تفریط (ضرورت سے کم)۔

۳-: عقل سلیم:

عقل کے مذکورہ تین درجات میں سے معتدل اور متوسط درجہ کی عقل کو "عقلِ سلیم" اور "حکمت" کہتے ہیں، کسی بھی عمل یا ردِّعمل کا نفع ونقصان سمجھانے، پھر نفع کے پہلو پر ابھارنے اور ضرر کے پہلو سے بچانے، اِسی طرح جذبات وخواہشات کے تقاضوں میں مفید وغیر مفید کا فرق واضح کرنے کا کام توازن واعتدال کے ساتھ "عقلِ سلیم" ہی کر پاتی ہے۔

اِس کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ یہ اِنسان کو زندگی کے ہر میدان اور ہر موڑ پر اُس کی واقعی حیثیت کا صحیح اندازہ کرادیتی ہے، اور ہر موقع کی ضروریات ومصالح کے مقتضیات سمجھا دیتی ہے، بچوں کو بچپن کا اِحساس، جوانوں کو جوانی کا شعور، بوڑھوں کو بڑھاپے کا تصور کرانا، پھر ہر مرحلۂ حیات کے تقاضوں کا اِدراک اور اُن کے مناسب عمل درآمد کرانا؛ یہ "عقلِ سلیم" ہی کا کام ہے، اِسی طرح علم وجہل، واقفیت وناواقفیت، لیاقت

وعدمِ لیاقت اور اہلیت ونااہلی کے اعتبار سے اِنسان کے اپنے مقام ومرتبے کی تعیین بھی ''عقلِ سلیم'' ہی کی رہین منت ہوتی ہے۔

۴۔ عقل میں سلامتی اور اعتدال وتوازن پیدا کرنے کا طریقہ:

عقلِ سلیم اور حکمت وتفقُّہ ویسے تو ایک وہبی عطیہ ہے، جو سعادت مند افراد کو خزانۂ غیب سے ازخود عطا ہو جاتا ہے: (البقرۃ:۲۶۹) ﴿ومن یؤت الحکمة فقد أوتي خیراً کثیراً﴾ (جس کو حکمت دے دی گئی اُس کو خیر کثیر سے نواز دیا گیا)، حدیث شریف میں ہے: (بخاری:۷۱ ومسلم:۱۰۳۷) ''من یرد اللّٰه به خیراً یفقهه في الدین'' (اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ خیر کا اِرادہ فرماتے ہیں اُس کو دین کی صحیح سمجھ عطا فرما دیتے ہیں)۔

البتہ تکلیف وتشریع کی حد تک ''عقلِ سلیم'' پیدا کرنے میں کچھ نہ کچھ کسب واِختیار کا بھی دخل ضرور ہے، اِس اِکتساب کے دو طریقے ہیں: تحقیق اور تقلید۔

ہر مسئلے میں مثبت ومنفی دو رُخ ہوتے ہیں، اور اِفراط، تفریط اور اِعتدال کے تین پہلو ہوتے ہیں، اَب عقلِ سلیم کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اِنسان کو نفیاً اور اِثباتاً اِفراط وتفریط کی دونوں اِنتہاؤں سے بچاتے ہوئے اعتدال وتوسط تک پہنچا دے، ظاہر ہے کہ یہ کام وہ جبھی کر سکتی ہے جب پیش آمدہ مسئلے کے مثبت ومنفی دونوں رُخ اور اِفراط، تفریط اور اعتدال کے تینوں پہلو اُس پر روشن ہوں، پھر اگر اِنسان کے اندر اہلیت وصلاحیت ہے، اور مسئلہ اُس کے اختیار کے اندر کا ہے، تو علم وتحقیق کا یہ کام وہ اپنی سعی وکاوِش سے خود بھی انجام دے سکتا ہے، اور یہ چیز ''تحقیق'' کہلاتی ہے۔

اور اگر اِنسان کے اندر اتنی صلاحیت نہیں ہے کہ وہ اُس معاملہ میں ازخود سارے پہلوؤں کو پیش نظر رکھ کر کوئی ذمہ دارانہ فیصلہ اور مناسب اِقدام کر سکے، تو عقلِ سلیم کا تقاضا ہے کہ وہ اُس معاملے میں ایسے ماہرین اور تجربہ کار لوگوں سے رابطہ اور مشورہ

کرلے جن کے سامنے معاملے کی نوعیت اور اُس کا مناسب حل پوری طرح سے واضح ہے، اِسی کو "تقلید" کہا جاتا ہے۔

مثلاً کسی شخص کو کوئی قانونی مسئلہ پیش آ گیا، اَب اگر اُس کی عقل، سلیم ہوگی تو وہ اپنے مسئلے کے حل کے لیے اپنی موجودہ حالت کا استحضار کرتے ہوئے، یہ فیصلہ بآسانی کرسکتا ہے کہ یہ فن میں نے پڑھا ہے یا نہیں؟ پڑھنے کے باوجود مطلوبہ لیاقت میرے اندر ہے یا نہیں؟ اپنا پیش آمدہ مسئلہ میں ازخود حل کرسکتا ہوں یا نہیں؟ خود نہ پڑھنے، یا مطلوبہ لیاقت نہ پائے جانے کے باوجود، اِس کام کو خود سے اَنجام دینا میرے لیے مفید ہوگا یا مضر؟ پھر اگر معاملہ کسی اور کے سپرد کرنا ہے تو ایسے کس شخص سے رابطہ کیا جائے جس سے مجھے اپنے مقصود میں پوری طرح کامیابی مل جائے، اور میرا حالی یا مآلی کسی قسم کا نقصان نہ ہو؟ جس شخص سے رابطہ کیا جارہا ہے کیا وہ واقعی ماہرِ فن ہے، یا صرف سند یافتہ ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

یہی حال معالجہ، تعلیم اور دنیا کے سارے کاروبار کا ہے، کہ کچھ لوگ اُس کے محقق ہوتے ہیں، اور باقی لوگ اُس فن میں اُن کے مقلد۔

اِس کے برخلاف جس شخص کی عقل، سلیم نہیں ہوتی، اور وہ احمق، سفیہ، بے وقوف یا جاہل ہوتا ہے، تو وہ اپنی حیثیت کا صحیح اندازہ نہیں لگا پاتا، چنانچہ کوئی کسی علم وفن سے واقف نہ ہوتے ہوئے بھی اُس میں رائے زنی کرنے لگتا ہے، کوئی صلاح اور اِصلاح کا مفہوم نہ سمجھتے ہوئے بھی خود کو مصلحِ قوم خیال کرنے لگتا ہے، کوئی مذہبی تعلیم نہ ہوتے ہوئے بھی شرعی مسائل میں دخل اندازی کرنے لگتا ہے، یا کوئی مسئلہ پیش آجانے پر استفسار واستفتاء میں اپنی ہیٹی سمجھتا ہے، "تقلید" و"شخصیت پرستی" کے طعنوں سے ڈرتا ہے، یا اگر تقلید پر آتا ہے تو ہر کس وناکس کی تقلید کرنے لگتا ہے، جس کے نتیجے میں اپنی عاقبت خراب اور اپنی آخرت برباد کرلیتا ہے۔

غرضیکہ عقل کے سلیم نہ ہونے کی وجہ سے اِنسان ایک تو اپنے نفع ونقصان کا صحیح فیصلہ نہیں کر پاتا، دوسرے اپنی واقعی حیثیت کا صحیح اندازہ نہیں لگا پاتا، نتیجتاً یا تو اپنی حیثیت سے کم تر مشاغل میں لگ کر خود کو ضائع کر لیتا ہے، یا اپنی حیثیت سے بالاتر امور میں دخل اندازی کر کے اپنے آپ کو ذلیل کر لیتا ہے:

رأیت العقل عقلین ۔۔۔ فمطبوع ومصنوع

ولا ینفع مصنوع ۔۔۔ إذا لم یك مطبوع

کما لا ینفع العین ۔۔۔ وضَوء الشمس ممنوع

۵- عقل مند (دانش وَر) کون؟

گذشتہ تفصیلات سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوگئی کہ "عقلِ سلیم" وہ ہے جو اِنسان کو ضرر رساں چیزوں سے خبردار کر سکے، اور نفع بخش چیزوں کی طرف رہنمائی کر سکے، اور ایک مسلمان کے نزدیک یہ بات طے شدہ ہے کہ اِنسان کے رہنے کی دو جگہیں ہیں: ایک بطور دار العمل کے عارضی قیام گاہ، دوسری بطور دار الجزاء کے ابدی جائے قرار، ظاہر ہے کہ "عقل سلیم" یہی چاہتی ہے کہ اِنسان دار العمل میں رہ کر، دار الجزاء سے غافل نہ ہو، اور شغلِ اِمروز میں لگ کر، فکرِ فردا سے بے پروا نہ ہو۔

پھر چونکہ دار الجزاء کا سارا معاملہ غیبی امور سے تعلق رکھتا ہے، اِس لیے "عقلِ سلیم" رکھنے والے کے لیے ضروری ہے کہ اِس باب میں اپنی عقل پر اعتماد کرنے کے بجائے، ایسے لوگوں کی خبر پر یقین کرے جو اُن امورِ غیبیہ کی معلومات رکھتے ہیں؛ خواہ براہِ راست وحیِ ربانی کے مخاطب بن کر (یا بواسطۂ ملائک)، جیسے انبیائے کرام علیہم الصلاۃ والسلام، یا چاہے انبیاء علیہم السلام کے واسطے سے، جیسے صحابۂ کرامؓ، یا ھلُمَّ جرّاً واسطہ بالواسطہ اُن کے سچے متبعین: (التوبۃ:۱۰۰) ﴿......والذین اتبعوھم باحسان﴾۔

اِس سے معلوم ہوگیا کہ صحیح معنوں میں ''دانش ور'' کہلانے کے حق دار وہ لوگ ہیں جو اللہ ورسول کی کتابیں پڑھتے ہیں، اور اُن کی مرضیات معلوم کر کے حسب استطاعت اُن کو اختیار کرتے ہیں، اور نامرضیات معلوم کر کے حتی الامکان اُن سے بچتے ہیں، تا کہ یہ دنیا جیسی بھی گذر جائے، مگر دارالجزاء میں سرخ رو ہوسکیں، اور ابدی جائے قرار کے عیش وآرام سے محروم نہ ہوں۔

اِس کے برخلاف اُن لوگوں کو ''عقل مند'' یا ''دانش ور'' خیال کرنا، جو اپنے مقصدِ تخلیق تک سے واقف نہیں ہیں، اور اِنسان ہوتے ہوئے، جانوروں کی طرح صرف دنیا کی تگ ودَو میں مصروف ہیں، اللہ ورسول سے مستغنی اور آخرت سے غافل ہیں، قدرت کی دی ہوئی دماغی صلاحیتوں اور اعصابی قوتوں کو بے محل صرف کیے جارہے ہیں؛ ایسے لوگوں کو ''دانش ور'' سمجھنا قرآن کریم میں وارد اِس آیت سے تغافل یا تجاہل کی کھلی ہوئی دلیل فراہم کرنا ہے:

(لأعراف:۱۷۹) ﴿.......... لهم قلوب لا يفقهون بها، ولهم أعين لا يبصرون، ولهم آذان لا يسمعون بها، أولئك كالأنعام، بل هم أضل، أولئك هم الغافلون﴾ (......اُن کے پاس قلوب تو ہیں مگر بات سمجھتے نہیں، آنکھیں تو ہیں مگر دیکھتے نہیں، کان تو ہیں مگر سنتے نہیں، یہ لوگ جانوروں کی طرح ہیں، بلکہ اُن سے بھی گئے گذرے، یہ وہ لوگ ہیں جو (آخرت اور اُس کے انجام) سے غافل ہیں)۔

ایک اور جگہ اِرشاد ہے: (الروم:۷): ﴿يعلمون ظاهراً من الحياة الدنيا وهم عن الآخرة هم غافلون﴾ (اِن کا مبلغِ علم صرف دنیوی زندگی کی ظاہری چمک دمک ہے، اور آخرت سے تو یہ لوگ بالکل غافل ہیں)۔

۶- عقل کی حدود اور اُس کا دائرۂ کار:

چونکہ ہر شخص کی عقل معتدل اور سلیم نہیں ہوتی، اِس لیے کسی بھی فیصلہ میں اُس

کے لیے یہ امتیاز مشکل ہو جاتا ہے کہ آیا یہ عقل کا فیصلہ ہے، یا جذبات کا تقاضا ہے، یا ہوائے نفسانی اور خواہشات کا حصہ ہے؟ پھر خود وہ شخص عقل کے تینوں درجات میں سے کس درجہ کی عقل کا حامل ہے؟ نیز اُن درجات میں معلومات، تجربات، عمر اور مزاج کا تفاوت بھی اثر انداز ہوتا ہے، اور دوسری طرف "عقل" کی وہ بے بسی تو ہے ہی کہ وہ اپنے دائرۂ کار (معقولات) سے آگے نہیں بڑھ سکتی (جیسا کہ "ذرائع علم" کے بیان میں گذر چکا)، اور یہ سب تو صرف ایک شخص کی عقل سے متعلق اتنے احتمالات ہیں، باقی دنیا کے مجموعی نظام کے اِعتبار سے اگر تجزیہ کیا جائے تو یہ مسئلہ اور زیادہ پیچیدہ ہو جاتا ہے۔

۷۔ عقلوں کا تفاوت:

اِس مضمون کو اِس طرح بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ عقلِ اِنسانی کا کام ہے: اِنسان کو مضر اشیاء سے بچانا، اور مفید چیزوں پر آمادہ کرنا، اب سوال یہ ہے کہ نفع وضرر کا معیار کیا ہے؟ اور کس کی عقل کے اعتبار سے اِس کا فیصلہ ہوگا، مثلاً زنا (برضا، یا بجبر) عقل کے نزدیک جائز ہے، یا ناجائز؟ حقیقی بہن یا بیٹی سے ازدواجی رشتہ قائم کرنا عقل کے مناسب ہے یا نامناسب؟ جو لوگ "مذہب" کے تابع یا کسی جبری نظام کے پابند ہیں اُن کو تو صرف یہ کہنا ہے کہ ہمارا مذہب، یا ہمارا قانون اِس کی اِجازت نہیں دیتا، مگر مذہب بیزار اور آزاد لوگوں کے لیے اِس مسئلہ کو طے کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں، یہی وجہ ہے کہ ماضی اور حال میں کچھ "عقل پرست" ایسے بھی ہیں جن کے نزدیک محرم، نامحرم، نکاح اور اِزدواج وغیرہ اصطلاحات انسانوں کی آزادی پر ایک بوجھ ہیں، اُن کی عقل کا کہنا ہے:

> "اِس سے زیادہ تعجب کی بات کیا ہو سکتی ہے کہ لوگ عقل کا دعویٰ کرنے کے باوجود اِس قسم کی بے عقلیاں کرتے ہیں کہ اُن کے پاس ایک حسین وجمیل بہن یا بیٹی موجود ہوتی ہے، اور خود اُن کی بیوی ایسی حسین نہیں ہوتی، اس کے باوجود وہ اپنی بہن یا بیٹی کو اپنے اوپر حرام سمجھ کر اُس کو ایک اجنبی شخص کے حوالے کر دیتے ہیں، اگر یہ جاہل عقل سے کام لیتے تو انھیں اِحساس ہوتا کہ ایک اجنبی کے مقابلہ میں اپنی بہن اور بیٹی

کے وہ خود زیادہ حق دار تھے، دراصل اِس نادانی کی ساری وجہ یہ ہے کہ اُن کے رہنما (مذہب) نے اُن پر دنیا کی لذتیں حرام کردی ہیں، اور ایک اَن دیکھے خدا سے خوف زدہ کردیا ہے"۔(السیاسة والبلاغ الأکید والناموس الأعظم، لعُبید اللّٰہ القیرواني، بحوالہ: الفَرق بین الفِرَق؛ لعبدالقاهر البغدادي ،ص۲۸۱، وعلوم القرآن، ص۴۲۳، از: مفتی محمد تقی عثمانی)۔

یہ تو خیر ایک مذہب آزاد شخص کی عقل کا نمونہ تھا، کسی ایک ہی مذہب کا نام لینے والوں کی عقلوں میں بھی ایسا ایسا اختلاف ہوتا ہے کہ عام لوگ فیصلہ نہیں کرپاتے کہ کسے عقلمند کہیں، کسے بے عقل؟ یا کسے مذہبی کہیں، کسے لامذہب؟ مثلاً ہر مسلمان کا عقیدہ ہے کہ قرآنِ کریم اللہ تعالیٰ کی کتاب اور خالقِ کائنات کا اپنے بندوں کے لیے ایک ابدی پیغام ہے، اور یہ بھی عقیدہ ہے کہ بندوں تک یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ پہنچا ہے، لوگوں سے براہِ راست کوئی خطاب نہیں فرمایا گیا ہے، اَب اِس کے بعد عقلوں کا تفاوت ملاحظہ فرمایئے:

تدبرِ قرآن کے لیے فہمِ سلف کی ضرورت:

مغربی دانش گاہوں سے تربیت پائی والی عقل یہ کہتی ہے:

"ہماری مشکل یہ ہے کہ ہم قدماء کے ذہن سے نئی دنیا کو سمجھنا چاہتے ہیں، بھلا جو لوگ صدیوں پہلے ایک بالکل ہی مختلف ماحول میں زندگی جیتے رہے، جنھیں اکیسویں صدی کی زندگی کا کچھ تجربہ نہ تھا، اُنھیں نئی دنیا کی قیادت پر مامور کرنا اُن کے اوپر بھی ظلم ہے، اور ہمارے لیے بھی اِس کے نتائج تباہ کن ہی ہوسکتے ہیں، جب خدا کی تازہ بتازہ کتاب اپنے تمام تر اُبعاد کے ساتھ ہمارے درمیان موجود ہو تو ہمیں یہ کب زیب دیتا ہے کہ ہم اسے غور وفکر کا محور بنانے کے بجائے اپنے ہی جیسے اِنسانوں سے مشکل کشائی کے طالب ہوں...... البتہ عام لوگوں کے لیے یہ قبول کرنا کچھ آسان نہ ہوگا کہ قرآن مجید کو موجودہ سیاق سباق میں پڑھنا ہمیں نئے نتائج اور نئے فیصلوں تک بھی

پہنچا سکتا ہے، اب تک جو لوگ ''تفسیر ماثورہ'' کے خوگر رہے ہیں، یا جو متقدمین کے ذہن سے قرآن مجید کو پڑھنے کے عادی ہیں اور جن کے لیے قرآن مجید کے الفاظ میں معانی کی روح تعبیری حواشی کے ذریعے پھونکی جاتی رہی ہے، ان کے لیے اِس مروجہ منہج کو خیر باد کہنے کا واضح مطلب یہ ہوگا کہ قرآن مجید کے الفاظ راست ہم سے کلام کرنے لگے ہوں......''۔(مسلم ذہن کی تشکیل جدید، ص۲۰-۲۱، از: راشد شاز)۔

اور دوسری طرف اسلامی درسگاہوں میں پرورش پانے والے ایک طالب علم کی عقل کہتی ہے:

''جس طرح یہ کائنات اللہ جل جلالہ کے مظاہرِ قدرت کا ایک حصہ ہے، اور اِس میں موجود مختلف النوع اشیاء، رب ذوالجلال کی خلاقی کی آئینہ دار ہیں، اُن میں وہ جڑی بوٹیاں بھی ہیں جن سے ایک عالَم کی شفا وابستہ ہے، اُن میں وہ تخلیقی جواہر پارے بھی ہیں جن میں موجودہ ترقیات کا راز پنہاں ہے، مگر اُن سے راست طور پر فائدہ اُٹھا پانا ہر کہہ ومہ کے بس کی بات نہیں، بلکہ ہر دور اور ہر زمانہ میں سقراط، افلاطون، ارسطو، نیوٹن، گلیلیو، اور آئنسٹائین جیسے لوگ ہی قدرت کی اِس صنائی سے براہِ راست انتفاع کے اہل ہوئے، اور پھر ساری عقل وفہم ہوتے ہوئے بھی، عام لوگ انہی محققین اور حکماء کی فہم وبصیرت کے محتاج اور تحقیق وانکشافات سے مستفید رہے ہیں۔

اِسی طرح قرآنِ کریم بھی رب العالمین ہی کا کلام اِزلی ہے، جس کا ہر ہر لفظ ایک معجزہ، جس کی ہر ہر سطر ایک آبشار، جس کا ہر ہر مضمون آب زُلال، ہمہ وقت زندہ وتابندہ، ہرگاہ روشن ومنور، أحسن الکلام کا واحد مصداق، أحسن الخالقین کی قدرتِ کلامی کا اعلیٰ ترین نمونہ، تو جب اللہ تعالیٰ کے تخلیق کردہ ''کائناتی نظام'' سے استفادہ حکماء اور فلاسفہ کی رہنمائی کے بغیر ہر ایک کے لیے ممکن نہیں، جب کہ اس کا تعلق یا عقل سے ہوتا ہے یا مشاہدہ وتجربہ سے، مُغیبات سے ہوتا ہی نہیں، تو پھر اللہ تعالیٰ کے ''کلام'' قرآنِ کریم سے استفادہ ہما شما کے لیے براہِ راست کیسے ممکن ہے؟ جب کہ اس میں بڑا حصہ مغیبات سے تعلق رکھتا ہے، اِس لیے ہماری عقل تو یہی کہتی ہے کہ اللہ کے اِس ازلی کلام کا پوری طرح درک، اور اُس سے کما حقہ استفادہ تنہا ہم جیسوں کی عقل کے

بس کا نہیں، ہم کو تو اپنے سے زیادہ عقل والوں کی رہنمائی چاہیے، جبھی ہم اِس کلامِ لازوال میں مستور شہ پاروں، آب گینوں، اور بیش بہا گنجینوں سے متمتع ہوسکتے ہیں۔

باقی جس طرح اِس عالمِ رنگ وبو کے پھل پھول سے راست طور پر انتفاع اور نظامِ کائنات کے عام منافع سے بلاواسطہ اِستمتاع اپنی اپنی ہمت اور کاوِش کے بقدر عام لوگ بھی کرلیتے ہیں، اِسی طرح قرآنِ کریم سے بھی عبرت ونصیحت اور تذکُّر وموعظت کی حد تک اِستفادہ اپنی اپنی اِستعداد کے مطابق کوئی بھی صاحبِ دل کرسکتا ہے: ﴿ولقد یسرنا القرآن للذکر فھل من مدکر﴾"۔

تدبرِ قرآن کے مراتب:

یہاں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ قرآن کریم سے استفادہ کے تین درجات ہیں:

۱: عبرت ونصیحت اور تذکُّر وموعظت: اِس استفادہ وانتفاع کی دعوت عام ہے، قرآن کریم کے الفاظ ومعانی حل کرسکنے والا ہر مسلمان اِس کا مخاطب ہے۔

۲: فہمِ مسائل اور تطبیق وتفریع: یعنی اصولِ فقہ میں مذکور ضابطوں کی روشنی میں مطالعۂ قرآنی، اور اس سے احوال وافراد کے تناظر میں استدلال اور تطبیق، ظاہر ہے کہ یہ کام اصول وفروع پر مطلع مخصوص اہلِ علم ہی انجام دے سکتے ہیں۔

۳: تحقیقِ مناط اور استنباطِ مسائل: یعنی یہ دیکھنا کہ کس آیت سے کون سا مسئلہ ثابت ہورہا ہے؟ پھر اُس کا منشا، علت اور سبب کیا ہے؟ تاکہ اُس کی بنیاد پر ایسے اصول وضع کیے جاسکیں جن سے مزید مسائل واحکام کا استخراج کیا جاسکے، یہ مرحلہ عام اہل علم کی سطح سے بھی اوپر کا ہے، اور صرف اُن ہی حضرات کا حصہ ہے جو اپنے کمالات علمی کے اعتبار سے مرتبۂ اجتہاد پر فائز ہوں۔

بہرحال یہ اُس عقل کے اِختلاف اور تفاوت کا نمونہ ہوا جو کسی نہ کسی درجہ میں مذہبی دائرہ میں لائی جاسکتی ہے، آیئے ایک نمونہ اُس عقل کا بھی دیکھتے ہیں جو اپنے کو

مذہبی کہنے کے باوجود مذہب پر حاکم بن کر رہنا چاہتی ہے:

"......حالاں کہ قرآن مجید، جو مسلمانوں میں وجدانی علوم کا بنیادی ماخذ ہے، تدبر و تفکر اور مشاہدے کی بھرپور وکالت کرتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ وجدان کی عمارت تعقل کی بنیاد پر رکھی جائے، بھلا جو وجدان عقل کو قائل نہ کر سکے یا جو دانشِ انسانی کی پہنچ سے باہر ہو، اُسے اِنسانوں کے لیے مشعلِ راہ کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟......" (مستقبل کی بازیافت، ص ۱۲۸، از: راشد شاز)۔

اِس اِقتباس سے ہم جیسی عقل والوں کے لیے کئی سوالات پیدا ہو گئے:

۱: "وجدانی علوم" سے کیا مراد ہے؟ قرآنِ مجید بحیثیتِ مجموعی عقائد و احکام، اور قِصص واَمثال کے مضامین پر مشتمل ہے، اِن میں سے کون سا علم "وجدانی علوم" کا مصداق ہے؟ اور اِن میں سے کس مضمون پر "وِجدان" کا اِطلاق کیا جا سکتا ہے؟

۲: قرآنی احکام کے ماننے کو "عقل کے قائل ہونے" پر موقوف کر دیا گیا، تو سوال یہ ہے کہ پھر قرآنِ کریم ہی میں "اِیمان بالغیب" کا مطالبہ کیوں کیا گیا ہے؟ بلکہ اُسی کو فلاح کا ضامن اور مدارِ نجات قرار دیا گیا ہے: ﴿ھدی للمتقین الذین یؤمنون بالغیب﴾۔

آخر قرآن کریم میں مذکور معجزات، ملائک، جن، جنت، جہنم، حشر، نشر اور صور وغیرہ کا تصور کس "عقل" اور کس "وجدان" سے کیا جا سکتا ہے؟ سوائے اِس کے کہ عالم الغیب والشھادۃ کی خبر پر یقین کر لیا جائے، اور اُس کے اُس رسولِ اُمّی صلی اللہ علیہ وسلم کی دل و زبان سے تصدیق کی جائے جنھوں نے جنت کا تذکرہ فرماتے ہوئے یہ بلیغ کلمات اِرشاد فرمائے ہیں: (بخاری: ۳۲۴۴، ومسلم: ۲۸۲۴) "ما لا عین رأت، ولا أذن سمعت، ولا خطرَ علی قلب بشر" (جو نہ آنکھوں نے دیکھی ہوگی، نہ کانوں نے سنی ہوگی، اور نہ کسی بشر کے حاشیۂ خیال میں آئی ہوگی)۔

اور جس کو قرآن کریم میں اِس طرح فرمایا گیا ہے: (السجدۃ: ۱۷) ﴿فلا تعلم

نفس ما أخفي لهم من قرة أعين جزاءً بما كانوا يعملون ﴾ (کوئی شخص نہیں جانتا کہ لوگوں کے لیے اُن کی آنکھیں ٹھنڈی کرنے کے کیا کیا سامان چھپا کے رکھے گئے ہیں؛ اُن (نیک) اَعمال کے بدلے جو وہ کیا کرتے تھے)۔

۳: شاؔز نے ''عقل'' کا کوئی معیار اور پیمانہ نہیں بتایا کہ شرعی احکام کا کس کی عقل میں آجانا ضروری ہے؟ مذہبی کی یا ملحد کی؟ مسلمان کی یا کافر کی؟ سنی کی یا بدعتی کی؟ مقلد کی یا غیر مقلد کی؟ قدامت پسندوں کی یا جدت پسندوں کی؟ یا پھر سب کچھ چھوڑ کر راشد شاز اور اُن کے ہم فکروں کی؟ اُن کے ایک اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بظاہر اُن کی یہی مراد ہے، دیکھیے کیا اِرشاد ہوتا ہے:

''اب آیئے اِس نکتہ کو سمجھنے کی کوشش کریں کہ ساتویں صدی (عیسوی) میں نازل ہونے والی کتاب (قرآنِ کریم) جب اکیسویں صدی میں خلاقانہ دل ودماغ اور مؤمنانہ بصیرت کے ساتھ پڑھی جائے گی تو یہ عمل اپنے اندر کن اندیشوں اور امکانات کا حامل ہوگا۔

مثال کے طور پر آیتِ وراثت کو لیجئے، جہاں بیٹی کے مقابلے میں بیٹے کو یک گونہ فوقیت حاصل ہے، ساتویں صدی کے پدرانہ عرب معاشرے میں جہاں عورت پر معاشی ذمہ داریوں کا کوئی بوجھ نہ تھا، نان ونفقہ کی ذمہ داری سے وہ یکسر آزاد تھی، باپ، شوہر، بھائی اور قرابت کے مختلف رشتوں کے ذریعے اُسے جو کچھ بھی ملتا اُس کی حیثیت ایک جمع پونجی کی ہوتی، جب کہ مرد وارثین سماجی اور عائلی ذمہ داریوں کے بوجھ تلے دبے ہوتے، ایک ایسے معاشرے میں وراثت کی یہ ترتیب عورت کے حق میں تھی۔

البتہ آج شہری زندگی میں، بالخصوص مغرب کے بڑے شہروں میں جہاں عورت اور مرد کو اپنی انفرادی حیثیت میں زندگی کا مکمل بوجھ اٹھانا پڑ رہا ہے، وہاں باپ کے ترکے میں بیٹی کو مساوی حصے سے محروم کرنا؛ ہوسکتا ہے سماجی انصاف کے تقاضوں کے مطابق نہ ہو''۔ (مسلم ذہن کی تشکیلِ جدید، ص ۲۲، از: راشد شاز)۔

یہ ہے اُس عقل کی جلوہ سامانی جو مذہب کے تابع رہنے کے بجائے اُس پر حاکم رہنا چاہتی ہے، حالاں کہ قرآنِ کریم میں ''عقلی'' مداخلت کرنے والے یہ احمق (دانش ور؟) لوگ ایک دوسری جگہ خود ہی یہ بھی کہتے ہیں:

''اِسلام نام ہے خود سپردگی کا، یہ خود سپردگی مردوں سے بھی اسی قدر مطلوب ہے جتنی عورتوں سے، ہمیں یہ بات تسلیم کرنے میں ذرہ برابر تامل نہیں ہونا چاہیے کہ خدا اور اُس کا رسول اِس بات کو کہیں بہتر سمجھتا ہے کہ کون سی چیز باعث فتنہ ہے، اور کس عمل سے اِنسانی معاشرہ کا توازن برقرار رہ سکتا ہے، اگر اللہ نے مسلم خاتون کو مسلم مرد کی طرح مسجد کی دینی وسماجی زندگی میں شرکت کا حق دیا ہے، اور اگر اسے رسول اللہ نے اپنے عہد میں عمل کی سند بخشی ہے، تو ہمیں یہ حق نہیں پہونچتا کہ ہم بعد کے عہد میں اپنے ناقص فہم کی بنیاد پر عورتوں سے اُن کا یہ حق چھین لیں۔ (مستقبل کی بازیافت، ص ۹۷، از: راشد شاز)۔

معلوم ہوا کہ اِن لوگوں کا مقصود اِتباعِ شریعت اور اِطاعت خداوندی نہیں ہوتا، قرآن وحدیث کا حوالہ صرف مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے لیے ہوتا ہے، اِن کا اصل مقصود: یا تو اپنی نفسانیت کی تسکین اور انانیت کو سند جواز فراہم کرنا ہوتا ہے، یا اپنے دین، اور اپنے مذہب کے بارے میں اپنے خداوندانِ نعمت (برسرِ اقتدار طبقات) کو مطمئن کرنا ہوتا ہے، پھر اس کے لیے نقلی مؤیدات تلاش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، اگر صراحتًا مل گئیں فبہا، ورنہ پہلے تو نصوص کو توڑ مروڑ کر اُن میں اپنے مفروضات فٹ کرنے کی سعی ہوتی ہے، اگر کامیابی ہوگئی تو ٹھیک، ورنہ وہ بھی کوئی ضروری نہیں۔

۸-: عقل کیسے قابو میں کی جاسکتی ہے؟

بہرحال عقلوں کے اِسی اختلاف اور تفاوت کی وجہ سے کسی اجتماعی نظام کو چلانے کے لیے ایک ایسی قوت کی اِحتیاج ہوتی ہے جو اَفراد کی عقلوں کی رہنمائی کا کام بھی کرسکے، اور متفاوِت العقول لوگوں کو ایک نظام کا پابند بھی بنا سکے۔

عقل سے اوپر کی یہ قوت دو طرح کی ہے: اِکتسابی اور غیر اِکتسابی۔

غیر اِکتسابی قوت: ''تقدیر'' اور ''تکوین'' کی ہے، جہاں عقل اَز خود جواب دے جاتی ہے، اور غیر اِختیاری طور پر ایسے حالات پیش آجاتے ہیں جو عقل کے بنائے ہوئے منصوبوں کو تہ و بالا اور اِنسان کی قائم کی ہوئی ترتیبوں کو زیر و زبر کر کے رکھ دیتے ہیں، حتی کہ سیدنا علیؓ سے یہاں تک منقول ہے: عرفت ربي بفسخ العزائم۔

اور اِکتسابی قوت: ملحد اور مذہب بیزار لوگوں کے لیے تو سوائے طاقت اور زورِ بازو کے کچھ نہیں ہو سکتی، کہ کوئی قوتِ قاہرہ ان پر مسلط ہو اور ان کو اپنے جبری نظام کے تابع کر لے۔

مگر مذہب پسندوں کے لیے سب سے بڑی واجب التسلیم اِکتسابی قوت: ''تشریع'' اور ''مذہب'' کی ہے، جو اُن کی عقول کو دِن کی روشنی، رات کی تاریکی، خلوت کی تنہائی، جلوت کے اختلاط، بازار کے ہنگاموں، مسجد کے سکون، سلطنت کے تخت، اور قید کے بستر، ہر جگہ اور ہمہ دم اپنا تابع و دست گرفتہ رکھتی ہے، اِسی لیے سارے مذاہب کی سرحد ﴿سمعنا و أطعنا﴾ (ہم نے سنا اور مان لیا) کے اِقرار کے ذریعہ وہیں سے شروع ہوتی ہے، جہاں سے عقل کی ظاہری حدود ختم ہو جاتی ہیں۔

لیکن اِس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مذہب قبول کر لینے کے بعد ''عقل'' کی حیثیت ایک عضوِ معطل کی ہوگئی، بلکہ اِس کا مطلب یہ ہے کہ عقل اَب مذہب کے تابع ہوگئی ہے، لہٰذا جن مسائل و موضوعات پر، اور جس دائرہ میں عقل کے استعمال کرنے کی اجازت ہوگی، بس اُنہی حدود کے اندر رہنا اُس کا مذہبی فریضہ ہوگا۔

۹- مذہب کے دائرے میں عقل کا کردار:

اَب یہ سوال کہ مذہب کا اِقرار کر لینے کے بعد عقل کا کیا کردار باقی رہ جاتا ہے؟ اور مذہب کے نزدیک عقل کی حدودِ کار کیا ہیں؟ اِس کا جواب یہ ہے کہ ''مذہب'' (اِسلام)

قبول کرنے کے دو مرحلے ہیں:

پہلا مرحلہ ہے: اللہ کے وجود اور اُس کی صفات کو تسلیم کرنا، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اللہ کا آخری پیغمبر اور رسول ہونے کا دل وزبان سے اِقرار کرنا، قرآنِ کریم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اترنی والی آخری آسمانی کتاب ماننا، اور آخرت اور اُس کے متعلقات کا یقین کرنا۔

اِن چار بنیادی عقائد پر ''اِیمان'' لانے کے لیے اللہ کی طرف سے ہر طرح کے تدبر و تعقل کی اِجازت ہے، آفاق وأکوان میں اور انفُس وأبدان میں غور وفکر کی اِجازت ہی نہیں بلکہ دعوت بھی ہے: (حم السجدة: ۵۳) ﴿سنريهم آياتنا في الآفاق وفي أنفسهم حتى يتبين لهم أنه الحق﴾ (آئندہ ہم اُن کو نشانیاں دکھائیں گے عالَم کی پہنائیوں اور وسعتوں میں بھی، اور لوگوں کی ذات اور وجود میں بھی، تاکہ یہ بات کُھل کر سامنے آجائے کہ قرآن ہی حق ہے)۔

لہٰذا جب قرائن ودلائل سے کسی کا سچا پیغمبر اور رسول ہونا ثابت ہوجائے، تو عقل کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اُس کی دعوتِ اِیمان پر بے چون وچرا لبیک کہہ دیا جائے، جیسا کہ أولي الألباب (اہلِ عقل) کا طرزِ عمل قرآن کریم میں بتایا گیا ہے: (آل عمران: ۱۹۳) ﴿ربنا إننا سمعنا منادياً يُنادي للإيمان أن آمنوا بربكم فآمنا﴾ (پروردگار! ہم نے ایک آواز لگانے والے کو سنا تھا جو اِیمان کی پکار لگا رہا تھا تو ہم اِیمان لیتے آئے)۔

اور دوسرا مرحلہ ہے: مذکورہ بنیادی عقائد مان لینے کے بعد اِسلام کے دیگر أحکام وأوامر کو قبول کرنا، یہ ہے وہ مرحلہ جہاں سے عقل کی آزادی کی حدود ختم ہوجاتی ہیں، اور ﴿سمعنا وأطعنا﴾ (جو کچھ ہم سنیں گے دل وجان سے مانیں گے) کی خود سپردگی اور بندش شروع ہوجاتی ہے۔

سیدنا حضرت ابراہیم علی نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام کے واقعہ میں بھی کیسا عجیب اُسوہ ہے، کہ توحید تک پہنچنے کے لیے تو فکر ونظر کا پورا موقع فراہم کیا گیا: (الأنعام:۷۵)

﴿وكذلك نري إبراهيم ملكوت السماوات والأرض وليكون من الموقنين......﴾ (اور اسی طرح ہم نے ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کی اپنی حکومت دکھلائی، تاکہ وہ کامل یقین کرنے والوں میں سے ہو جائیں)۔

مگر ایمان ویقین تک پہنچنے کے بعد بیٹے کی قربانی کا ایسا حکم دے کر جو ظاہری عقول سے بالکل ہی ماوراتھا اُن کے ''اِسلام'' (خودسپردگی) کا کتنا سخت اِمتحان لیا گیا:

(الصافات:۱۰۲-۱۰۶) ﴿فلما بلغ معه السعي قال: يا بني إني أرى في المنام أني أذبحك فانظر ما ترى، قال: يا أبت افعل ما تؤمر، ستجدني إن شاء الله من الصابرين، فلما أسلما وتلّه للجبين، وناديناه أن يا إبراهيم، قد صدقت الرؤيا، إنا كذلك نجزي المحسنين، إن هذا لهو البلٰؤ المبين﴾

(پھر جب اسماعیل، ابراہیم کے ساتھ چلنے پھرنے کے لائق ہو گئے تو ابراہیم نے کہا: بیٹے! میں خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ میں تمھیں ذبح کر رہا ہوں، اب سوچ کر بتاؤ تمہاری کیا رائے ہے؟ بیٹے نے عرض کیا: ابا جان! آپ وہی کیجیے جس کا آپ کو حکم دیا جارہا ہے، اِن شاء اللہ آپ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے، غرض جب دونوں نے خودسپردگی کردی، اور ابراہیم نے اسماعیل کو پیشانی کے بل لٹادیا، ہم نے اُن کو آواز دی: ابرہیم! تم نے خواب سچا کردکھایا، یقیناً ہم نیکی کرنے والوں کو اِسی طرح صلہ دیتے ہیں، واقعی یہ تھا بھی بڑا سخت امتحان)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سفرِ معراج کی خبر دی، تو یہ بات عام عقول سے بالاتر تھی، اِس لیے کفارِ مکہ کہنے لگے کہ ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ راتوں رات کوئی یہاں

سے بیت المقدس (ملک شام) چلا جائے، پھر وہاں سے آسمانوں تک کی سیر کر آئے؟!
مگر جب سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو پتہ چلا تو آپ نے برجستہ فرمایا: إن
کان قالہ فلقد صدق، اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات فرمائی ہے تو یقیناً سچ ہے۔
(البدایہ والنہایہ ۳: ۱۴۰، دار إحیاء التراث العربی)۔

خلاصہ یہ کہ "اِسلام" میں داخل ہونے اور اِیمان قبول کرنے کے لیے ہر طرح
کے تدبر، تعقل اور تفکر کی اِجازت ہے، مگر اِیمان لانے کے بعد "اِسلام" کے ہر ہر حکم کے،
ہر شخص کی عقل وفہم میں آجانے کی شرط لگانے، اور کسی بھی مسئلۂ شرعیہ کو قبول کرنے کے
لیے سمجھ میں آجانے پر موقوف کرنے کی اجازت نہیں ہے، اللہ ورسول کی بات سمجھنے کے
لیے تو عقل کا اِستعمال مطلوب ومحمود ہے، مگر ماننے کے لیے عقل میں آنے کی شرط لگانا
"کفر" ہے، اِسلام قبول کر لینے کے بعد تو بس یہ کہنا ہے:

(الأنعام: ۷۱) ﴿قل إن ھدی اللّٰہ ھو الھدی، وأمرنا لنسلم رب
العالمین﴾ (آپ فرما دیجیے: اللہ کی دی ہوئی ہدایت ہی صحیح معنی میں ہدایت ہے، اور
ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم ربّ العالمین کے فرمانبردار بن جائیں)۔

۱۰- عقل کے کرنے کے کام:

لہٰذا مذہب کے دائرہ میں عقل کا جو کام ہے وہ یہ کہ جن امور میں مذہب کی
طرف سے کوئی حکم آجائے اُس کو بے چون وچرا تسلیم کر لے۔

۱: پھر اُس پر عمل کا طریقہ، اُس کی صحیح کیفیت اور اُس کا واقعی منشا معلوم
کرنے کی فکر کرے، قرآنِ کریم میں ہے: (الفرقان: ۷۳) ﴿والذین إذا ذکروا
بآیات ربھم لم یخروا علیھا صماً وعمیاناً﴾ (عباد الرحمن (رحمٰن کے
مخصوص بندوں) کی شان یہ ہے کہ جب اُنھیں اُن کے پروردگار کی آیات کے
ذریعے کوئی نصیحت کی جاتی ہے تو اُس پر اندھے بہرے ہو کر نہیں گرتے)، یہ منافقین

پر طنز ہے کہ وہ بظاہر تو قرآنِ کریم کا بہت حوالہ دیتے اور اُس سے اپنی دِل چسپی کا اِظہار کرتے ہیں، مگر اپنی طبیعت کی کجی کی وجہ سے قبولِ حق سے بے بہرے، اور چشمِ بصیرت سے محروم رہتے ہیں۔

اِس تفکر و تدبر میں اِس کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ جب تک اُس نصِّ شرعی کے ظاہری معنی، یا ظنی دلالت کسی معقولِ قطعی کے واقعی معارض ہو کر؛ محال اور ناممکن نہ ہوں؛ اُس وقت تک اُس کے ظاہری مفہوم سے عدول جائز نہ ہوگا، اِس لیے کہ کسی بھی کلام میں ''حقیقت'' ہی اصل ہوتی ہے، ''مجاز'' بدرجۂ ضرورت ہوتا ہے۔

یہ بات بھی واضح رہنی چاہیے کہ خلافِ عادت ہونا اور چیز ہے، اور محال و ناممکن ہونا علیحدہ چیز ہے، لہٰذا نصوصِ صحیحہ میں بعض مرتبہ ایسی چیز بھی آتی ہے جو خلافِ عادت (اور ماورائے اَسباب) ہو، مثلاً معجزات وغیرہ، ایسی چیز نہیں آتی جو کسی واقعی حقیقت کے واقعتاً خلاف ہو، اِس لیے کہ یہ بات عالم الغیب والشہادۃ کی شان کے خلاف ہے۔

۲: عقل کے اِستعمال کی دوسری اور اعلیٰ ترین صورت یہ ہے کہ اللہ ورسول کی طرف سے ثابت شدہ منصوص حکم کی علت اور سبب میں فکر و تدبر کر کے، غیر منصوص مواقع کا حکم معلوم کیا جائے، اِس کو ''تفقہ فی الدین'' (دینی نصوص میں غور کرنا) اور ''اجتہاد'' کہتے ہیں، اور ایسا کرنے والوں کو ''فقہاء'' اور ''مجتہدین''۔

۳: مذہب کے دائرے میں رہتے ہوئے عقل کے استعمال کی تیسری صورت یہ ہے کہ اپنی حیثیت کا صحیح صحیح اندازہ لگا لیا جائے، اگر پہلی دو صورتوں پر قدرت نہ ہو، اور اُس جگہ تک پہنچنے کے لیے خداداد فہم و بصیرت، اور مطلوب تقوی و تدین کے ساتھ ساتھ، جس یکسوئی، وسعتِ مطالعہ، دیدہ ریزی، دماغ سوزی اور نکتہ رسی کی ضرورت ہوتی ہے، اُس کا موقع نہ ہو، تو جن کو یہ سب چیزیں حاصل ہیں، یا رہی ہیں؛ اُن میں سے (اپنے اعتبار سے) بہتر سے بہتر پر اعتماد کر لیا جائے، اور پھر اُسی کا اتباع کیا جائے، اور اِس اعتماد

واتباع کو اصطلاح میں ''تقلید'' کہا جاتا ہے، جیسا کہ دنیا کے سارے علوم وفنون میں یہی معمول ہے، اور یہ کوئی عیب نہیں ہے، بلکہ اِس کے خلاف کرنا کم عقلی اور سفاہت کی دلیل ہے:

وہ بد نصیب جسے قیل وقال نے مارا

خوشا نصیب جسے امتثال نے مارا

آخر ڈاکٹر، انجینئر پر اعتماد کرتا ہے یا نہیں؟ وکیل ڈاکٹر پر اعتماد کرتا ہے یا نہیں؟ آنکھ کا ڈاکٹر قلب کے ڈاکٹر کا محتاج ہوتا ہے یا نہیں؟ تو جن لوگوں نے مذہب کو بحیثیت ایک مستقل علم کے نہیں پڑھا، مذہبی امور میں اُن کو بھی کسی پر اِعتماد کرنا چاہیے یا نہیں؟ آخر وہ کس پر اعتماد کریں گے؟ جن پر اِعتماد کریں گے وہ کیا کہلائیں گے؟ اور اِس اعتماد واتباع میں شرعاً یا عقلاً حرج کیا ہے؟ ہاں اِنسانوں کے ہر طبقہ کی طرح اِس میں بھی اچھے برے ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں، اِس لیے اِنتخاب کی ذمہ داری اِعتماد کرنے والوں ہی کے سر رہے گی، نیم حکیم خطرۂ جان، نیم ملاّ خطرۂ ایمان۔

۴: چوتھے درجے میں: (التغابن:۱۶) ﴿فاتقوا اللّٰہ ما استطعتم﴾ (جتنا ہوسکے اللہ کا تقوی اختیار کرو) پر عمل کرتے ہوئے، حتی المقدور شرعی فرائض وواجبات (اور حسب توفیق سنن ومستحبات) کی بجا آوری کا اہتمام کرے اور حتی الامکان محرّمات (ومکروہات) سے کنارہ کشی اختیار کرے، اُس کے بعد اپنی عقل کو اُن کاموں میں اِستعمال کرے جو مذہبی اعتبار سے مباح یا محمود ہوں، پھر اُن سے خود بھی فائدہ اُٹھائے، قوم کو بھی فائدہ پہنچائے، مگر شرط یہی ہے کہ اپنی اصل کو، اور اپنے مقصدِ تخلیق کو نہ بھول جائے:

تم شوق سے کالج میں پڑھو، پارک میں پھولو — جائز ہے غباروں میں اڑو، چرخ پے جھولو

پر ایک سخن بندۂ اکبر کی رہے یاد — اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

ورنہ اِس سے بڑی حماقت کیا ہوگی کہ اضافی کاموں میں لگ کر، مقصد سے تغافل ہوجائے، اور نعوذ باللہ قیامت کے دن اللہ تبارک وتعالیٰ یہ فرمادیں: ﴿نسوا

اللہ فانساھم﴾ (یہ لوگ اللہ کو بھولے تھے تو آج اللہ نے بھی اُنھیں چھوڑ دیا)۔

امید کہ اِن معروضات سے عقل کی راہ سے دَر آنی والی زلات ولغزشات کے سد باب کے لیے اور اہل زیغ وضلال کی تلبیسات وتشکیکات سے تحفظ کے لیے وافر سامان فراہم ہوگیا ہوگا، البتہ موضوع کی مناسبت سے ایک اور مسئلہ پر بھی گفتگو ضروری ہوگئی ہے، وہ ہے:

۱۱-:مذہبی امور میں حدودِ اختلاف:

چونکہ مذہب کے سمجھنے میں عقول کا اِستعمال ہوتا ہے، اور عقول کا اِختلاف اور تفاوت ایک فطری امر ہے، اور ساتھ ہی اِستعداد، فہم، ذوق اور وسعتِ نظر وغیرہ میں بھی برابری شاذ ونادر ہی ہوتی ہے، اِس لیے نتیجتاً وجوہِ استنباط واِستخراج میں، اور نصوص کے معانی اور مفاہیم میں بھی اِختلاف ہوجاتا ہے، اِس طرح کے اِختلاف کی صورت میں یا تو کوئی ایک تقلیداً دوسرے کی بات مان لے، ورنہ پھر یہ اختلاف باقی ہی رہ جاتا ہے، اور اِس میں کوئی حرج بھی نہیں۔

مگر چوں کہ اِس مسئلہ میں بھی بے اِعتدالی بہت عام ہے، اِس لیے آئندہ صفحات میں ایک مستقل عنوان کے تحت ذرا تفصیل سے اِس کی وضاحت کی جاتی ہے۔

وحدتِ امت اور حدودِ اختلاف

مسلمانوں میں کون سا ایسا حساس دِل ہے جو امت کے موجودہ حالات سے متاثر اور قومِ مسلم کے قابلِ رحم احوال سے فکرمند نہ ہو، ان حالات کے حقیقی اُسباب کیا ہیں؛ ان کو جاننے اور سمجھنے کی فکر بھی سبھی کو لگی ہوئی ہے، اس کی وجہ یا تو تکوین اور تقدیر کو قرار دیا جائے کہ ہماری قسمت میں ہی ایسا لکھا ہوا ہے، مگر جن کا تکوینیات پر ایمان ہونے کے ساتھ ساتھ، تشریعیات پر بھی اِیمان ہے وہ جانتے ہیں:

قومے بجد وجہد سعادت گرفتہ اند　　　قومے دگر حوالہ بتقدیر می کنند

(کچھ لوگ تو اپنی محنت وجفاکشی سے سعادت یاب ہوجاتے ہیں، اور کچھ لوگ اپنی ناکامی کی ذمہ داری تقدیر پر ڈال دیتے ہیں)

ہمارے پیش آمدہ حالات میں سے بعض امور تو ہماری بداعمالیوں کا قدرتی نتیجہ اور طبعی اَنجام ہیں، جیسا کہ اِن نصوص میں ان کی طرف اِشارہ کیا گیا ہے:

۱: (الشوریٰ:۳۰) ﴿وما أصابكم من مصيبة فبما كسبت أيا.يكم ويعفو عن كثير﴾ (تم کو جو بھی مصیبت پیش آتی ہے وہ سب تمہارے اعمال ہی کا نتیجہ ہوتی ہے، اور بہت سی بداعمالیاں تو اللہ تعالیٰ معاف بھی فرمادیتے ہیں)۔

۲: (الروم:۴۱) ﴿ظهر الفساد في البر والبحر بما كسبت أيدي الناس ليذيقهم بعض الذي عملوا لعلهم يرجعون﴾ (لوگوں کے کرتوتوں کے نتیجے میں خشکی اور تری میں فساد پھیلا ہوا ہے، اللہ اس کے ذریعے لوگوں کی بداعمالیوں کا

تھوڑا سا مزا چکھانا چاہتے ہیں؛ تا کہ لوگ رجوع الی اللہ ہوں)۔

۴: ایک اور جگہ یہ مضمون مزید وضاحت سے بیان فرمایا گیا ہے: (الإسراء: ۱٦)

﴿وإذا أردنا أن نهلك قرية أمرنا مترفيها ففسقوا فيها، فحق عليها القول فدمرناها تدميراً﴾ (اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو اُس کے خوش حال لوگوں کو (ایمان اور اِطاعت کا) حکم دیتے ہیں، پھر وہ نافرمانیاں کرتے ہیں، تو اُن پر حجت تمام ہو جاتی ہے، چنانچہ ہم انھیں تباہ و برباد کر ڈالتے ہیں)۔

ان نصوص کا حاصل یہ ہے کہ بحیثیتِ مجموعی امت کے اندر جب جب اَوامر شریعت اور نواہیِ دِین کے سلسلہ میں غفلت و بے التفاتی، بے عملی و بے توجہی اور عصیان و نافرمانی کا غلبہ ہوگا، تو اس کا قدرتی انجام: شکست و ریخت، ذِلت و پستی اور زوال و انحطاط ہونا ہی ہے۔

اور بعض امور: نتیجے اور اَنجام کے بجائے، تباہی کے بنیادی اَسباب میں سے ہیں، جن میں آپسی افتراق و انتشار اور اِختلاف و تنازع سب سے بڑا اور سب سے زیادہ موثر سبب ہے، جس نے ہماری قوت بکھیرنے، اندر سے ہم کو کھوکھلا کرنے، اور ہماری قومی ہوا نکالنے میں سب سے کلیدی کردار ادا کیا ہے۔

مقامِ عبرت ہے کہ جس امت کو پروردگارِ عالم کی طرف سے (آل عمران: ۱۰۳) ﴿واعتصموا بحبل الله جميعاً ولا تفرقوا﴾ (تم سب اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو، اور باہم نا اتفاقی مت کرو) کی بطور خاص تاکید کی گئی تھی، وہی امت بہتر (۷۲) سے زائد فرقوں میں منقسم ہو چکی ہے، ''اہلِ حق'' اور ''اہل السنۃ والجماعۃ'' کہے جانے والے طبقات بھی متعدد گروہوں اور جماعتوں میں بٹے ہوئے ہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ ہمارے رہبرانِ قوم کو اِس زیاں کا اِحساس نہیں ہے، اِحساس تو ایک مدت سے ہے، اور اِصلاحِ قوم کے نعرے کے ساتھ اُٹھنے والے تمام ہی زعماء کی

طرف سے اس کا اظہار بھی ہوتا رہتا ہے، مگر مشکل یہ ہے کہ سارے شور ہنگامے کے باوجود ہماری اِس بیماری کا علاج ہو نہیں پا رہا ہے، بلکہ اس مزمن مرض کے نتیجے میں اور بھی نا معلوم کتنے مسائل اور حالات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

اتحاد و اختلاف کے مختلف پہلو

ہمارا خیال ہے کہ "اِتحاد و اِختلاف" کے اِس اہم اور حساس مسئلے میں جذباتی باتیں کرنے کے بجائے، کتاب و سنت کی روشنی اور حقائق و واقعات کے آئینے میں مسئلے کو سنجیدگی کے ساتھ سمجھنے کی ضرورت ہے، آیئے بتوفیقہ تعالی یہاں بھی اس پر کچھ غور کرتے ہیں:

۱: اگر دقتِ نظری سے جائزہ لیا جائے تو ہمارے باہمی اختلافات یا تو علمی اور اصولی بنیادوں پر ہوتے ہیں، کہ کسی مسئلہ میں ایک عالم ایک بات کہتا ہے، دوسرا عالم اُسی مسئلے میں دوسری طرح کی بات کہہ دیتا ہے، جس کے نتیجے میں اولاً اُن دونوں میں اور ثانیاً دونوں کے وابستگانِ حلقہ کے درمیان اختلاف و تنازع کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

اور یا پھر ہمارے اختلافات کی بنیاد: عملی کمزوریاں (عجب و تکبر، بغض و عناد وغیرہ) نفسانی خواہشات اور جذباتی تقاضے ہوتے ہیں، مثلاً "اہلِ حق" ہی کو لیتے ہیں، کہ وہ سب اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، انبیائے کرام، خصوصاً محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہم وسلم کی عصمت، قرآنِ کریم کی حقانیت، حدیث شریف کی حجیت، صحابۂ کرامؓ کی عظمت اور سلفِ صالحین کی اہمیت پر متفق ہیں، پھر اُن میں کے اکثر ائمۂ اربعہ کی من جانب اللہ مقبولیت کو بھی تسلیم کرتے ہیں، اس کے علاوہ معتبر سلاسلِ تصوف، اور مستند علمی حلقوں سے بھی وابستہ ہیں، حتی کہ کسی مخصوص مکتبۂ فکر سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔

ظاہری حالات کے اعتبار سے اتنی ساری بنیادوں پر اتفاق رکھنے والوں میں کسی قسم کا اختلاف نہیں ہونا چاہیے تھا، مگر عملاً کوئی مکتبۂ فکر، کوئی حلقہ اور کوئی سلسلہ باہمی

کشاکشی سے محفوظ نہیں ہے۔

یا اس کے برعکس بعض حضرات ایسے ہیں کہ اُن کے نزدیک کتاب وسنت کے ظاہر کے علاوہ کسی بھی چیز کی کوئی اہمیت نہیں، اور قرآن وحدیث کے سمجھنے میں، شریعت پر عمل کرنے میں کسی شخصیت کا واسطہ اختیار کرنا، اُن کے ہاں شرک اور آباء پرستی ہے، گویا اُن کے نزدیک نقطۂ اِتحاد صرف اور صرف ''کتاب وسنت'' کے ظاہری نصوص ہیں، کم از کم امت کا یہی طبقہ گروہ بندیوں اور دھڑے بازیوں سے بچا ہوتا، مگر تازہ صورتِ حال یہ ہے کہ یہ لوگ بھی سخت آپسی انتشار واضطراب سے دوچار ہیں۔

پھر یہ عملی اختلافات بھی کبھی علمی اور مذہبی رنگ میں ظاہر ہوتے ہیں، کبھی جاہ ومنصب کی رسہ کشی اس کا مظہر بنتی ہے، کبھی مال ودولت کا حصول اس کا سبب بنتا ہے، غرضیکہ ایک ہی ''منفعت'' اور ایک ہی ''نقصان'' کے نقطۂ اتحاد پر متحد جماعات اور اقوام بھی نامعلوم کتنی وجوہ سے باہم دست وگریباں رہتی ہیں۔

۲: یہ تو صورتِ حال کا ایک پہلو ہے، دوسرے پہلو سے بھی جائزہ لینا چاہیے کہ کسی امام یا عالم کی تقلید اور اتباع: امت میں اختلاف کا سبب ہے، یا اتفاق کا؟ عباسی، ترکی اور ہندوستانی حکومتیں اگر فقہِ حنفی کی پابند تھیں تو خاص اِس وجہ سے کیا انتشار پیش آیا؟ اندلس کی حکومت اگر فقہِ مالکی سے وابستہ تھی تو وہاں اِس سے کیا نقصان ہوگیا؟ حال ہی میں افغانستان کی طالبانی حکومت نے فقہِ حنفی کے مطابق قوانین کا نفاذ کیا تھا، جس میں سلفی حضرات بھی شریکِ حکومت تھے، اس سے کیا اندرونی اختلافات پیش آئے؟ اور رہی بات سقوط کے اسباب کی؛ تو حالات کے پس منظر سے باخبر حضرات خوب جانتے ہیں کہ اُس کے عوامل عالمی منظرنامے سے تعلق رکھتے تھے، نہ کہ مقامی اور داخلی مسائل سے، جیسا کہ اس کا اندازہ سعودی حکومت کے استحکام سے بھی لگایا جاسکتا ہے، جو کہ فقہِ حنبلی کی طرف منسوب ہے۔

اس کے برخلاف پاکستان نے حکومتی سطح پر جو کسی خاص مسلک کو نہیں اپنایا تو یہ اُس کے لیے انتظامی طور پر مفید ہوا؛ یا مضر؟

صورتِ حال کے اِس تجزیے سے اندازہ ہوا ہوگا کہ ہمارا اصل اختلاف علمی اور اصولی بنیادوں پر نہیں ہے، بلکہ اُس کا بڑا حصہ نفسانی اور جذباتی بنیادوں پر ہے۔

۳: مسئلہ کو ایک اور نظر سے دیکھیے، کہا اور سمجھا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں امت کے اندر کوئی فرقہ یا کوئی گروہ وجود میں نہیں آیا تھا، اور سارے لوگ ایک نقطۂ اتحاد پر متفق تھے، حالاں کہ جاننے والے جانتے ہیں کہ ''ضرار'' نامی مسجد اسلام ہی کی طرف منسوب کچھ لوگوں نے بنائی تھی، بس فرق یہ تھا کہ اُس وقت تازہ بتازہ وحیِ آسمانی کا سلسلہ جاری تھا، اِس لیے اللہ عالم الغیب والشھادۃ کی طرف سے ایسے لوگوں کی نشاندہی کردی جاتی تھی، اور اُن کے شر سے امت کو بچا دیا جاتا تھا، اُس کے بعد وحی کا یہ سلسلہ بند ہوگیا، اَب ایسے لوگوں کی تعیین کا الہامی اعتبار سے کوئی قطعی ذریعہ نہیں رہ گیا، سوائے اس کے کہ اُن کے اقوال واعمال کو کتاب وسنت کی کسوٹی پر کسا جائے، اور ظاہری اعتبار سے اُن کے بارے میں کوئی رائے قائم کی جائے۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خلیفۂ اول سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ کے خلیفہ نامزد ہوتے ہی مرتدین اور مانعین زکوۃ کے فرقے وجود میں آئے، یہ الگ بات ہے کہ حضرتؓ کی اولوالعزمی اور ثباتِ قدمی کے سامنے وہ جلد ہی اپنا وجود کھو بھی بیٹھے۔

خلیفۂ دوم سیدنا حضرت عمرؓ کے دور کو ایسا واحد دور کہا جاسکتا ہے جس میں اِسلامی منظرنامے پر ''منافقین'' کا کوئی ٹولہ کہیں نظر نہیں آتا، البتہ انفرادی طور پر ایسے لوگوں کی ایک بڑی تعداد ضرور وجود پذیر ہوچکی تھی، جو بعد میں چل کر مستقل کا ایک فتنہ بنی، اسی کا ایک فرد ''فیروز ابولؤلؤہ مجوسی'' (بابا شجاع الدین ایرانی ؟!) قاتلِ حضرت عمرؓ تھا۔

خلیفۂ سوم سیدنا حضرت عثمانؓ کے آخری دورِ خلافت میں پہلی مرتبہ کھلم کھلا ایسے فرقے کا وجود ہوا جو اپنی ساری "لامذہبیت" کے باوصف (انتہائی درجے کے "تقیہ" اور "نفاق" کے ذریعے) خود کو جماعتِ مسلمین میں شمار کرانے میں کامیاب ہو گیا، جس کا سب سے پہلا، بڑا ظاہری نقصان متفقہ اسلامی حکومت کے خلاف علمِ بغاوت بلند ہونا، اور پھر خلیفۂ راشد سیدنا حضرت عثمانؓ کا اندوہناک حادثۂ شہادت پیش آجانا ہے۔

تاریخ کا یہی وہ موڑ ہے جہاں سے باقاعدہ طور پر "فرقوں" کے وجود کا آغاز ہوتا ہے، پھر تو جادۂ اعتدال اور صراطِ مستقیم سے بھٹک کر "روافض"، "خوارج"، "قدریہ"، "جبریہ"، "معتزلہ"، اور "مرجئہ" جیسے نامعلوم کتنے فرقے وجود میں آتے چلے گئے، ظاہر ہے کہ امت میں ظہور پذیر ہونے والے اِن فکری اور اعتقادی اختلافات کا منشا ائمۂ حق کی تقلید اور اتباع نہیں تھا، بلکہ دشمنانِ دین کی طرف سے تخریبِ دین اور تخریبِ مسلمین کی ناکام کوشش کے طور پر تھا۔

قرآن کریم میں ﴿إن الذين فرقوا دينهم وكانوا شيعاً﴾ (الأنعام: ۱۵۹) وارِد تو ہوا ہے یہود و نصاریٰ سے متعلق سیاق میں، مگر لفظِ "شِيَعاً" کی بلاغت ہے بہت معنی خیز!

۴: ائمۂ اربعہ: امام ابوحنیفہؒ (ت: ۱۵۰ھ)، امام مالکؒ (ت: ۱۷۹)، امام شافعیؒ (ت: ۲۰۴) اور امام احمدؒ (ت: ۲۴۱)، یہ حضرات تو دوسری اور تیسری صدی کے ہیں، اور پھر ان کی باقاعدہ تقلید تو اور بعد میں شروع ہوئی، تو پھر امت میں مذکورہ انتشار وافتراق کیوں کر پیدا ہوا؟

اِن تفصیلات سے اندازہ ہوا ہوگا کہ مسئلہ کی اَصل بنیاد: تقلید و اتباع وغیرہ نہیں ہے، بلکہ خارجی طور پر: دانا دشمنوں کی مکاری وعیاری، اور پولُس یہودی کے جانشینوں کی تخریب کاری ہے، اور داخلی طور پر: معاشرہ میں پنپنے والی وہ نفسانی بیماریاں اور روحانی

امراض ہیں جن کو شرعی اصطلاح میں: کبر وعجب، بغض وعناد، حسد وکینہ اور نفاق وغیرہ سے موسوم کیا جاتا ہے۔

اگر معاشرہ کی اِن کمزوریوں کو کسی قوتِ قاہرہ یا تطہیر قلوب اور تزکیۂ نفوس کے ذریعے مغلوب کیا جاسکے، تو عرب وعجم جیسے متضاد اور متحارب طبقات کو بھی اتحاد واتفاق کے ایسے نقطہ پر جمع کیا جاسکتا ہے، کہ ساحلِ سندھ پر اگر کسی ایک مسلم عورت پر بھی زیادتی ہورہی ہو تو دمشقِ شام سے پورا لشکر جرار اُس کی مدد کو پہنچ جائے۔

اور اگر اِن خرابیوں کی اِصلاح نہ کی جائے تو پھر سارے نقاطِ اتحاد کے مہیا ہوجانے کے بعد بھی، آپسی رنجشوں اور تنازعات کو کسی طرح ختم نہیں کیا جاسکتا۔

زیادہ دور نہیں؛ اپنے اپنے گھروں یا آس پاس کے ماحول ہی کا جائزہ لے لیا جائے کہ کیسے حقیقی بھائیوں تک کے درمیان شقاق واختلاف پیدا ہوجاتے ہیں، اور العیاذ باللہ نوبت کشت وخون اور مقدمہ وعدالت تک کی آجاتی ہے، کوئی مفکر صاحب بتائیں کہ وہاں کون سی ''تقلید'' کارفرما ہوتی ہے؟!

خلاصہ یہ کہ تفرق وتشتت اور افتراق وانتشار میں علمی اور اصولی اختلافات سے کہیں زیادہ، عملی اور نفسانی کمزوریاں اثر انداز ہوتی ہیں، اِس لیے جو اَصحابِ فکر اُمت کے اِس مسئلہ کو حل کرنا چاہتے ہیں اُن کے لیے ضروری ہے کہ علمی مباحث اور ذہنی عیاشیوں میں پڑنے کے بجائے، عملی میدان میں تشریف لائیں، اور جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے اپنے ذاتی اخلاق وکردار کا عملی نمونہ پیش فرمایا، پھر لوگوں کی عملی زندگی کی اِصلاح وتربیت کی طرف توجہ فرمائی، اور مکہ کی سنگلاخ زمینوں میں اخلاقِ فاضلہ اور اسوۂ حسنہ کا ایسا ''شجرۂ طیبہ'' لگایا، اور اُس کی ایسی آبیاری فرمائی کہ اُس کی جڑیں تو زمین میں پیوست ہیں، اور پتے آسمان سے باتیں کررہے ہیں: ﴿أصلها ثابت وفرعها في السماء﴾، اور سرزمین عرب کے جاہلانہ اور رسومانہ ماحول میں علم وعمل کی

وہ جوت جگائی، کہ ارضِ عرب میں پائی جانے والی بادیہ نشینوں کی یہ جماعت رشکِ ملائک اور ہم دوشِ ثریا ہوگئی۔

اِسی طرح اِصلاحِ قوم کے دعویداروں کے لیے لازم ہے کہ پہلے اپنا کیرکٹر، معمولاتِ زندگی اور طرزِ عمل درست کریں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے کریمانہ اور شریفانہ اَخلاق اپنے اندر پیدا کریں، پھر قرآن وحدیث میں مذکور عقائد واعمال اور اخلاق وتہذیب کی طرف لوگوں کو دعوت دیں، اگر من جانب اللہ مقبولیت مقدر ہوگی، تو اِصلاحی سلسلہ آگے بڑھے گا، اور جب تک منظور ہوگا، باقی رکھا جائے گا۔

پھر علمی اور اصولی اختلاف کے سلسلے میں یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ ہر علمی اِختلاف نہ تو مضر ہوتا ہے، نہ مذموم، بلکہ کچھ اختلافات تو ایسے ہیں جن کا اِظہار شرعاً فرض ہے، قارئین کی علمی اور دینی تسکین کے لیے ''اِختلاف، اُس کی حقیقت، قسمیں اور حدود'' بتوفیقہ تعالی مزید وضاحت کے ساتھ پیش کی جاتی ہیں:

اِختلاف، اُس کی حقیقت، قسمیں اور حدود:

یاد رکھنا چاہیے کہ یہاں چار اُمور ہیں: اِختلاف حقیقی، اِختلافِ غیر حقیقی، تعدُّد اور تنوُّع۔

ا: ''اِختلاف حقیقی'' کا مطلب ہوتا ہے کہ ایک کو ماننے سے دوسرے کا اِنکار خود بخود لازم آجائے، اور دونوں میں جمع وتطبیق ممکن ہی نہ ہو، جیسے گرمی اور ٹھنڈک کا اِختلاف، کہ آگ کے گرم ہونے کا اِقرار اُس کی ٹھنڈک کے اِنکار کو مستلزم ہے، لہٰذا جو شخص آگ کو گرم کہہ رہا ہے اُس سے دوسرا پہلو قبول کروانے کی الگ سے ضرورت نہیں۔

یا جیسے ''اِسلام اور کفر'' کا اِختلاف، کہ اگر کوئی شخص کسی کفریہ عقیدے کو درست سمجھ رہا ہے، تو اُس کے ''اِسلام'' کے ثبوت اور بقا پر گفتگو کرنے کی ضرورت ہی نہیں، کفر، یا عقیدۂ کفر کا اقرار، خود بخود اِسلام کے اِنکار کو مستلزم ہے، مزید دلیل فراہم کرنے کی

ضرورت نہیں۔

قرآن کریم میں جس "اِختلاف" کے نہ پائے جانے کا چیلنج کیا گیا ہے؛ اُس سے یہی مراد ہے: (النساء:۸۲) ﴿افلا یتدبرون القرآن، ولو کان من عند غیر الله لوجدوا فیہ اختلافاً کثیراً﴾ (کیا یہ لوگ قرآن میں تدبر نہیں کرتے، اگر یہ غیراللہ کی طرف سے ہوتا تو اِس میں یہ بہت اِختلاف پاتے)۔ مگر چوں کہ یہ غیراللہ کی طرف سے ہے نہیں، اِس لیے (غیر محفوظ ویدوں، اور تحریف شدہ تورات اور اناجیل وغیرہ کی طرح) اِس کے مضامین میں کوئی اِختلاف اور تناقض بھی نہیں ہے۔

۲: "اِختلافِ غیرحقیقی" کا مطلب یہ ہے کہ دو (یا زائد) چیزوں میں بظاہر تو اِختلاف اور تعارض محسوس ہورہا ہو، مگر وہ حقیقتاً نہ ہو، بلکہ اُس کا منشا: زمان، یا مکان، یا افراد اور مخاطبین کا فرق ہو، مثلاً:

(۱) قرآن کریم کی ایک آیت (البقرۃ:۲۴۰) سے معلوم ہوتا ہے کہ جس عورت کا خاوند فوت ہوجائے، اُس کے لیے متوفی کے گھر والوں کی طرف سے ایک سال تک رہائش اور نفقہ کا انتظام کیا جائے، دوسری آیت (البقرۃ:۲۳۴) سے معلوم ہوتا ہے کہ رہائش کا انتظام صرف چار ماہ دس دن تک کرنا ہے، اِن دونوں میں اگرچہ بظاہر تعارض محسوس ہورہا ہے، مگر حقیقتاً ایسا ہے نہیں، بلکہ پہلا حکم ابتدائے اِسلام میں تھا، بعد میں منسوخ کردیا گیا، جیسا کہ احادیث میں اس کی تصریح موجود ہے۔

(۲) قرآن کریم میں بہت سے مواقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار کی زیادتیوں پر صبر، صفح اور عفو سے کام لینے کا حکم دیا گیا ہے، اور دوسرے بہت سے مقامات پر حملہ، قتال اور اِرہاب کی ہدایت فرمائی گئی ہے، ظاہر ہے کہ یہ حکم میں اختلاف نہیں ہے، بلکہ موقع ومحل کا اِختلاف ہے؛ کہ اول کا تعلق دارالحرب کی مغلوبیت ومقہوریت سے ہے، اور ثانی کا تعلق دارالاسلام کی قدرت وقوت سے ہے۔

(۳) ایک حدیث شریف (ابوداود: ۲۳۸۷) میں ہے کہ ایک شخص نے روزے کی حالت میں بیوی سے بوس وکنار کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا، آپ نے انھیں اِجازت مرحمت فرمادی، کسی اور نے اِجازت چاہی، آپ نے منع فرمادیا، بعد میں معلوم ہوا کہ جن کو اِجازت ملی تھی وہ معمر ہو چکے تھے، اور جن کو ممانعت کی گئی تھی وہ جوان تھے، ظاہر ہے کہ یہاں مخاطب کے فرق کوملحوظ رکھا گیا ہے۔

۳: تیسرا لفظ ہے "تعدد" (ایک سے زائد)، متعدد چیزیں ایک دوسرے کے منافی نہیں ہوتیں، بلکہ سب کا الگ الگ مقام ومرتبہ ہوتا ہے، جیسے نماز کی رکعات، کہ وہ متعدد ہوتی ہیں، مختلف نہیں، یا اَرکانِ اِسلام اور اَحکامِ دین کہ یہ متعدد ہیں، باہم مختلف نہیں۔

۴: چوتھا لفظ ہے "تنوُّع" (متعدد قسمیں)، تنوع کی صورت میں بھی ایسا تضاد اور تعارض نہیں ہوتا کہ سمجھوتے کی کوئی شکل نہ ہو، جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج وغیرہ عبادات، کہ ان میں تنوع ہے، تعارض نہیں۔

آیئے! اِس مسئلے کو ایک عام فہم مثال سے سمجھئے:

گھی، دہی، بالائی، مکھن، پنیر، کریم وغیرہ ایک ہی اصل (دودھ) سے نکلنے والی متنوع اشیا ہیں، اِن کا تنوع معاشرے کی ناقابلِ اِنکار ضرورت ہے، کوئی تنہا شخص دودھ سے یہ سب چیزیں برآمد کرے، یا مختلف لوگ مختلف چیزوں کا کاروبار کریں، دونوں میں کوئی حرج نہیں، پھر کبھی ان سب کو ایک ہی برتن میں رکھنے کا اتفاق ہو جائے، تو باذوق حضرات کو ذائقہ تو گراں گذرے گا، مگر کسی قسم کی سمّیت اور مضرت کا اندیشہ نہیں۔

اِس کے برعکس اگر کوئی شخص نقلی چیزوں کو دودھ کی اصلی چیز کہہ کر بازار میں کھپانا چاہے، تو ایک متدین معاشرے کے اعتبار سے یہ بدترین خیانت، اور ایک پاکیزہ ماحول کے لیے یہ انتہائی بدنما داغ ہوگا، اسی طرح خالص دودھ کی اشیا میں سرسوں کا تیل ڈال دیا

جائے، تو ذائقہ اور شکل ہر چیز بدل کر رہ جائے گی، اور اگر اس سے بھی آگے بڑھ کر مٹی کا تیل یا زہر کا ایک قطرہ ملا دیا جائے، تو دودھ کی لذت اور لطافت تو دور کی بات رہی، اب تو اُس کی حقیقت اور خاصیت بھی برقرار نہیں رہ گئی۔

"کتاب وسنت" کی مثال بھی دودھ کے شیریں چشمہ کی سی ہے، اہلِ علم اُس سے اپنی اپنی عقل وفہم کے اعتبار سے حسبِ ذوق علوم ومعارف کا استخراج واستنباط کرتے رہتے ہیں، طرح طرح کے نوع بنوع مسائل کتاب وسنت کے اِسی چشمۂ فیض سے مستفاد ہوتے رہتے ہیں، جب تک ان کی اصل "کتاب وسنت" ہی کی طرف لوٹتی رہے، اس میں کوئی حرج اور کوئی قباحت نہیں، بلکہ یہ قوم کی ضرورت اور سعادت کی بات ہے، جن حضرات نے اپنے اپنے ذوقِ اجتہاد سے جو استنباطات کیے ہیں، اُن سے وہ خود بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اور جائز ومناسب طریقے سے دوسروں کو بھی راغب کر سکتے ہیں، اِس میں بھی کوئی خرابی نہیں۔

خرابی یہاں سے پیدا ہوتی ہے کہ کچھ اہلِ دجل وتلبیس بے دینی کی باتوں کو دین کی طرف منسوب کرنا شروع کر دیتے ہیں، کچھ بد دین شرعیات میں، غیر شرعیات کی ملاوٹ کرنے لگتے ہیں، اور بہت سے ظالم تو کفر ونفاق کا "زہر ہلاہل" ملا کر قومِ مسلم کی جڑ، اُس کی اصل سے کاٹ دینا چاہتے ہیں، اور مسلمانوں کا سر رشتہ، مذہب اِسلام سے توڑ دینے کی سعیٔ نامسعود میں مصروف رہتے ہیں۔

مسلمانوں کی وہ تمام جماعتیں جو "کتاب وسنت" کی بنیادوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول: متواتر ومتوارث اصولوں پر کام کر رہی ہیں، مذاق ومزاج کے تفاوت اور طرزِ عمل وطریقۂ کار کے اِختلاف کے باوجود؛ نقطۂ اتفاق سب کے اندر موجود ہے، اور ان سب کا کسی مسئلے پر متحد ہو جانا نہ مشکل ہے، نہ مضر۔

البتہ جو اِس بنیادی اصل سے منحرف ہیں، خانہ ساز افکار ونظریات کو اِسلام کی

طرف منسوب کرنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ فریبی اور دھوکے باز ہیں، برادرانِ اسلام کو ایسے جعل سازوں سے سخت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔

اِسی طرح جو ظالم اِسلامی باتوں میں کفر کی غلاظت اور نفاق وتقیے کی گندگی ملا کر اِسلامی منڈی میں پہنچانا چاہتے ہیں، وہ بھی "ملتِ اِسلامیہ" کے لیے ایک ناسور ہیں، جن سے جلد از جلد گلوخلاصی کی تدبیر ہر مسلمان پر واجب ہے۔

اہلِ اِسلام کے درمیان جب بھی اِتحاد واتفاق کی کوشش کی جائے، تو لازم ہے کہ اِس معیار کا پورا لحاظ رکھا جائے، اور صرف اُنہی افراد، جماعتوں اور سلسلوں کو متحد ومتفق کرنے کی کوشش کی جائے، جو "کتاب وسنت" اور اُن سے ثابت شدہ حتمی اُصولوں سے کم از کم ظاہراً مربوط ہوں، پھر جس کا جس درجہ انتساب ہو، اُس کو اسی حیثیت پر رکھا جائے۔

اور جن فرقوں نے خود کو "کتاب وسنت" کی بنیادی اصل ہی سے کاٹ رکھا ہے، جو گروہ اِس اساسی نقطہ ہی سے منحرف ہو چکے ہیں، اور جو افراد اِس مسلمہ آئین ہی سے باغی ہو رہے ہیں، اُن کو ساتھ لینے کی کوشش ہی امت کا اَب تک کا سب سے بڑا المیہ ہے، علاج بیمار اعضاء کا کیا جاتا ہے، سڑے ہوئے، متعفن اور بدبودار اعضاء کو علاج کی امید پر باقی رکھنا جسم کے بقیہ حصوں کے ساتھ، بڑی زیادتی اور سخت نااِنصافی ہے۔

اِس تمہیدی گفتگو کو ذہن میں رکھتے ہوئے آئندہ سطور ملاحظہ فرمائی جائیں۔

مسلمانوں کے آپسی اختلافات

قسمیں اور حدود

ایک مسلمان کا کسی سے اختلاف یا تو دینی ومذہبی بنیاد پر ہوسکتا ہے، یا دنیوی وذاتی بنیاد پر، دینی اختلاف کی دوصورتیں ہیں: اصولی اور فروعی:

(۱) دینی اصولی اختلاف

دینی اختلاف اگر اصولی مسائل میں ہے تو اُس کی بھی دوصورتیں ہیں: ایمان وکفر کا اختلاف، اور سنت وبدعت کا اختلاف۔

۱-: ایمان وکفر کا اختلاف

اِختلاف: اگر ایمان وکفر میں ہے، کوئی فرد یا جماعت: کفریہ، یا شرکیہ عقائد واعمال اختیار کیے ہوئے ہے، تو ایک مسلمان پر اس سے اِختلاف رکھنا، اور مناسب انداز میں اس کا اظہار کرنا فرض ہے، اور کفر وشرک سے بیزاری ظاہر کرنا لازمۂ ایمان ہے، صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا خاص وصف قرآن کریم نے یہی بیان فرمایا ہے: ﴿والذین معه أشداء علی الکفار رحماء بینهم﴾ (الفتح:۲۹) (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہنے والے کافروں پر تو سخت ہوتے ہیں، اور آپس میں رحم دِل)۔

۲-: سنت وبدعت کا اختلاف

اور اگر یہ اصولی اختلاف سنت وبدعت کا ہے تو بھی اس کا اِظہار اور اِحقاق ضروری ہے۔

البتہ ''سنت'' و ''بدعت'' کے بارے میں اِجمالی طور پر اتنی بات ملحوظ رکھنی ضروری ہے کہ دِین کی اصل اور بنیاد: ''کتاب اللہ'' اور ''سنتِ رسول اللہ'' ہیں، جن کی تشریحی اور عملی تکمیل ''اِجماعِ امت'' اور ''قیاسِ شرعی'' سے ہوتی ہے، اِس لیے اِجماع وقیاس کی طرف رجوع کرنا؛ یہ بھی کتاب وسنت ہی سے ثابت شدہ مسئلہ ہے، جیسا کہ اِس کی تفصیل اِن شاء اللہ ''نقل'' کی بحث میں آجائے گی۔

لہٰذا دِین کے وہ (فکری یا عملی) اُمور جن کا تقاضا ہی آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانہ کے بعد سامنے آیا ہو (جیسے شرعی علوم کی اصطلاحات اور اُن کی تعیین وتدوین)، یا جس کی کوئی اصل شریعت میں موجود ہو، صرف حالات وافراد کے اعتبار سے کوئی خاص شکل بعد میں متعیَّن کی گئی ہو (جیسے خدمتِ دین کے لیے مدارس دینیہ کا سلسلہ)، ایسے امور شرعاً ''بدعت'' میں شمار نہ ہوں گے۔

بدعت کی حقیقت:

''بدعت'' کے لغوی معنی ہیں: ''بغیر نمونہ کے کوئی چیز بنا دینا''، شریعت میں بدعت ایسے عقیدہ، اور طریقہ کو کہا جاتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیِّبہ میں فکراً یا عملاً اُس کے تقاضے کے پائے جانے کے باوجود اُس کو اپنایا نہ گیا ہو، اور شریعت کے دلائلِ اربعہ: کتاب، سنت، اجماع اور قیاس میں اُس کی کوئی اصل بھی نہ ہو، پھر اُس کو بطور عبادت اور بنیّتِ ثواب کیا جائے (جیسے عید میلاد النبی، عرس مشائخ اور تزئین قبور وغیرہ)۔

پھر ''سنت'' و ''بدعت'' کا یہ مفہوم اثباتاً ونفیاً دونوں طرح سے ملحوظ ہوتا ہے، لہٰذا جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اختیار کردہ معمولات ''سنت'' کی تعریف میں آتے ہیں، اِسی طرح بالقصد ترک کردہ اعمال سے اجتناب کرنا بھی سنت ہی کا حصہ ہے۔
اور جس طرح خارجِ دین کو، دین میں داخل کرنے کی کوشش کرنا ''بدعت''

ہے، اسی طرح داخلِ دین کو خارج از دین کرنے کی کوشش بھی بدعت ہی ہے، مثلاً نماز روزہ وغیرہ عباداتِ ظاہرہ کا اِنکار، یا ختمِ نبوت، فرشتوں، روزِ قیامت، جنت، دوزخ، معجزاتِ انبیاء وغیرہ عقائد کا انکار۔

بدعت کی قسمیں اور اُن کا حکم:

۱: پھر کچھ بدعات تو کفر تک پہنچ جاتی ہیں، جیسے متواتر طور پر خارج از دین امور کا داخلِ دین کرنا، یا متواتر طور پر داخل امور کا خارج از دین کرنا، مثلاً نماز وغیرہ عبادات، یا جنت، دوزخ، ملائک اور آخرت وغیرہ مغیبات کا اِنکار، یا قرآن میں وجودِ تحریف، یا نقصِ دین کا قائل ہونا، یا جھوٹ (بنامِ تقیّہ) وغیرہ کے داخلِ دین ہونے کا عقیدہ رکھنا۔

بدعت کی یہ قسم چوں کہ کفریہ ہے، اِس لیے اِس کے مرتکبین سے عام حالات ومعاملات (جیسے نکاح وغیرہ) میں اہل کفر ہی جیسا معاملہ رکھا جائے گا۔

۲: اور کچھ بدعات موجبِ فسق ہوتی ہیں:

الف: جیسے تواتر یا سندِ صحیح سے ثابت معجزات میں تأویل کرنا، قرآنِ کریم کی تفسیر بالرائے (من گھڑت) اور اَحادیثِ شریفہ کی خود ساختہ تشریحات کرنا، سماع، میلاد، فاتحہ وغیرہ کی مشروعیت کا قائل ہونا، شرعی حدود سے بڑھ کر قبروں کی تعظیم کرنا...... وغیرہ۔

ب: بدعت کی اِس سے بھی زیادہ خطرناک صورت یہ ہے کہ آیات وروایات کا بے محل استعمال کیا جائے، اور مقصودِ شرعی اور معہود ومتبادر مدلولِ لفظی سے ہٹ کر نصوص شرعیہ سے استدلال کیا جائے، یہ صورت بعض ''دین پسند'' حلقوں میں بھی پائی جاتی ہے۔

ج: اِسی طرح شریعت کے کسی مسئلے کو اُس کی مطلوبہ شرعی حیثیت سے بڑھا دینا، کسی مسئلے کو اُس کی معیّنہ شرعی حیثیت سے گھٹا دینا، قرآن اور اَحادیثِ صحیحہ کے کسی عام حکم کو کسی خاص صورت کے ساتھ مخصوص کر دینا، یا اِس کے برعکس کسی خاص حکم کو عام کر دینا ...... بھی ''بدعت'' ہی کا حصہ ہے۔

بدعت کی آخری تینوں قسموں کے مرتکبین اپنی گمراہی کے باوجود اِسلام سے خارج نہیں ہوتے، اِس لیے اُن سے عام حالات ومعاملات میں تو اہلِ اِسلام ہی جیسا معاملہ کیا جائے گا، مگر اُن کی بدعت پر حسبِ قدرت روک ٹوک کرتے رہنا بھی ضروری ہے، تاکہ حق وباطل میں خلط نہ ہونے پائے۔

(۲) دینی فروعی اختلاف

یہ تفصیل تو دین کے اندر اصولی اختلاف سے متعلق تھی، اور اگر اِختلاف فروعی مسائل میں ہو تو اُس کی بھی دو صورتیں ہیں:

۱- علم وتحقیق کی بنیاد پر ہونے والا اختلاف:

چونکہ نصوص کے سمجھنے میں عقول کا اِستعمال ہوتا ہے، اور عقول کا مختلف اور متفاوت ہونا ایک فطری امر ہے، اور ساتھ ہی اِستعداد، فہم، ذوق اور وسعتِ نظر کا فرق بھی اثر انداز ہوتا ہے، کیوں کہ ہر دو شخصوں میں اِن تمام چیزوں میں برابری شاذ ونادر ہی ہوتی ہے، اِس لیے نیتجتاً وجوہِ استنباط واِستخراج میں، اور نصوص کے معانی اور مفاہیم میں بھی اِختلاف ہو جاتا ہے، صحابہٴ کرامؓ کے درمیان بھی ایسے اِختلاف پیش آتے رہتے تھے:

۱: ایک مرتبہ دو صحابیؓ سفر میں تشریف لے گئے، راستہ میں تیمم کی نوبت آ گئی، دونوں نے تیمم کر کے نماز پڑھ لی، اتفاق سے وقت کے اندر ہی پانی مل گیا، تو ایک نے تو فرمایا کہ ہم نماز پڑھ چکے، کافی ہے، دوسرے نے کہا کہ وقت باقی ہے دہرا لینی چاہیے، غرضیکہ دونوں کی رائے میں اختلاف ہوگیا، دونوں نے اپنی اپنی رائے پر عمل کرلیا، واپسی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے تفصیل بتائی، آپ نے ایک پر اکتفاء کرنے والے سے فرمایا: ''أصبتَ السنةَ، وأجزأتك الصلاةُ'' (کہ تم نے مسئلہ کے مطابق عمل کیا، اور تمہاری نماز کافی ہوگئی)، دوسرے سے فرمایا: ''لك الأجر مرتين'' (تم نے دو مرتبہ نماز پڑھی

ہے تم کو دو مرتبہ اجر ملا) (ابوداود ا:۴۹، نسائی ا:۴۹)۔

علماء نے لکھا ہے کہ سنت کے اِتباع کی بناء پر پہلے کا ایک ہی اجر دوسرے کے دوہرے اجر سے بڑھ گیا، پھر پہلے کو اجتہاد کی اِصابت و درستگی کا دوگنا ثواب الگ ملا۔

۲: غزوۂ اَحزاب (جنگِ خندق) سے لوٹتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے فرمایا کہ بنو قریظہ تک پہنچنے سے پہلے عصر کی نماز کوئی نہ پڑھے، اتفاق کی بات کہ راستہ ہی میں نماز کا وقت ہوگیا، صحابہ میں دو رائے ہوگئی، کچھ حضرات نے فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد سفر کی عجلت تھا، نماز کو وقت سے مؤخر کروانا مقصود نہیں تھا، اِس لیے جب وقت ہوگیا تو نماز پڑھ لینی چاہیے، دوسری جماعت نے کہا کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بات اپنی زبانِ مبارک سے فرمادی تو ہم کون ہوتے ہیں اُس میں منشا اور مقصد تلاش کرنے والے، اِس لیے ہم تو وہیں جا کر نماز پڑھیں گے، بعد میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر آیا، آپ نے کسی پر کوئی نکیر نہیں فرمائی۔

(بخاری ا:۱۲۹، ومسلم ۲:۹۶)۔

اِس سے معلوم ہوا کہ علم وتحقیق کی بنیاد پر ہونے والے اجتہادی اختلاف میں کوئی حرج نہیں ہے، شرط یہ ہے کہ ہر فریق اپنے اجتہاد میں خطا کا اِمکان اور دوسرے کے اجتہاد میں درستگی کا اِمکان ملحوظ رکھتے ہوئے، دوسرے فریق کی نہ تحقیر کرے، نہ تضلیل وتفسیق، بلکہ جب اِختلاف اجتہادی ہی ٹھہرا تو جیسے مصیب کو ثواب ملتا ہے، ایسے ہی مخطیٔ کو بھی اجر ملتا ہے، تو جس عمل پر اللہ تعالیٰ اجر دے رہے ہوں اُس پر کسی کا ناراض ہونا، اور لعن طعن کرنا کہاں کی مسلمانی ہے؟ قرآن وحدیث میں عام طور سے دین کے بارے میں: اختلاف، تنازع، مجادلہ وغیرہ کی جو ممانعتیں وارد ہوئی ہیں وہ ایسے ہی اجتہادی اختلافات میں غلو سے متعلق ہیں:

ا: بخاری (۲:۷۵۷) ومسلم (۲:۳۳۹) کی روایت ہے: ’’اقرؤوا القرآن ما

ائتلفت عليه قلوبكم، فإذا اختلفتم فقوموا ''(قرآن کریم پڑھتے رہو اور اُس کے معانی ومطالب میں آپسی تبادلۂ خیال کرتے رہو، لیکن اگر اختلاف کی نوبت آنے لگے تو فوراً مجلس سے اٹھ جاؤ) (فتح الباری: ۵۰۶۰، ومرقاۃ: ۲۱۹۰)۔

۲: ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا (ترمذی ۲:۱۶۱، وقال: حسن صحیح): ''ما ضل قوم بعد هدى كانوا عليه إلا أوتوا الجَدَلَ ''(کوئی قوم ہدایت پا جانے کے بعد بے راہ نہیں ہوتی، مگر آپس کے اختلافات میں الجھا دی جاتی ہے)۔

۳: ایک مرتبہ دو صحابہؓ کے درمیان کسی آیت کے سلسلہ میں اختلاف ہو گیا، معاملہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچا، آپ نے فرمایا (بخاری ۱:۴۹۴): ''اقرءا، فكلا كما محسن، ولا تختلفوا، فإن من كان قبلكم اختلفوا فهلكوا ''(پڑھو، دونوں صحیح پڑھ رہے ہو، اور اِس طرح اختلاف اور تنازع مت کیا کرو، کیوں کہ تم سے پہلے کی امتیں بھی آپس میں لڑنے اور الجھنے لگی تھیں، اِسی لیے ہلاک ہو گئیں)۔

۴: حضرت ابوسعید خدریؓ اور حضرت جابرؓ سے روایت ہے (مسلم: ۱۱۱۷):

''سافرنا مع رسول الله صلى الله عليه وسلم، فيصوم الصائم، ويفطر المفطر، فلا يعيب بعضهم على بعض '' (ہم لوگ ایک سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، کچھ ساتھی تو عزیمت پر عمل کرتے ہوئے روزے رکھ رہے تھے، اور کچھ ساتھی رخصت پر عمل کرتے ہوئے روزے قضا کر رہے تھے، اور کوئی ایک دوسرے پر تنقید نہیں کر رہا تھا)۔

فروعی اِختلاف کے جواز کی شرطیں:

لہٰذا فروعی اِجتہادی اِختلاف کی صورت میں یا تو کوئی ایک تقلیداً دوسرے کی بات مان لے، ورنہ پھر یہ اختلاف باقی ہی رہ جاتا ہے، اور اِس میں کوئی حرج بھی نہیں، البتہ اِس میں چند شرطیں ملحوظ رہنی چاہئیں:

۱: اِس تحقیق اور اِختلاف کا منشا محض تلاشِ حق اور رضائے رب ہو، نفسانیت اور بدعت و باطل کی تائید پیش نظر نہ ہو۔

۲: اس تحقیق سے اِسلام کی خشتِ اول اور بنائے اولیں: جمہورِ صحابہؓ کی تغلیط نہ لازم آتی ہو۔

۳: جو تحقیق پیش کی جائے، دلالت کی وجوہِ معتبرہ کے ذریعے نص سے اُس کا ثبوت ہوتا ہو۔

یہاں یہ واضح رہنا چاہیے کہ "اِجتہاد" کی بنیاد اِس اصول پر ہے کہ منصوص اَحکام میں موجود علت کا تعدیہ، غیر منصوص اَحکام کی طرف کیا جائے، نہ یہ کہ خود نص یا منصوص ہی میں تصرف شروع کردیا جائے۔

۴: اگر دونوں فریق کی تحقیق میں گذشتہ تینوں شرطیں پائی جارہی ہوں تو پھر ضروری ہے کہ ہر فریق اپنے اجتہاد کو راجح سمجھتے ہوئے، اُس میں خطا کا اِحتمال اور دوسرے کے اجتہاد کو مرجوح سمجھتے ہوئے، اُس میں درستگی کا اِحتمال ملحوظ رکھے۔

۵: جس کی بنا پر اپنی رائے پر عمل کرتے ہوئے، دوسرے کی رائے کا بھی احترام کرے، اُس کی نہ تحقیر کرے، نہ تضلیل و تفسیق۔

۲: جہل وعناد کی بنا پر کیا جانے والا اختلاف:

اور اگر مذہبی فروعی اختلاف کا منشا علم و تحقیق نہ ہو، بلکہ جہل وحماقت، یا بغض وعناد ہو، ایسے اِختلاف کا اِس کے علاوہ اور کیا علاج ہوسکتا ہے کہ جاہل اور ناواقف لوگوں کو اپنی اِس کمی کا اِحساس ہوجائے، اور وہ بذاتِ خود دِین میں دخل دینے کے بجائے، مستند اور محقق اہلِ علم سے استفادہ کا سلسلہ رکھیں، اور بغض وعناد کے مریض لوگ کسی مرتاض روحانی کی خدمت میں حاضر ہوکر، اپنی اِس روح فرسا بیماری کے معالجہ کی سنجیدہ فکر کریں، ورنہ پھر من جانب اللہ کوئی قوتِ نافذہ آئے اور ان سب کو کسی نقطۂ اتحاد پر متفق ہونے پر

مجبور کردے، یا پھر کوئی ایسا بڑا مقصد (مثلاً دین کی اور آخرت کی فکر، اللہ کا خوف اور خشیت وغیرہ) اُن سب کے پیشِ نظر ہو جائے کہ تباغض وتحاسد کی مہلت ہی نہ ملے۔

۱: بخاری (۲:۷۴۸) ومسلم (۱:۲۷۰) میں واقعہ لکھا ہوا ہے کہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے ایک مرتبہ فجر کی نماز پڑھائی، نماز کے بعد ایک شخص کہنے لگا کہ آپ نے فلانی آیت غلط پڑھی ہے، تو پہلے تو حضرت نے اپنی قراءت کا اِستناد پیش کیا کہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ سورت سنائی تھی اور آپ نے تحسین فرمائی تھی، اُس کے بعد اتفاق سے اُس شخص کے منہ سے شراب کی بدبو محسوس ہوئی، تو آپ کو غصہ آ گیا، آپ نے فرمایا کہ شراب پی کر قرآنِ کریم کی تغلیط وتکذیب کرنے آئے ہو؟! یہ کہہ کر آپ نے اُس پر شراب نوشی کی حد جاری فرمائی۔

۲: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لاعلمی کے باوجود دینی مسائل میں دخل دینے کو گمراہی بتایا ہے (بخاری ۱:۲۰، ومسلم ۲:۳۴۰): ''......إذا لم يبق عالم اتخذ الناس رؤوساً جهالاً، فسئلوا فأفتوا بغير علم، فضلوا وأضلوا '' (جب مستند علماء نہیں رہ جائیں گے تو لوگ اپنا دینی رہنما جاہلوں کو بنالیں گے، اُن سے مسائل پوچھیں گے، اور وہ بغیر علم وتحقیق کے جواب دے دیں گے، جس سے خود بھی گمراہ ہوں گے، اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے)۔

۳: جس مسئلے کی تحقیق نہ ہو، جاننے والوں سے دریافت کرلینا چاہیے، یہی ہر فن اور ہر موضوع کا اصول ہے، حدیث شریف میں ہے (ابوداود ۱:۴۹): ''إنما شفاء العي السؤال '' (علم سے درماندہ لوگوں کا علاج: سوال کرلینا ہے)۔

مگر شریعت میں سوال برائے عمل کی اِجازت اور ترغیب ہے، سوال برائے سوال (اور برائے نالج) کی نہیں، اور اگر خدانخواستہ کسی کو پریشان کرنے، لاجواب کرنے اور مجوج کرنے کی نیت سے یہ سوال کیا جارہا ہے پھر تو اور بُرا ہے:

۴:"إن النبي صلى الله عليه وسلم نهى عن الغُلُوطات "(ابوداود: ۳۶۵۶)، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غلط فہمیاں پیدا کرنے والے سوالات سے منع فرمایا ہے۔ایک اور حدیث میں ہے (بخاری۲: ۹۵۸، ومسلم۲: ۷۵):"کره النبي صلى الله عليه وسلم لكم ثلاثاً: قيل وقال، و كثرة السؤال، وإضاعة المال "(آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہارے لیے تین چیزیں ناپسند فرمائی ہیں: قیل وقال، کثرتِ سوال، اور اِضاعتِ مال)۔

علماء نے لکھا ہے کہ "قیل وقال" سے مراد ہے: لوگوں کے جملے نقل کر کر کے، اُس پر سوال کیا جائے، کہ فلاں ایسا کہہ رہا تھا، فلاں ایسا کہہ رہا تھا، یا "اگر ایسا ہو جائے تو؟ اور اگر ایسا ہو جائے تو؟" کے سوالات کرنا، اور کثرتِ سوال کا مطلب ہے: عمل اور عقائد کے لیے جتنے علم کی ضرورت ہے اُس سے زائد سوالات کرنا، اِلّا یہ کہ طالب علم ہو، کہ اُس کو فرضِ کفایہ کے طور پر تمام پہلوؤں کا اِحاطہ کرنا ضروری ہوتا ہے، اور اِضاعتِ مال کا مطلب ہے: اللہ کی خوشنودی کی جگہوں کے علاوہ مال خرچ کرنا، یا صحیح جگہ پر ضرورت سے زائد خرچ کرنا۔(فتح الباری: ۵۹۷۵، وعمدۃ القاری: ۲۴۰۸)۔

اِختلاف کی ضرر رساں صورتیں:

حاصل یہ کہ "اِختلاف" جب تک حدود کے اندر رہے، مضر نہیں، بلکہ یہ آزادیٔ رائے اور حریت فکر کی علامت، اور ایک زندہ معاشرے کی نشانی ہے، ضرر جب ہوتا ہے:

۱: جب کوئی شخص یا کوئی فرقہ "اِختلاف" کے بجائے، تخریب، تحزیب اور تفریق بین المسلمین کی مذموم کوشش کرنے لگے۔

۲: یا شریعتِ اِسلامیہ کے ثابت شدہ کسی اَمر متواتر کا اِنکار کرنے لگے۔

۳: یا نصوصِ شرعیہ میں کوئی لفظی یا معنوی تحریف کرنے لگے۔

۴: یا کوئی جاہل (علم سے کورا) اور احمق (کم عقل)، سیاق وسباق اور الفاظ

وعبارات سے قطعِ نظر اپنی خواہشات اور جذبات کو قرآنی یا حدیثی لبادہ اُڑھانے لگے۔

۵: یا اہلِ حق ہی اپنے اختلافات میں علمی، اَخلاقی اور شرعی حدود سے تجاوز کرنے لگیں۔

۶: یا علمی اِختلاف کو ذاتی مناقشات اور نجی تنازعات کا رنگ دینے لگیں۔

۷: یا علم وتحقیق کی بنیاد پر ہونے والے اِختلافات کو عوامی مجامع اور غیر متعلق مجالس کا موضوع بنایا جانے لگے۔

دنیوی بنیاد پر ہونے والا اختلاف:

اور اگر ہمارے اختلافات کی بنیاد: دین نہ ہو، بلکہ دنیا ہو، تو اُس کے حل کے شریعت میں تین طریقے ہیں:

۱: صلح وصفائی، یہ اعلیٰ اور افضل درجہ ہے، قرآنِ کریم میں اِرشاد ہے (الحجرات: ۱۰): ﴿إنما المؤمنون إخوة فأصلحوا بين أخويكم﴾ (مطلب یہ ہے کہ اہلِ ایمان تو بھائی بھائی ہیں، اِس لیے اولاً تو اُن میں اِختلاف ہونا ہی نہیں چاہیے، لیکن اگر کبھی ہو بھی جائے تو اُن میں صلح کرادیا کرو)۔

ایک اور موقع پر مسئلہ کی صورتیں بیان کرنے کے بعد فرمایا گیا (النساء: ۱۲۸): ﴿والصلح خير﴾ (یعنی: اگر فیصلہ کروانا ہے تو وہ تو اُس تفصیل کے مطابق ہوگا جو قرآن میں اس موقع پر مذکور ہے، لیکن اگر فریقین صلح کرلیں تو یہ اُن کے لیے زیادہ بہتر ہے)۔

البتہ اِس کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ صلح کی شرائط اور دفعات میں کوئی ایسی بات نہ آنے پائے جو شرعاً منع ہو، حدیث نبوی ہے (ابو داود ۲: ۵۰۶، وترمذی ۱: ۲۵۱، وقال: حسن صحیح): "الصلح جائز بين المسلمين، إلا صلحاً حرّم حلالاً، أو أحل حراماً، والمسلمون على شروطهم إلا شرطاً حرّم حلالاً، أو أحلّ حراماً"

(مسلمانوں کی آپس کی، کی ہوئی صلح شریعت کو منظور ہے؛ اِلا یہ کہ اُس میں شریعت کے حلال کو حرام، یا حرام کو حلال کیا جا رہا ہو، ایسے ہی مسلمانوں کی آپس میں طے کردہ شرطیں شریعت کو تسلیم ہیں؛ مگر شرط یہ ہے کہ شریعت کے حلال کو حرام، یا شریعت کے حرام کو حلال نہ کیا جا رہا ہو)۔

۲: آپسی اختلافات کو ختم کرنے کی ایک اور شکل ہے، وہ یہ کوئی ایک فریق اپنا حق چھوڑ کر یکسو ہو جائے، عملاً یہ صورت ہے تو بہت مشکل، مگر اجر اِس پر بہت زیادہ رکھا گیا ہے، حدیث شریف میں ہے (ترمذی ۱۹۹۳، وقال: حسن): "مَن ترك المِراءَ وهو محق بني له في وسطها" (جو حق پر ہوتے ہوئے بھی لڑائی ختم کر دے اُس کے لیے جنت کے بیچ و بیچ محل بنایا جائے گا)۔

۳: آپسی اِختلافات کو حل کرنے کی تیسری صورت: شرعی فیصلہ کو تسلیم کر لینا ہے، اور اِس بارے میں شریعت کا یہ واضح حکم موجود ہے (النساء: ٦٥): ﴿فلا وربک لا یؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینهم ثم لا یجدوا فی أنفسهم حرجاً مما قضیت ویسلموا تسلیماً﴾ (آپ کے رب کی قسم! یہ لوگ ایمان والے نہیں ہو سکتے جب تک اپنے آپسی اختلافات میں آپ کو (اور آپ کی لائی ہوئی شریعت کو) حَکَم اور فیصل نہ بنائیں، اور پھر آپ کے کیے ہوئے فیصلہ سے دِل پر کوئی بوجھ بھی نہ محسوس کریں، بلکہ پوری طرح اُس کو تسلیم کر لیں)۔

ایک اور آیت میں یہ اِرشاد ہے (النساء: ٦٠، ٦١): ﴿ألم تر إلی الذین یزعمون أنهم آمنوا بما أنزل إلیک وما أنزل من قبلک یریدون أن یتحاکموا إلی الطاغوت وقد أمروا أن یکفروا به......﴾ الآیۃ (آپ نہیں دیکھتے کہ یہ لوگ اِیمان کے دعوے کے باوجود اپنے معاملات شیطان کی عدالت میں فیصل کروانے جاتے ہیں، حالاں کہ ان کو اُس سے براءت کرنے کا حکم دیا گیا ہے)۔

تفسیر کی کتابوں (ابن کثیر وغیرہ) میں ایک واقعہ لکھا ہوا کہ دو شخصوں میں کسی بات پر اِختلاف ہوا، ایک یہودی تھا، دوسرا ظاہری مسلمان (منافق)، دونوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں فیصلہ کے لیے آئے، آپ نے تفصیل سننے کے بعد فیصلہ یہودی کے حق میں کردیا، وہ ظاہری مسلمان یہ سوچ کر کہ حضرت عمرؓ کو کافروں سے خاص کدٗ ہے، آپ شاید میرے حق میں فیصلہ کردیں، اپنا معاملہ لے کر حضرت عمر کے پاس چلا گیا، آپ نے یہودی کو بلوایا، اُس نے آتے ہی یہ بتادیا کہ عدالتِ عالیہ سے اِس معاملہ میں یہ فیصلہ ہوچکا ہے، مگر یہ شخص اُس کو تسلیم نہ کر کے آپ کے پاس آیا ہے، حضرت عمرؓ سنتے ہی جوش میں آگئے، اور میان سے تلوار نکال کر فرمایا کہ جو حضور کا فیصلہ نہیں مانتا، عمر اُس کا فیصلہ اِس سے کرتا ہے، وہ منافق یہ سن کر وہاں سے بھاگا۔

اِس تیسری صورت کے مطابق اِختلاف ختم کرانے میں اولاً تو بندے کا جذبۂ تسلیم ورضا اور عہدِ خود سپردگی مؤثر ہوتا ہے، اور اگر خدانخواستہ کوئی ایک، یا دونوں فریق نفسانیت اور شیطانیت سے مغلوب ہیں؛ اُس صورت میں حکومتِ عادلہ کی قوتِ تنفیذ اثرانداز ہوتی ہے، جو کہ اِسلامی حکومتوں کا اُصل مقصد قیام ہے۔

قرآن کریم میں جس اِعتصام بحبل اللہ کا حکم فرمایا گیا ہے، وہ یہی ہے، کہ سارے مسلمان فکری اور عملی ہر اعتبار سے نفسانیت وشیطانیت، اور یہودیت ونصرانیت وغیرہ کے راستوں کو چھوڑ کر، اللہ ورسول کے اَحکام کو اپنا اُسوہ بنالیں، اور اپنے انفرادی واجتماعی سارے معاملات کو "طاغوت" کی عدالت میں لے جانے کے بجائے، شریعتِ اسلامیہ کی روشنی میں (اگر اہلیت ہو تو از خود، ورنہ اپنے معتبر اور معتمد اہل علم وتفقہ سے) حل کرانے کی کوشش فرمائیں۔

اگر پوری قوم اِس نکتے کو سمجھ لے، اور اِسی نقطے پر مجتمع ومتفق ہوجائے، تو خلافات خود بخود اٹھ جائیں۔

مذہبی (اصولی) ''اِختلاف'' سے متعلق تفصیلات کی مناسبت سے اپنے مسلمان بھائیوں کی خدمت میں ایک اور اہم ترین مسئلے کی وضاحت پیش کردینے کا جی چاہتا ہے، امید کہ قبولِ خاطر ہوگا، وہ ہے ''تقلید کا مسئلہ''، اِس مسئلہ میں بھی ہمارے یہاں بے اعتدالی بہت عام ہے۔

تقلید وعدمِ تقلید:

(۱) کچھ لوگ تو ہر اُس طریقہ اور رسم کو باقی رکھنا چاہتے ہیں جو اُن کے بڑے چل کر اور چھوڑ کر گئے ہیں، خواہ وہ بڑے دین سے کیسے ہی ناواقف اور شرعی مسائل سے کتنے ہی نابلد رہے ہوں، اور خواہ وہ طریقہ اور رسم شریعت کے کتنا ہی خلاف کیوں نہ ہو، ایسے ہی لوگوں کے بارے میں یہ قرآنی آیت نازل ہوئی ہے (البقرة: ۱۷۰):

﴿وإذا قيل لهم: اتبعوا ما أنزل الله، قالوا بل نتبع ما ألفينا عليه آباء نا، أو لو كان آباؤهم لا يعقلون شيئاً ولا يهتدون﴾ (اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ جو اللہ نے نازل کیا ہے اُس کا اِتباع کرو، تو کہتے ہیں کہ نہیں، ہم تو وہی طریقہ اِختیار کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے، کیا ہر حال میں یہ لوگ اُن ہی کو اپنا پیشوا مانیں گے اگرچہ وہ نہ کچھ سمجھ رکھتے ہوں اور نہ سیدھے راستہ پر رہے ہوں؟!)۔

(۲) کچھ لوگ ہر قسم کے جاہل پیروں، اور خود ساختہ عالموں کی تقلید کو باعثِ سعادت اور ذریعۂ نجات سمجھتے ہیں، اور خود اچھی خاصی عقل وسمجھ رکھتے ہوئے بھی اُن کی صحیح غلط اور اچھی بری سب ہی باتوں کو شریعت کا درجہ دیتے ہیں، گویا قرآنی الفاظ میں (التوبة: ۳۱): ﴿اتخذوا أحبارهم ورهبانهم أرباباً من دون الله﴾ (اُنھوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور عابدوں کو ''رب'' کا درجہ دے رکھا ہے)، حالانکہ اُن کے اِن مقتداؤں کے اندر نہ تو مطلوبہ تدیُّن وتقویٰ ہوتا ہے، اور نہ ہی اُن کو دین کی صحیح اور

مستند معلومات ہوتی ہے، انھوں نے دین اور دینداری کو صرف اپنی دنیا کے (مال وجاہ کے) حصول کا ذریعہ بنا رکھا ہوتا ہے، ایسے لوگوں کی سب سے بڑی علامت یہ ہے کہ وہ اپنی خواہشات اور مصالح کو شرعی مسائل پر قربان کرنے کے بجائے، شریعت ہی کو اپنی خواہشات اور جذبات کے سانچے میں ڈھال لیتے ہیں، اور چند جھوٹی کرامات، خوابات اور بشارات کے ذریعہ اپنے معتقدین کو اپنے دامِ فریب میں گرفتار رکھتے ہیں۔

(۳) تیسرا طبقہ وہ ہے جو اِن دونوں طبقوں کے بالمقابل ''تقلید'' کا سرے سے اِنکار ہی کرتا ہے، اُس کے ہاں ''مُنعَم علیهم'' (متبعِ سنت بزرگوں) کا راستہ اِختیار کرنا بھی ویسا ہی جرم ہے، جیسا ''بے عقل اور گمراہ پیشروؤں'' کی پیروی کرنا، اُس کے نزدیک اپنی سمجھ اور عقل سے زیادہ ''اَهل الذکر'' (متقی علماء) کے فہم وتفقُّہ پر اعتماد کرنا بھی ویسا ہی مذموم ہے، جیسا ''احبار ورُهبان'' کو خدا بنانا۔

ظاہر ہے کہ اگر پہلے دو طبقے ''مسئلۂ تقلید'' میں اِفراط (والی بے اعتدالی) کا شکار ہیں، تو یہ تیسرا طبقہ تفریط (والی بے اعتدالی) میں مبتلا ہے۔

ہم اِس مسئلہ میں مزید بصیرت کے لیے ''تقلید'' کی حقیقت اور اُس کی شرعی حیثیت پر مختصر روشنی ڈالتے ہیں، تاکہ مسئلے کے سارے پہلو اچھی طرح روشن ہو جائیں، وما توفیقی إلا باللہ:

تقلید کی حقیقت:

''تقلید'' مشتق ہے اہلِ عرب کے قول: جعل قولَه قلادةً في عنقه سے، جس کے معنی ہیں: دوسرے کی بات اپنے اوپر لازم کر لینا، اور اُس کی اصطلاحی تعریف ہے: اتباع الغیر – علی ظن أنه محقق – بلا نظر في الدلیل (کسی کو محقق سمجھتے ہوئے اُس کی بات بغیر مطالبۂ دلیل کے تسلیم کر لینا)، علماء نے اس کی چار قسمیں لکھی ہیں (کما في ''النظامي حاشیة ''الحُسامي''):

تقلید کی مختلف صورتیں اور اُن کا حکم:

۱-تقليد الأمة صاحب الوحي ،اُمّتی کا اپنے نبی کی تقلید کرنا، جو کہ فرض ہے،اس کے بغیر آدمی صاحبِ ایمان ہو ہی نہیں سکتا،قرآنِ کریم کا ارشاد ہے:﴿يا أيها الذين آمنوا أطيعوا الله وأطيعوا الرسول﴾(ایمان والو!اللہ اور رسول کی اِطاعت کرو)،ایک دوسری جگہ اِرشاد ہے:﴿قل إن كنتم تحبون الله فاتبعوني﴾(آپ فرما دیجیے!اگر تمھیں اللہ سے محبت ہے تو میری پیروی کرو)۔

مسلم شریف(۲۱۸) کی حدیث ہے:''والذي نفس محمد بيده: لا يسمع بي أحد من هذه الأمة يهودي ولا نصراني، ثم يموت ولم يؤمن بالذي أرسلت به إلا كان من أصحاب النار ''(خدائے پاک کی قسم!اِس امتِ دعوت میں میرے بارے میں کسی کو پتہ چلے اور پھر وہ مجھ پر ایمان لائے بغیر مرجائے،تو جہنم میں جائے گا؛ چاہے وہ یہودی ونصرانی ہی کیوں نہ ہو)،یعنی میری بعثت ہوجانے کے بعد مجھے چھوڑ کر کسی اور نبی پر ایمان لانا بھی کافی نہ ہوگا، چہ جائیکہ سرے سے وہ صاحبِ ایمان ہی نہ ہو۔

۲-تقليد العالِم صاحبَ الرأي والنظر في الفقه، لسبقه على أقرانه من الفقهاء ،عام علماء کا کسی ماہرِ فنِ فقیہ کی تقلید کرنا؛ اُس کے اپنے فن میں کمال اور امتیاز کی بناء پر، یہ تقلید عام حالات میں تو جائز ہے،البتہ کبھی ناجائز بھی ہوجاتی ہے،اور کبھی واجب بھی:

الف: تقلید کے جائز بلکہ مستحسن اور مطلوب ہونے کی صورت تو یہ ہے کہ کسی مسئلہ میں شریعت کے نصوص میں بظاہر اِختلاف دکھائی دے رہا ہو،اور کسی ایک پہلو کی ترجیح متعیَّن نہ ہو،اِسی بناء پر ائمہ میں بھی اُس مسئلہ میں اِختلاف ہوجائے تو عام علماء(اور عوام) کے لیے نفسانیت سے بچنے کی آسان شکل یہی ہے کہ وہ سب کے ادب واحترام کا

لحاظ کرتے ہوئے کسی ایک اِمام کو اپنا پیشوا بنالیں، اور پھر ایسے مواقع پر اُسی کی بات پر اِعتماد کر کے اُسی کی تقلید کرلیا کریں، جیسے صحابہ کے زمانہ میں حضراتِ شیخینؓ کی تقلید کی جاتی تھی، بعد میں حضرت ابن مسعودؓ وغیرہ کی تقلید کا سلسلہ رہا، پھر دوسری صدی میں اِمام ابوحنیفہؒ (ت: ۱۵۰ھ) اور اِمام مالکؒ (ت: ۱۷۹) کی تقلید شروع ہوئی، تیسری صدی میں اِمام شافعیؒ (ت: ۲۰۴) اور اِمام احمدؒ (ت: ۲۴۱) کی تقلید کی ابتدا ہوئی، اور اِنہی حضرات کے علوم و معارف کی کتابوں میں تدوین ہوئی، اور انہی کو عالمِ اِسلام میں قبولِ عام حاصل ہوا۔

پھر آخر زمانہ میں "تقلید شخصی" کا رواج بہت عام ہوگیا، جس عالم کی بھی شہرت کچھ زیادہ ہوگئی؛ ایک جماعت نے اُسی کو اپنا پیشوا بنالیا، علامہ ابن حزم ظاہریؒ (ت: ۴۵۶)، علامہ ابن تیمیہؒ (ت: ۷۲۸)، علامہ ابن القیمؒ (ت: ۷۵۱) اور ماضی قریب میں شیخ اَلبانیؒ (ت: ۱۴۲۰) اور شیخ عبدالعزیز بن باز (ت: ۱۴۲۰) رحمہم اللہ کی تقلید بہت کثرت سے کی جاتی ہے۔

ب: یہ تقلید اُس وقت واجب ہوجاتی ہے جب اُس عالمِ محقق کے پاس اپنے قول کی معتبر شرعی دلیل موجود ہو، اور پھر اُس کی مخالفت کرنے سے مسلمانوں میں اختلاف اور تفرقہ کا اندیشہ ہو، چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

(۱) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حادثۂ وفات کے بعد عرب کے اُن حصوں میں جہاں اِسلام کی جڑیں ابھی زیادہ مضبوط نہیں ہوئی تھیں؛ فتنوں کی ایک لہر اُٹھ گئی تھی، اُن میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو دین کے سارے احکام تو تسلیم کرتے تھے، مگر زکوٰۃ دینے کے لیے تیار نہ تھے، سیدنا حضرت ابوبکر الصدیقؓ نے بے مثال غیرتِ ایمانی اور بے نظیر کمالِ توکل کا مظاہرہ فرماتے ہوئے؛ ایک ساتھ ہی سارے محاذوں پر جنگ چھیڑ دینے کا اِرادہ فرمالیا تھا، بعض صحابۂ کرام کو اِس "جذباتی!" اِقدام سے اتفاق نہیں تھا، اُن ہی میں

حضرت عمر فاروقؓ بھی تھے، مگر علمی مباحثہ کے بعد آخر میں حضرت عمرؓ نے یہ کہہ کر حضرت ابوبکر کی رائے کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا تھا: فو اللہ ما ھو إلا أن قد شرح اللہ صدر أبي بکر رضي اللہ عنه، فعرفت أنه الحق (خدا کی قسم! ابوبکر کو اللہ نے اِس رائے پر پورا شرحِ صدر عطا فرمادیا ہے، اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی حق ہے)۔ (بخاری: ۱۳۲، ومسلم: ۲۹)۔

(۲) غسلِ جنابت کے بدل کے طور پر کیے جانے والے تیمم کے سلسلہ میں حضرت عمرؓ کا حضرت عمارؓ سے کچھ اِختلاف ہوگیا، حضرتِ عمار نے اِس بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے براہِ راست حدیث سن رکھی تھی، حضرت عمرؓ کو ابتداءً اُس پر اطمینان نہیں ہورہا تھا، اُنھوں نے حضرت عمار کو ٹوکتے ہوئے فرمایا: اتق اللہ یا عمار (عمار! اللہ سے ڈرو، کیا کہہ رہے ہو؟)، حضرت عمارؓ نے فوراً عرض کیا: إن شئت لم أحدث به (اگر آپ فرمائیں تو میں یہ حدیث کسی اور کو نہ سناؤں؟) مگر حضرت عمرؓ نے یہ کہہ کر بات ختم فرمادی: نولیك ما تولیت (اپنی ذمہ داری پر سناتا)۔ (مسلم: ۵۵۳)۔

اِس واقعہ میں حضرت عمارؓ کا حدیث معلوم ہوتے ہوئے بھی دوسروں کے سامنے بیان کرنے سے رُکنے کے لیے آمادہ ہوجانا، صرف آپسی اِختلاف سے بچنے ہی کے لیے تھا۔

(۳) حضرت عثمانؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں کسی تاویل سے منیٰ میں چار رکعات نماز پڑھانی شروع کردی تھی، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو اس سے اتفاق نہیں تھا، مگر نماز ساتھ ہی پڑھتے تھے، شاگردوں نے عرض کیا: حضرت! آپ اس کو غلط بھی کہتے ہیں، پھر بھی نماز ساتھ ہی پڑھتے ہیں؟ فرمایا: الخلاف شر (ابوداود: ۱۶۷۵) کہ کھلے عام اِختلاف کرنا اِس سے بھی بدتر ہے (یا مطلب ہے کہ شر اور فتنہ پھیلنے کا ذریعہ ہے)۔

مگر تقلید کی یہ صورتیں جب ہی جائز ہیں جب تقلید کیا جانے والا عالم محقق اور

متدین ہو، اور اِس مسئلہ میں بھی اُس کے پاس دلیل ہو؛ خواہ مخالِف کی نظر میں کچھ کمزور ہی کیوں نہ ہو۔

ج: کسی معتبر عالم کی بھی تقلید ناجائز ہونے کی صورت یہ ہے کہ کسی دوسرے محقق عالم کے سامنے یقینی دلیل سے اُس کی کوئی غلطی واضح ہو جائے، اِس کے باوجود وہ صرف جمود کی بنا پر اُس غلطی میں بھی اُس کی تقلید پر مصر ہو، جیسے فِرَقِ باطلہ اپنے پیشواؤں کے ساتھ کرتے ہیں۔

جب کہ اہلِ حق کا طرزِ عمل تو یہ ہے کہ اِمام ابوحنیفہؒ کو "اِمامِ اعظم" ماننے کے باوجود جن مسائل میں دلائل کی بنیاد پر انشراح نہیں ہوا تو اِمام صاحب جیسی شخصیت کی تقلید بھی چھوڑ دی، جس کی سب سے واضح مثال یہ ہے کہ فقہِ حنفی میں اگر مجموعی طور پر اسی ہزار (۸۰،۰۰۰) جزئیات ہیں تو بمشکل ساٹھ فیصد مسائل میں اِمام صاحب کے قول پر فتوی ہے، اور باقی چالیس فی صد میں کہیں امام ابو یوسف، کہیں امام محمد، کہیں امام زُفر، کہیں اِمام مالک، کہیں اِمام شافعی (رحمہم اللہ تعالی)، اور کہیں کسی اور کے قول کو راجح قرار دیتے ہوئے اُسی پر فتوی دیا گیا ہے۔

لیکن یہاں یہ واضح رہنا چاہیے کہ اِس ترجیح اور تخطِئہ کا معیار ہم جیسے (دُنیوی مشاغل میں مصروف، اور تقوی وتدیُّن کے مطلوبہ معیار سے محروم) عامیوں کا علم وفہم اور عقل وسمجھ نہیں ہے، بلکہ اِس کام کے لیے اُن علمائے راسخین کا علم وفہم معتبر ہے جن کے سامنے قرآنی آیات، حدیثی روایات، آثارِ صحابہ اور اَقوالِ ائمہ کا پورا ذخیرہ ہوتا ہے، اور پھر اُنھوں نے اُسی کے سمجھنے سمجھانے اور پڑھنے پڑھانے میں اپنی پوری زندگی بھی کھپائی ہوتی ہے، پھر وہ حضرات جمع وتطبیق اور تفصیل وترجیح کا یہ کام، تقوی وتدین اور خوف وخشیت کے ساتھ ساتھ، نفسانیت وتحزُّب سے اوپر اٹھ کر صرف فہمِ نصوص اور حل مسائل کے طور پر کرتے ہیں، جیسا کہ دیگر تمام علوم وفنون میں بھی یہی اصول اور معمول ہے۔

ایک اور اہم ادب یہاں یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ کسی مسئلہ میں حدود کے اندر رہتے ہوئے کسی بڑے سے اِختلاف تو کیا جاسکتا ہے، مگر اُن سے بدگمانی اور اُن کی شان میں بدزبانی کسی طرح گوارا نہیں کی جاسکتی، بزرگوں کا مقولہ ہے: انتقدوا الکبار ولا تهدموهم (بڑوں سے اِختلاف تو کرو، مگر اُن کو بے وقعت باور کرانے کی کوشش مت کرو)۔

۳- تقليد العوام علماءَ عصرهم، عوام کا تقلید کرنا اپنے زمانہ کے علماء کی، یہ تقلید ہمیشہ واجب اور ضروری ہے، حدیث شریف میں ہے (ابوداود: ۴۹): ''إنما شفاء العِيِّ السؤال'' (علم سے درماندہ لوگوں کا علاج: سوال کرنا ہے)، دنیا کا کوئی بھی فن یا میدان ہو، سب کا یہی اصول اور طریقہ ہے کہ نہ جاننے والے، جاننے والوں سے پوچھتے اور استفادہ کرتے ہیں، اِس ''تقلید'' کا اِنکار کرنا حماقت اور مکابرہ ہے۔

۴- تقليد الأبناءِ آباءَهم، والأصاغرِ أكابرَهم، اولاد کا تقلید کرنا اپنے باپ دادا کی، چھوٹوں کا تقلید کرنا اپنے بڑوں کی، پس اگر بڑے متدیّن، اہلِ علم ہوں، تو غیر عالم کے لیے ان کی تقلید میں کوئی حرج نہیں، اور اگر غیر متدین اور غیر اہل علم ہوں، تو ایسی تقلید ناپسندیدہ اور مذموم ہے:

قرآنِ کریم میں ہے (البقرة: ۱۷۰): ﴿وإذا قيل لهم: اتبعوا ما أنزل الله، قالوا بل نتبع ما ألفينا عليه آباء نا، أو لو كان آباؤهم لا يعقلون شيئاً ولا يهتدون﴾ (اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ جو اللہ نے نازل کیا ہے اُس کا اِتباع کرو، تو کہتے ہیں کہ نہیں، ہم تو وہی طریقہ اِختیار کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے، کیا ہر حال میں یہ لوگ اُن ہی کو اپنا پیشوا مانیں گے اگر چہ وہ نہ کچھ سمجھ رکھتے ہوں اور نہ سیدھے راستہ پر رہے ہوں؟!)۔

جس طرح اِس آیت کے الفاظ کی صراحت سے ''احمقوں اور گمراہوں'' کی

پیروی کی ممانعت ثابت ہو رہی ہے، اِسی طرح اِس کے بین السطور میں مستور اِشارہ سے ائمہ محققین کی تقلید کی اِجازت بھی ثابت ہو رہی ہے، اِس لیے کہ اِس میں اُن آباء کے اِتباع کو منع کیا گیا ہے جو ''عقل اور ہدایت'' سے محروم ہوں، اور اُن کی باتیں ﴿ما أنزل الله﴾ کے معارض بھی ہوں۔

لہٰذا جن بڑوں کے ہاں یہ دونوں چیزیں نہ پائی جاتی ہوں اُن کا اِتباع کرنا چاہیے، کیوں کہ سورۂ فاتحہ میں تو صلحاء اور صدیقین کے راستے پر چلنے کی دعا سکھائی گئی ہے: ﴿اهدنا الصراط المستقيم صراط الذين أنعمت عليهم﴾ (ہم کو سیدھا راستہ چلایئے، اُن لوگوں کا راستہ جن پر آپ نے اِنعام فرمایا ہے)، اِس سے ''منعم عليهم'' (انبیاء کے نقشِ قدم پر چلنے والے علماء وصلحاء) کی تقلید کا مطلوب ہونا ثابت ہو رہا ہے۔

امید کہ اِن معروضات سے ''وحدتِ امت'' کے لیے دردمند اہلِ قلوب، اور فکرمند حضرات کو شریعت کی کچھ نہ کچھ روشنی حاصل ہوئی ہوگی، اور آگے کا راستہ طے کرنے اور منزل کا تعین کرنے میں کسی قدر تعاون حاصل ہوا ہوگا۔

وما توفيقي إلا بالله، عليه توكلت، وإليه أنيب، سبحانك لا علم لنا إلا ما علمتنا، إنك أنت العليم الحكيم.

آخر میں اہلِ زیغ وضلال کی طرف سے اِس مسئلے میں پیدا کیے جانے والے بعض مغالطات کی نشاندہی بھی کردی جاتی ہے، تاکہ اہلِ حق کو کسی قسم کا اشتباہ والتباس پیش نہ آئے۔

مسئلۂ اِتحاد بین المسلمین کے سلسلے میں

شاؔز کی تلبیسات

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جو خود ایک ''فرقۂ نیچریت'' کی بانی ہے، اور ماضی قریب کے بہت سارے بددین فرقوں، لامذہب اُفراد اور باطل اُفکار ونظریات کا سرچشمہ ہے، اُس کے ایک خود ساختہ ''مفکر صاحب'' کو بھی مسلمانوں کے (اِتحاد واِتفاق کے) اِس مسئلے کی بڑی فکر ہے، ''متحدہ اِسلام کا منشور'' نامی کتاب میں فرماتے ہیں:

''اِس کتاب کی اِشاعت ہماری ہزار سالہ فکری تاریخ کا اہم سنگ میل ہے، اگر اسے کھلے دل ودماغ سے پڑھا جائے، تو عجب نہیں کہ یہ مختصر سا کتابچہ ایک نئی تبدیلی کا نقطۂ آغاز بن جائے۔

ہمارا شیعہ یا سنی ہوجانا، یا اِسماعیلی اور اباضی کہلانا، یا حنفی، شافعی، زیدی، جعفری کے خیموں میں بٹ جانا، یا بریلوی، دیوبندی، جماعتی، اور سلفی شناختوں کا اِختیار کرلینا، ہماری تاریخ کا پیدا کردہ اِنحراف ہے، جس نے گذرتے وقتوں کے ساتھ اتنے مختلف اور متحارب فرقوں کو جنم دیا کہ امت کی قوت پارہ پارہ ہوکر رہ گئی۔

آج دنیا کے دگرگوں حالات ہم سے اِس بات کے طالب ہیں کہ اقوامِ عالم کی رہنمائی کے لیے آخری نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی امت فی الفور سامنے آئے، اور یہ کام اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک کہ خود ہمارا گھر درست نہ ہو۔

وحی کی روشنی اور تاریخ کا مطالعہ ہمیں اِس بات پر مطلع کرتا ہے کہ ہمارے سامنے دو ہی متبادل ہیں: یا تو ہم آخری وحی کے حاملین کی حیثیت سے سیادت عالم کی

کمان سنبھالنے کے لیے خود کو تیار کریں، یا بصورتِ دیگر، معزول امتوں کی طرح خدا کے غضب اور تاریخ کے کباڑ خانے کو اپنے مقدر کے طور پر قبول کرلیں''۔

''ہمارے عہد کے شیعہ سنی، اِسلام سے اپنی وابستگی کے باوجود الگ الگ خانوں میں جیتے ہیں، ان کا ملی مفاد الگ، ان کی کتابیں الگ، ان کے علماء الگ، حتی کہ ان کی مساجد بھی الگ الگ ہوگئی ہیں، صرف شیعہ سنی ہی پر موقوف نہیں، بلکہ مسلمانوں کے مختلف گروہ؛ خواہ وہ اسماعیلی اور اباضی ہوں، یا بعد کے عہد میں بننے والے سلفی، جماعتی، دیوبندی اور بریلوی مسالک کے حاملین، ان سبھوں نے اپنی اپنی مسجدیں الگ کرلی ہیں، ذرا غور سے دیکھیے تو یہ حقیقت چھپائے نہیں چھپتی، کہ مسجدیں ہوں، یا مدرسے، بظاہر ان پر دینداری کا کتنا ہی خوش نما ملمع کیوں نہ چڑھا ہو، اور ان کے مناروں سے اللہ اکبر کی صدا کیوں نہ سنائی دیتی ہو، دراصل یہ تنگ نظری، تعصب اور فرقہ بندی کے قلعے بن کررہ گئے ہیں؛ جہاں خدائے واحد کی عبادت کے بجائے، اپنے اپنے فرقوں اور مسلکوں کا علم بلند کیا جارہا ہے، بڑے قلق کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ دراصل توحید کے مراکز نہیں، بلکہ شرک اور فرقہ پرستی کے اڈے ہیں، جو عین مسلم معاشرے کے اندر اِسلام اور مسلمانوں کے خلاف برسرِ پیکار ہیں'' (ص ۱۵)۔

جس امت کو پہلے سے ہی شیعہ - سنی فرقہ بندی کا سامنا تھا، جس کا وجود صدیوں سے حنفی شافعی کی باہمی خوں ریزیوں سے لہولہان تھا، اَب اسے ہمارے عہد میں تبلیغی، جماعتی، سلفی، جمعیۃ العلمائی، دیوبندی، بریلوی اور ان جیسے بے شمار داخلی خلفشار کا سامنا ہے، مصیبت یہ ہے کہ ان شناختوں کے بطن سے مسلسل نئی نئی شناختیں رونما ہورہی ہیں، ایک جماعت جب دو حصوں میں بٹتی ہے، یا ایک مدرسہ جب اندرونی خلفشار کے نتیجے میں دارالعلوم اور دارالعلوم وقف کے ناموں سے بٹ جاتا ہے، تو عام مسلمانوں کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ حق کس کے ساتھ ہے؟

دارالعلوم دیوبند ہو، یا مظاہر العلوم، جمعیۃ العلماء ہو، یا سلفی تحریک، اس کی تقسیم در تقسیم کے عمل سے عام مسلمانوں کے ذہن میں اس سوال کی دھار تیز ہوتی جاتی ہے؛ آیا انتشار اور افتراق اِسلام اور اِسلامیان کی بنا کا جزو لاینفک ہے؟ آخر کیا وجہ ہے

کہ جو علمائے ربانیین امت کو شب وروز اتحاد کی تلقین کرتے ہیں، خود ان کی جماعتیں اور مدارس منقسم، اور ان کے جھگڑے سرکاری عدالتوں میں زیر سماعت ہیں......؟! (ص ٦٧)۔

(حیرت ہے کہ محکوم ہندوستان میں مسلم اِداروں اور جماعتوں کے آپسی اِختلاف و تقسیم کے اِس سلسلے کی ابتدا جس کڑی (مسلم یونیورسٹی) سے ہوئی ہے، اُسی سرے کو نظر انداز کردیا گیا!)۔

آگے اِرشاد ہے:

''اے کاش کہ ہمیں اِس بات کا اِحساس ہوتا کہ ہمارے ملّی گراف کا مسلسل نیچے گرتے جانا دراصل ہماری باہمی نظری خانہ جنگی کے سبب ہے، جس نے شیعہ، سنی، حنفی، شافعی، بریلوی، دیوبندی اور بھانت بھانت کے مختلف گروہوں کو باہم ایک دوسرے سے برسرِ پیکار کر رکھا ہے، کوئی ہزار سالوں پر محیط باہمی منافرت کا یہ سلسلہ تھامے نہیں تھمتا، بلکہ گذرے وقتوں کے ساتھ، اس کی لَو مسلسل تیز ہوتی جاتی ہے، بھلا ایسی صورت میں یہ امت اقوامِ عالم کی رہنمائی تو کجا؛ خود اپنے لیے ایک پرسکون اور روشن مستقبل کا تصور بھی کیسے کرسکتی ہے۔

شتر مرغی مسائل کو مؤخر ضرور کرتی ہے، لیکن اس سے مسائل حل نہیں ہوتے، بلکہ ان کی سنگینی میں مسلسل اضافہ ہوتا رہتا ہے، صدیوں سے ہمارے صلح جو مصلحین اِس خیال کا اِعادہ کرتے رہے ہیں کہ شیعہ، سنی سب ہی اپنی اپنی جگہ برحق ہیں، اور اسی طرح چار سنی مسالک اپنے باہمی افتراق وانتشار کے باوجود دِین کی مستند تصویر پیش کرتے ہیں، دراصل اِس قسم کے مغالطوں نے ہمیں اصل مسائل کے اِدراک سے رد کے رکھا ہے۔

اَب محض یہ کہنے سے کام نہیں چلے گا کہ خدائے واحد کی عطا کردہ حنیفاً مسلماً کی شناخت کو ترک کرنے والے لوگ، جو فرقہ پرستی، ائمہ پرستی، شیوخ پرستی اور اِن جیسی دیگر پرستشوں میں مبتلا ہیں، اور جنھوں نے علی الاعلان خدائے واحد کے بجائے، اپنے اپنے فرقے اور گروہ کا علم بلند کر رکھا ہے، یہ سب کے سب بیک وقت حق

پر ہیں؛ کہ ایسا کہنا وحی اور عقل دونوں کا اِنکار ہے۔

جیسا کہ ہم نے عرض کیا، قرآن کا فرمان ہے کہ ''اے محمد! جن لوگوں نے دین میں فرقہ بندی کو ہوا دی اور گروہوں میں بٹ گیے؛ ان کا تم سے کوئی تعلق باقی نہیں رہ گیا''، موٹی سی موٹی عقل والا آدمی بھی اِس نکتے سے ناواقف نہیں کہ جن لوگوں نے امتِ مسلمہ میں اپنی الگ گروہی شناخت بنائی، اُنھوں نے دراصل سبیل المؤمنین سے بغاوت کا علم بلند کیا'' (ص۲۲-۲۳)۔

''...... ہمارا باہم منقسم اور متحارب ہونا نہ تو خدا کو مطلوب ہے، اور نہ ہی ایسا تعلیماتِ پیغمبر کے حوالے سے ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی - جو ہم مسلمانوں کے لیے اُسوۂ حسنہ کی حیثیت رکھتی ہے - شیعہ، سنی، حنفی، مالکی، سلفی، ظاہری جیسے تراشیدہ حوالوں کے لیے متہم نہیں کی جاسکتی، اگر ہم اِس تاریخی حقیقت سے واقف ہوں کہ شیعہ، سنی، اسماعیلی خیمے باقاعدہ طور پر چوتھی صدی میں جاکر متشخص ہو پائے......'' (ص۷۰)۔

''...... ہماری کوشش ہوگی کہ امت کے مختلف فرقے اپنے اصل نظری سرمائے کی بازیافت اور اپنی مشترکہ شناخت کی تعمیرِ نو کے لیے سر جوڑ کر بیٹھیں، حتی کہ وہ لوگ بھی جو آج خود کو مسلمانوں سے الگ سمجھتے ہیں، یا جو تاریخ کے کسی مرحلے میں ہم سے جدا ہوگئے، لیکن ماضی میں وہ ہمارے قافلے کا حصہ رہے ہیں، انھیں بھی دوبارہ اس نبوی دائرے میں لانے کی کوشش کی جانی چاہیے۔ بین المذاہب، بین الفرق، بلکہ بین الجماعت اور بین المسالک مکالموں کی ابتدا بھی اس مقصد کی راہ میں حائل برف کو پگھلا سکتی ہے''۔ (ص۱۰)۔

اِظہارِ عجز و قصور

شاؔز کے اِن اقتباسات کو پڑھ کر راقم کچھ عجیب متضاد کیفیت سے دوچار ہوگیا، ایک طرف تو خلط والتباس سے بھرپور اِس تحریر کے اصل منشا اور پس منظر کا تقاضا تھا کہ اس کو ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا جائے، بالکل بھی درخورِ اعتنا نہ گردانا جائے، اور دوسری

طرف قرآن کریم میں واردیہ اِرشادِ ربانی بھی پیشِ نظر تھا:

(المائدۃ:۸)﴿یا أیها الذین آمنوا کونوا قوامین لله، شهداء بالقسط، ولا یجرمنکم شنآن قوم علیٰ أن لا تعدلوا، اعدلوا هو أقرب للتقویٰ﴾ (اِیمان والو! تم ایسے ہوجاؤ کہ اللہ کے لیے حقوق کو پوری طرح سے ادا کرو، اور اِنصاف پسند گواہ بنو، اور کسی قوم سے دشمنی تمھیں اِس پر نہ آمادہ کردے کہ تم اُس کے ساتھ نا انصافی کرنے لگو، تم تو عدل وانصاف ہی کرو، یہی تقوی کے زیادہ مناسب ہے)۔

اِس اِرشاد کا تقاضا ہے کہ مذکورہ اقتباسات میں اگر کوئی کام کی چیز ہو تو اُس کو نظر انداز بھی نہ کردیا جائے، اِس لیے آئندہ سطور میں بعونہ تعالی کوشش ہوگی کہ ان میں موجود تلبیسات کو آشکارا کردیا جائے، اُس کے بعد بچے ہوئے حصے سے جو صاحب اِستفادہ کرنا چاہیں؛ کرلیں، وباللہ التوفیق۔

تلبیسات کی وضاحت:

(۱) مذکورہ کتابچے میں مسلمانوں کے باہمی "اختلافات" کے سلسلے میں پہلا خلط تو یہ کیا گیا ہے کہ "اِختلاف" کی حقیقت اور اُس کا معیار نہیں واضح کیا گیا، کیا کسی بھی مسئلے میں سامنے آنے والی ایک سے زائد آراء کو "اِختلاف" کہہ کر، قابلِ مذمت ٹھہرایا جاسکتا ہے؟

(۲) اِس سوال کے جواب میں اِبہام رکھا گیا ہے کہ اگر دو شخصوں نے ایک ہی منزل کے لیے، ایک ہی راستے پر سفر شروع کیا، پھر دونوں میں سے ایک شخص راستہ چھوڑ کر از خود الگ ہوگیا، جس کی بنا پر دونوں کے درمیان قدرتی طور پر دوری پیدا ہوگئی، تو دونوں میں قربت پیدا کرنے کا کیا طریقہ ہے؟ بھٹکے ہوئے کو واپس راستے پر لاکر ملادیا جائے، یا سیدھے راستہ پر موجود شخص کو راستے سے اتار دیا جائے؟

(۳) اگر شاز کا یہ کہنا ہے کہ ہم نے سارے راستوں کو چھوڑ کر "قرآن" کی طرف آنے کی دعوت دی ہے، جس کا سیدھا مطلب یہی ہے کہ بھٹکے ہوؤں کو اصل راستے پر پہنچانے کی کوشش کی ہے۔

تو شاز سے پوچھا جا سکتا ہے کہ:

"قرآن" کا کون سا ایڈیشن مراد ہے؛ اہلِ تشیع کا جو کہ فی الحال عام پبلک کی دسترس سے باہر ہے؟ یا وہ مغربی ایڈیشن جس میں سے وہ آیات حذف کردی گئی ہیں جو قتال وجہاد کے احکام یا یہود ونصاریٰ کی مذمتوں پر مشتمل تھیں؟ یا مسلمانوں کے ہاتھوں میں موجود وہ آسمانی "کتابِ ہدایت" جو اپنے الفاظ ومعانی کے ساتھ ہر قسم کی تبدیل وتحریف سے تا قیامِ قیامت مصون ومحفوظ ہے؟

اگر یہی آخری نسخہ مراد ہے تو جو لوگ اِس نسخے کو مستند تسلیم نہیں کرتے، وہ مسلمان ہیں یا غیر مسلم؟ بہر صورت اُن سے اِس مسئلے میں اِختلاف رکھنا چاہیے یا اِتفاق؟

اِسی طرح موجودہ قرآن کریم کو آخری فیصل تسلیم کرلینے کے بعد بھی (جیسا کہ الحمدللہ یہی ہر مسلمان کا عقیدہ ہے بھی) یہ اہم سوال باقی رہ جاتا ہے کہ فہمِ قرآن کا معیار کیا ہوگا؟ نقل یا عقل؟ اگر نقل ہے؛ تو شیعہ اماموں کی (اگر اُن کو اِسلامی دائرے میں شامل رکھا جائے)؟ یا سنیوں کے مجموعۂ احادیث اور اقوالِ سلف کی؟......؟ اور اگر معیار عقل ہے؛ تو مسلمانوں کی یا غیر مسلمین کی؟ مذہب پسندوں کی یا لامذہبوں کی؟ علماء کی یا نیچریوں کی؟......؟ جواب جو بھی ہو؛ اُس کی وجہِ ترجیح کیا ہوگی؟

اور اگر ساری تقلید اور اتباع چھوڑ کر ہر شخص کی اپنی اپنی عقل معیار مان لی جائے، تو اِس سے "اِختلاف" میں مزید اضافہ ہوگا، یا کمی؟!

(۴) شاز کے مذکورہ اقتباسات میں، عملی اور نفسانی کمزوریوں کی بنیادوں پر ہونے والے اختلافات، علمی اور فکری انحرافات کے نتیجے میں پیدا ہونے والے

اِختلافات، اور تفکر وتدبر کے سلسلے میں زاویۂ نگاہ کی تبدیلی پر متفرع ہونے والے اِختلافات؛ اِن تینوں طرح کے اِختلافات میں خلط سے کام لیا گیا ہے، کیا کوئی ذی شعور تینوں کو ایک ہی خانے میں رکھے جانے کا قائل ہوسکتا ہے؟

کبھی تو سارے نقطہائے اِتحاد کے مجتمع ہوتے ہوئے بھی، نفس وشیطان سے مغلوب ہوکر، کتنے بڑے بڑے اختلافات رونما ہوجاتے ہیں، اور بعض وقت سارے عواملِ اختلاف کے ہوتے ہوئے بھی، اتحاد واتفاق کی صورت پیدا ہوجاتی ہے؛ تو کیا ایک ''مفکر'' کے لیے دونوں کے ما بہ الفرق پر غور کرنا اور اُس کو واضح کرنا ضروری نہیں ہے؟

(۵) مذہبی بنیادوں پر ہونے والے اِختلافات میں؛ اصولی اور فروعی اِختلافات کے اہم ترین فرق کو نظر انداز کرتے ہوئے؛ بدترین تلبیس کی کوشش کی گئی ہے۔

کیا وہ لوگ جو شآز کے بقول:

''آج خود کو مسلمانوں سے الگ سمجھتے ہیں، یا جو تاریخ کے کسی مرحلے میں ہم سے جدا ہوگئے، لیکن ماضی میں وہ ہمارے قافلے کا حصہ رہے ہیں''

اپنے فکر وعقیدے کی اِصلاح اور اپنا ''قبلہ'' درست کیے بغیر، اُس نبوی قافلے میں شریک ہوسکتے ہیں، جس کا فکر وعقیدہ کتاب اللہ الکریم سے تشکیل پاتا ہے؛ اور جس کا قبلہ بیت اللہ الحرام کو قرار دیا گیا ہے؟

(٦) اصولی اور فروعی اختلاف کی نوعیت کو پس انداز کرنے ہی کے نتیجے میں حنفی، شافعی، مالکی اختلاف کو، سنی اور شیعہ اختلاف کے زمرے میں رکھنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔

کیا جن کا قرآن موجود ہو، جن کے ائمہ موجود ہوں، جو سیدنا حضرتِ عمرؓ کو شہید اِسلام اور فخر اہلِ اِسلام قرار دیتے ہوں، حبِ صحابہؓ جن کے اِیمان کا حصہ ہو، جن کا مذہب

''اِظہار'' اور ''اِعلان'' ہو، اُن کو اُس گروہ سے خلط کیا جا سکتا ہے؛ کہ جن کا قرآن بھی غائب ہے، اِمام بھی غائب ہے، قاتلِ سیدنا حضرت عمرؓ ابولؤلؤہ فیروز اِیرانی (بابا شجاع الدین؟) جن کا ہیرو ہے، حبِّ صحابہؓ کے بجائے بغضِ صحابہؓ جن کے مذہب کا اساسی رکن ہے، اور جن کے مذہب کی بنیاد ''تقیہ'' و ''نفاق'' اور ''کتمان'' پر ہے......؟ خمینی ایرانی کی ''الحکومة الاسلامیة'' اس کو بہر حال تسلیم نہیں کرتی۔

(۷) اِختلاف، تنوع، تعدد، تحزیب اور تخریب کے الگ الگ مفاہیم میں خلط و تلبیس سے کام لیا گیا ہے۔

کیا مذہب اور مذہبی خدمات کی آڑ میں: مسلمانوں کو ضرر پہنچانے، کفریہ باتیں کرنے اور پھیلانے، تفریق بین المسلمین کرنے اور اللہ و رسول کے دشمنوں کو اپنے ہاں ٹھکانہ دینے کے لیے جو لوگ ''مسجدیں'' بناتے ہوں، اُن کی تحزیب اور تخریب کو، بدر کے قیدیوں کے سلسلے میں ہونے والے اختلافِ رائے جیسے اِختلافات سے خلط کیا جا سکتا ہے؟

(التوبۃ:۱۰۷) ﴿والذین اتخذوا مسجداً ضراراً و کفراً وتفریقاً بین المؤمنین وإرصاداً لمن حارب اللہ ورسولہ﴾ (اور ان میں ایسے بھی ہیں جنھوں نے ایک مسجد بنائی ہے؛ ضرر پہنچانے کو، کفر پھیلانے کو، اور مسلمانوں کے مابین پھوٹ ڈالنے کو، اور اللہ ورسول سے لڑنے والوں کو کمین گاہ فراہم کرنے کو)۔

ایک ہی کنبے کے افرادِ خانہ کا کسی غلط فہمی کی بنا پر آپس میں الجھ پڑنا، اور کسی بیرونی مشترکہ دشمن سے برسرِ پیکار ہونا؛ کیا ایک ہی درجہ رکھتا ہے؟

کعبہ کے پاسبانوں کو، حجرِ اسود تک اٹھا لے جانے والوں کے ساتھ خلط کرنا، تعمیر حرم کرنے والوں کو تخریب کی ناکام کوششیں کرنے والوں کے ساتھ ذکر کرنا بد دیانتی اور ناانصافی نہیں ہے؟ فإلی اللہ المشتکی۔

(۸) سنی اور شیعہ اِختلاف کو چوتھی صدی کا اِختلاف دکھانے کی کوشش کی گئی ہے، اِس کو یا تو شاذ کی پرلے درجے کی جہالت سمجھا جائے، یا انتہائی درجے کا تقیہ، یا پھر تلبیس ......

جاننے والے جانتے ہیں کہ اِسلام میں فرقوں کی سب سے پہلی طرح شیعہ فرقے ہی کے ذریعے پڑی ہے، جس کی انفرادی ابتداء تو سیدنا حضرت عمر فاروقؓ کے اواخر دورِ خلافت میں ہوگئی تھی، مگر باقاعدہ منظم صورت سیدنا حضرت عثمان غنیؓ کے آخری ایام خلافت میں (سنہ ۳۰ھ کے قریب) ظاہر ہوئی، اور اُس کے بعد خوارج، معتزلہ، قدریہ، جبریہ، جہمیہ، کرامیہ اور مرجئہ وغیرہ نامعلوم کتنے فرقے پہلی صدی کے اواخر، اور دوسری صدی کے اوائل تک ہی میں وجود پذیر ہو کر منظم ہو چکے تھے۔

کیا اِس کو بس اتفاق کا نام دیا جائے گا کہ ایک قوم میں تو تسلسل کے ساتھ خالد وبوعبیدہ، سعد ویزید (بن ابی سفیانؓ، یکے از فاتحین شام)، عمرو وشرحبیل، عقبہ بن نافع (رضی اللہ عنہم)، اور موسیٰ بن نُصیر، قُتیبہ بن مسلم، محمد بن قاسم، طارق بن زیاد، محمود غزنوی، صلاح الدین ایوبی، محمد فاتح (رحمہم اللہ تعالیٰ) جیسے نامعلوم کتنے غزاۃ ومجاہدین اور اِسلامی سرحدوں کے پاسبان پیدا ہوتے رہے، اور دوسری طرف فیروز ایرانی، عبداللہ بن سبا فارسی، ابن العلقمی بغدادی، میر جعفر اور میر صادق جیسوں کے سازشی اور غدارانہ کارناموں کے علاوہ اِسلامی تاریخ میں کوئی کارنامہ ہی نہیں ملتا؟!

دیکھنا چاہیے کہ سیدنا حضرتِ ابوبکر صدیقؓ (سنہ ۱۱ھ) سے لے کر، آخری ترکی خلیفۃ المسلمین (سنہ ۱۳۴۲ھ) تک، (معمولی سی فترت کو چھوڑ کر) پیہم تیرہ سو برسوں تک اللہ کا کلمہ سربلند کرنے، اور شرعی قوانین کا نفاذ کرنے کے لیے، امت کا کون سا طبقہ یہود ونصاریٰ، کفار ومشرکین اور ملحدین ومنافقین سے برسرِ پیکار رہا، اور کون سے طبقات عین اِسلامی معاشرے کے اندر رہتے ہوئے، اِسلام اور مسلمانوں کے خلاف مسلسل سازشوں

میں مصروف و مشغول رہے؟

امت کا کون سا سوادِ اعظم افریقہ و یورپ سے لے کر، چین و جاپان کی سرحدوں تک اِسلام کی دعوت کا پیغام بلند کرتے ہوئے پہنچا، اور کون سے طبقات (فاطمیین، قرامطہ، اسماعیلیہ اور صفوی سلسلوں کے نام سے) خود مسلمانوں کے اندرونی مفتوحہ علاقوں پر یلغار کر کر کے، یہود و نصاریٰ سے داد و تحسین کے مستحق ٹھہرتے رہے؟

کم از کم میری معلومات میں کوئی ایک ایسا واقعہ نہیں ہے کہ یہود و نصاریٰ (خصوصاً یہود) نے آخر الذکر طبقے کو بحیثیتِ مجموعی محبت و مسرت کے علاوہ کبھی کسی اور نگاہ سے بھی دیکھا ہو۔

مشرقِ وسطیٰ میں اِس وقت جو کچھ ہو رہا ہے، وہ کوئی اچانک پیش آ جانے والا واقعہ، اور کسی خارجی سازش کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ سنہ ۳۰ھ میں (اِیرانی سازشیوں کی طرف سے) ''اِسلام'' کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کی جس منصوبے کی ابتدا ہوئی تھی، اور درمیان درمیان میں فاطمی، اسماعیلی، قرامطی اور صفوی حکومتوں کے ذریعے اس پر عمل درآمد کیے جانے کی جو ناکام کوششیں ہوتی رہی تھیں، موجودہ حالات بھی اُسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں، اِس لیے اِس گروہ کو مسلمانوں سے خلط کرنا، اور دونوں کے درمیان مذہبی بنیادوں پر اتفاق و اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کرنا، سوائے دجل و تلبیس کے اور کچھ نہیں ہے۔

چند ضروری وضاحتیں

الف: یہ معلوم ہے کہ ''اہلِ حق'' کے کسی سے بھی اِختلاف کی بنیاد: علاقہ و وطن اور نسل و قوم کا فرق نہیں ہوا کرتا، بلکہ ہمارے اِختلاف کی اَصل بنیاد: اَفکار و عقائد ہوتے ہیں، یہود و نصاریٰ اور ہنود و مشرکین سے بھی ہمارے اِختلاف کی واحد بنیاد یہی ہے: ﴿فمنکم کافر ومنکم مؤمن﴾۔

لہٰذا جو اَفراد اور جماعتیں خود کو اِسلام کی طرف منسوب کرتی ہیں، مگر توحید

ورسالت، اور قرآن وآخرت سے متعلق اُن کے بنیادی عقائد درست نہیں ہیں، تو ظاہر ہے کہ مذہبی اُمور میں ہمارا اُن سے اِختلاف باقی رہے گا، اور اِس "اِختلاف" کی شرعی واَخلاقی ذمہ داری: "صراط مستقیم" سے اِنحراف کرنے والوں، اور "حبل اللہ" کا سِرا چھوڑنے والوں پر ہے، نہ کہ راہِ راست پر ثابت قدم رہنے والوں پر۔

ب: شیعہ فرقے کی طرف منسوب جماعتوں میں انفرادی طور پر بعض ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جو شیعہ مذہب کی اصل حقیقتوں سے لاعلمی کی بنا پر، صرف "حبّ اہل بیت" کے ظاہری عنوان سے متاثر ہوکر، اپنا انتساب "تشیع" کی طرف کرتے ہیں، اِس لیے اہل حق کی طرف سے (اثنا عشریہ، نُصیریہ جیسے کھلے ہوئے باطل اہل عقیدہ کے علاوہ) علی الاطلاق شیعوں کی تکفیر نہیں کی جاتی، بلکہ یہ کہا جاتا ہے کہ جو فرد (یا جماعت) قرآن کی تحریف یا نقص دین کا عقیدہ رکھتا ہو، حضراتِ شیخینؓ پر تبرا بکتا ہو، اور سیدہ عائشہ صدیقہؓ پر تہمت لگاتا ہو، اور صحابۂ کرامؓ کی تکفیر کرتا ہو، تو ایسا شخص کافر ہے، ہم اُس سے "تبرّی" کرتے ہیں۔

ج: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات سے ادنیٰ تعلق رکھنے والی چیز سے بھی محبت وشیفتگی ہمارے اِیمان کا حصہ ہے، عام مسلمانوں سے محبت بھی ہم اِسی لیے رکھتے ہیں کہ وہ ہمارے حبیبِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اُمتی ہیں، اِس لیے خانوادۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے خصوصی محبت وتعلق اور حضراتِ اہلِ بیت (ازواجِ مطہرات اور بناتِ طیبات) کا اِمتیازی ادب واحترام بھی ﴿إلا المودة في القربى﴾ (الشوریٰ: ۲۳) کے قرآنی حکم کے بموجب ہمارے عقیدہ کا جزء اور ہمارے اِیمان کا حصہ ہے۔

مگر یہ بات اپنی جگہ بالکل درست ہے کہ اہلِ تشیع نے مسلمانوں کے "حبِّ اہل بیت" کے جذبے کا انتہائی غلط طور پر ناجائز اور خطرناک فائدہ اُٹھایا ہے، اور اِسی جذباتی عنوان کے پس پردہ نامعلوم کیسے کیسے غیر اِسلامی عقائد، اَفکار، اَعمال اور جاہلانہ رسوم

وبدعات ''اِسلام'' کی طرف منسوب کر کے، مسلمانوں کی زندگیوں میں اُن کو بآسانی داخل کر دیا، کہ آج امت کا ایک بڑا طبقہ مثبت کاموں کو چھوڑ کر، بہت سے لاحاصل مسائل وموضوعات کو حق وباطل کا معیار بنائے بیٹھا ہے۔

حیرت ہوتی ہے کہ جس قوم کے بہت سے بزرگوں کو بھی سیدنا حضرت عمرؓ، سیدنا حضرت عثمانؓ، سیدنا حضرت علیؓ جیسے کبارِ صحابہ کے ایامِ شہادت کا علم نہیں ہے، قاتلوں کے نام بھی معلوم نہیں ہیں، شہادت اور مظلومیت کی تاریخ بھی پتہ نہیں ہے، اُسی قوم کے بچے بچے کو بھی، سیدنا حضرت حسینؓ کی شہادت سے متعلق یہ سب معلومات بہت تفصیل کے ساتھ مستحضر رہتی ہیں!

جس قوم کے اہل علم، عام حالات میں سال گرہ، برسی اور ماتم وغیرہ اعمال کو بدعت وخرافات کا حصہ قرار دیتے ہیں، وہی حضرات ماہِ محرم آتے ہی ''حسین ویزید'' اور ''کوفہ وکربلا'' کو منبر ومحراب کا موضوع بنا دیتے ہیں!

کیا یہ مقام تعجب نہیں ہے کہ جس جماعت کے لوگ صرف اِس وجہ سے: ابوسفیان، مغیرہ، شعبہ، عمرو، معاویہ اور یزید جیسے نام نہیں رکھتے، کہ اِس نام کے لوگوں کا حضراتِ اہل بیت سے بعض انتظامی مسئلے میں مشاجرہ ہوا تھا، اُسی طبقے کے لوگ انتہائی سادگی کے ساتھ، پرویز، اور فیروز جیسے نام رکھ لیتے ہیں، حالاں کہ پرویز: اُس ملعون اِیرانی کا نام ہے جس نے آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نامۂ مبارک کے ساتھ گستاخی کی تھی، اور فیروز: سیدنا حضرت عمرؓ کے قاتل کا نام ہے۔

اور اس کے برخلاف ابوسفیان: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سمدھی اور شام کی فتوحات کے ایک زندہ کردار کا نام ہے، اِسی طرح شعبہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم اور حضرت عمرؓ کی طرف سے ایران کے لیے منتخب ہونیوالے سفیر اور کوفہ کے گورنر کا نام ہے، عَمرو: فاتح مصر وشام کا نام ہے، معاویہ: بہت سارے صحابۂ کرامؓ کا نام ہے، جن میں سب

سے زیادہ مشہور وہ ہیں جن کو صحبتِ رسول کے ساتھ ساتھ، کتابتِ وحی، ولایتِ شام اور خلافتِ مسلمین کی سعادت بھی حاصل ہوئی، جب کہ یزید: کثیر تعداد میں صحابہؓ کرام کا نام ہے، جن میں بعض بدری صحابی بھی ہیں، اور خصوصاً حضرت ابوسفیانؓ کے صاحبزادے اور حضرت امیر معاویہؓ کے بھائی کا نام ہے، ان کی خصوصیت یہ ہے کہ سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ملکِ شام کی فتح کے لیے جن چار ممتاز سپہ سالاروں کا انتخاب کیا تھا، آپ ان میں سے ایک ہیں۔

بہرحال ہم مسلمانوں کے ہاں تمام مسائل کی طرح الحمدللہ اِس مسئلے میں بھی (تحقیق صحیح پر مبنی) اعتدال ہے، اِسلام میں یہ بات طے ہے کہ کسی بھی فضیلت کے حصول کے لیے ''اِیمان'' کا ہونا بنیادی شرط ہے: (الطور:۲۱) ﴿والذین آمنوا واتبعتهم ذریتهم بایمان الحقنا بهم ذریتهم﴾ (اور جو لوگ ایمان لائے، پھر ان کی اولاد بھی ایمان کے ساتھ انہی کے نقشِ قدم پر چلی، تو ہم اولاد کو بھی اگلوں ہی کے ساتھ ملحق کر دیں گے)۔

اِس لیے ہماری خصوصی محبت کا تعلق ''سادات'' کے انہی سلسلوں سے ہے جو (ثابت النسب ہونے کے ساتھ ساتھ) صحیح الایمان (بھی) ہیں، ورنہ جو لوگ کہ خاندانِ سادات سے نسبی تعلق رکھنے کے باوجود کفریہ وشرکیہ عقائد میں مبتلا ہو گئے اُن سے یقیناً ہمارا کوئی تعلق نہیں۔

اِسی طرح حبِّ اہل بیت کا مطلب اہلِ اِسلام کے ہاں یہ نہیں ہے کہ دیگر صحابہؓ کرامؓ اور سلفِ صالحینؒ سے بغض رکھا جائے، اِس لیے جس طرح ہم ''حقِ نسب'' کی بنا پر، اہل بیتِ کرام سے تعلقِ خاطر رکھتے ہیں، اسی طرح ''حقِ صحبت'' کی بنا پر تمام صحابہؓ کرامؓ سے بھی والہانہ عقیدت ومحبت رکھتے ہیں، جیسا کہ ﴿وکلاً وعد الله الحسنیٰ﴾ (الحدید:۱۰) کا یہی تقاضا ہے۔

اور جولوگ کہ ﴿رحماء بینھم﴾ (الفتح:۲۹) کی قرآنی شہادت کے ہوتے ہوئے، تاریخی روایات کی بنیاد پر، صحابۂ کرام کی طرف ان کی شان سے فروتر چیزیں منسوب کرتے ہیں؛ وہ سخت دھوکے میں ہیں، اور غیر شعوری طور پر اُس فرقے کے پروپیگنڈوں کا شکار ہیں جس کی طرف قرآن کریم نے اپنے اِرشاد: (الفتح:۲۹) ﴿لیغیظ بھم الکفار﴾ (صحابہ کو مقبولیت وترقی اللہ نے اِس لیے دی، تا کہ دِل جلائے اُن کے ذریعے کافروں کا) سے اشارہ کیا ہے۔

اِسی طرح حبِّ رسول، حبِّ صحابہ، یا حبِّ اہلِ بیت کا مطلب ہمارے ہاں یہ بھی نہیں ہے کہ جو فضائل وخصوصیات قرآن وحدیث سے ان کے لیے ثابت نہیں ہیں زبردستی اُن کا ان کو مستحق ٹھہرایا جائے۔

(۹) شاز کی یہ بات بھی کتنی دجل آمیز ہے:

"......البتہ ابن تیمیہ، جن کی شناخت بیک وقت ایک مجاہد اور مجدد کی حیثیت سے ہے، ان کا بھی حال یہ ہے کہ وہ شیعوں کے بارہ اماموں کو تو ایک انحراف سے تعبیر کرتے ہیں، البتہ وہ شیعہ عالم علامہ حلّی کے اس اعتراض کا کوئی جواب نہیں دیتے کہ اگر بارہ امام کا تصور غلط ہے تو ان چار سنّی اماموں کا دینی جواز کیا ہے؟" (ص۲۰)۔

علامہ ابن تیمیہؒ کی شخصیت تو خیر بہت بڑی ہے، اِس فضول سوال کے جواب میں وہ کہاں وقت ضائع کرتے، جہالت وناواقفیت سے ناشی اِس طرح کے اِشکالات کو تو بفضلہٖ تعالیٰ ہم جیسے طلبہ بھی حل کر سکتے ہیں۔

ائمۂ اربعہ اور بارہ امام

بات یہ ہے کہ شیعوں کے ہاں "نبوت" کی طرح "امامت" بھی ایک غیر اختیاری منصب ہے، جو خانوادۂ اہل بیت کے مخصوص افراد کے لیے من جانب اللہ مختص کر دیا گیا ہے، اور اِس منصب کے حامل کو کلّی طور پر وہی سب اختیارات حاصل ہوتے ہیں جو کسی نبی

کو عطا ہوتے ہیں، انبیاء ہی کی طرح شیعوں کے ائمہ بھی معصوم ہوتے ہیں، حتی کہ نبیؐ معصوم سے ثابت شدہ اَحکام کو منسوخ کرنے کا اِختیار بھی رکھتے ہیں، بلکہ شیعی روایات تو اِس سے بھی بڑھ کر، ''اِمامت'' کو ''نبوت'' سے بھی افضل و برتر بتاتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

اِس کے برخلاف مسلمانوں کی اصطلاح میں ''اِمام'' کا لفظ یا تو نماز پڑھانے والے کے لیے بولا جاتا ہے، یا امیر المؤمنین اور صحیح العقیدہ سلطان المسلمین کے لیے۔

اسی طرح (تفسیر، حدیث، فقہ، نحو، صرف، بلاغت، لغت، منطق، فلسفہ، تاریخ وغیرہ) اِسلامی علوم وفنون میں سے کسی علم وفن کے ایسے ممتاز ماہر پر بھی اِس کا اِطلاق کیا جاتا ہے، جس کا قول اُس فن میں حجت اور دلیل کے طور پیش کیا جاتا ہو، گویا کہ وہ اپنے کمالِ علمی اور مہارتِ فنی کی بنا پر اُس مخصوص فن میں لوگوں کا مقتدا اور ''اِمام'' بن گیا ہے۔

جیسے تفسیر کے مشہور ائمہ میں سے متقدمین کے علاوہ امام رازی (ت:۶۰۶ھ) وغیرہ ہیں، حدیث کے ائمہ میں سے ائمہ ستہ کے علاوہ امام زہری (۱۲۴ھ)، امام شعبہ (۱۶۰ھ) وغیرہم ہیں، فقہ کے اماموں میں سے امام اوزاعی (۱۵۷ھ)، امام سفیان ثوری (۱۶۱ھ)، امام لیث بن سعد (۱۷۵ھ) وغیرہم رحمهم الله تعالى ہیں......۔

اور رہی بات ائمہ اربعہ (ابو حنیفہ، مالک، شافعی اور احمد رحمہم اللہ تعالیٰ) کی، تو اِن حضرات کا معاملہ شیعوں کے تصورِ اِمامت سے مندرجہ ذیل اعتبارات سے جداگانہ ہے:

۱: پہلی بات تو یہ کہ ان حضرات کی خصوصی شہرت، اہمیت اور مرجعیت، ائمہ اہلِ تشیع کے برخلاف، کسی مخصوص خاندان کے ساتھ خاص نہیں ہے، چنانچہ امام ابو حنیفہ (ت: ۱۵۰ھ) فارسی الاصل ہیں، امام مالک (۱۷۹ھ) قبیلۂ اصبح سے تعلق رکھتے ہیں، امام شافعی (۲۰۴ھ) قرشی مطلبی ہیں، اور امام احمد (۲۴۱ھ) شیبانی ذُہلی ہیں۔

۲: دوسرے یہ کہ ان کی امامت کسی باطنی سلسلۂ استخلاف کا نتیجہ نہیں، بلکہ اس میں ایک تو ان حضرات کی غیر اِختیاری اور خداداد مقبولیت ومحبوبیت کا اثر ہے، دوسرے

اس میں ان کے ذاتی اِکتساب، علمی جامعیت اور فنی کمالات کا دخل ہے، تیسرے اِس میں حالات وظروف کی موافقت اور ظاہری اسباب وعوامل کی مساعدت بطور خاص شامل ہے۔

چنانچہ امام ابوحنیفہؒ کے اجتہادات کو قبول عام حاصل ہونے کی وجوہ میں سے: آپ کے اقوال کا قرآنی آیات اور احادیث مشہورہ سے ثابت شدہ اصولوں پر مبنی ہونا ہے، پھر ظاہری طور پر آپ کے مخصوص شاگرد امام ابویوسف (۱۸۲ھ) کا حکومتِ اِسلامیہ میں قاضی القضاۃ کے اعلیٰ ترین عہدہ پر فائز ہوجانا، اور دیگر کئی شاگردوں کو مختلف بلاد وأمصار کا عہدۂ قضا تفویض ہوجانا ہے، اسی طرح ہندوستان اور ترکی حکومتوں کے بانیوں کا حنفی المسلک ہونا......وغیرہ بھی ہے۔

امام مالکؒ کے اقوال کے رواج کی بڑی وجہ: مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم میں آپ کا قیام، اور اندلس (اسپین) کی حکومت کا مالکی المذہب ہونا ہے۔

امام شافعیؒ کے مسلک کی مقبولیت کی بڑی وجہ: آپ کے اکثر اقوال کا ظاہرِ حدیث سے قریب تر ہونا، اور پھر مصری اور شامی حکم رانوں کا شافعی المشرب ہونا ہے۔

امام احمدؒ کے فرمودات کے ایک مستقل مسلک بن کر مقبول ہوجانے کی بڑی وجہ: اکثر مسائل میں ظاہر حدیث کی موافقت اور حکومتِ وقت کے ظلم واستبداد کے سامنے بے مثال عزم واستقامت کا مظاہرہ ہے۔

۳: ہمارے ائمۂ اربعہ اور شیعوں کے بارہ اماموں کے درمیان تیسرا بڑا ما بہ الفرق یہ ہے کہ ہمارے ہاں اعتماد: ائمہ کے اقوال کے بجائے نصوصِ شرعیہ پر کیا جاتا ہے، اور ائمہ کا تعاون صرف نص فہمی کی حد تک ہوتا ہے، امام ابوحنیفہؒ کے معروف شاگرد حضرت عبداللہ بن المبارکؒ (ت:۱۸۱ھ) کا یہ جملہ مشہور ہے: لا تقولوا: "قال أبو حنيفة كذا"، بل قولوا: فَهِم أبو حنيفة كذا (یہ مت کہو کہ ابوحنیفہ ایسا فرماتے ہیں، یہ کہا کرو کہ ابوحنیفہ نے یہ سمجھا ہے)۔

جب کہ شیعوں کے مذہب میں اقوالِ ائمہ، بمنزلۂ شریعت ہوتے ہیں، جو منصوص اَحکام پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔

۴: ائمۂ اربعہ کی حیثیت صرف ایک ممتاز عالمِ دین اور ماہرِ فن فقیہ کی ہے، جس میں بشری پہلو سے غلطیوں کا اِمکان ہی نہیں، بلکہ وقوع بھی تسلیم شدہ ہے، اِمام ابوحنیفہؒ جن کو ''اِمامِ اعظم'' بھی کہا جاتا ہے، اُن کے مجموعی اقوال میں سے خود اَحناف کے ہاں بھی بمشکل ساٹھ فیصد اَقوال پر فتویٰ ہے، اور باقی چالیس فی صد میں کہیں امام ابویوسف، کہیں امام محمد، کہیں امام زُفر، کہیں اِمام مالک، کہیں اِمام شافعی (رحمہم اللہ تعالیٰ)، اور کہیں کسی اور کے قول کو راجح قرار دیتے ہوئے اُسی پر فتویٰ دیا گیا ہے، جب کہ ائمۂ اثناعشر کی ہر طرح کی غلطیوں سے طہارت وعصمت کا عقیدہ: شیعہ مذہب کی اساسی بنیاد ہے۔

حضرات اہل بیت سے متعلق ہمارا عقیدہ

گذشتہ سطور میں حضراتِ اہل بیت کی ''اِمامت'' سے متعلق جو کچھ عرض کیا گیا اُس کا مقصد صرف شآز کی تلبیسات کو واضح کرنا تھا، ورنہ خاندانِ سادات کے اہل علم کو ''اِمام'' ہم بھی مانتے ہیں، البتہ معصوم نہیں مانتے، اور ''اِمامت'' کو کوئی باطنی عہدہ تسلیم نہیں کرتے۔

(۱۰) شآز کی مذکورہ کتاب میں مسلمانوں کے آپسی اِختلاف میں بھی اُصولی اور فروعی حیثیتوں سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا، حالاں کہ دونوں کی نوعیت اور اہمیت میں فرق ہے، جیسا کہ الحمدللہ گذشتہ صفحات میں مسئلے کی صحیح وضاحت پیش کی جاچکی۔

(۱۱) شآز نے اپنی مذکورہ کتاب میں مسلمانوں کو تسلی دیتے ہوئے یہ بات بھی لکھی ہے:

''......ایسی صورت حال میں یہ اندیشہ بالکل فطری ہے کہ اگر مروجہ دینداری کی بساط لپیٹ دی جائے تو پھر فقہی مسلمانوں کے دین کا کیا ہوگا؟......،......اسے شاید

اس بات سے تو محرومی رہے کہ وضو کے فرائض چار ہیں یا چھ یا سات، اور اس کی سنتیں یا نوافل کیا کیا اور کتنی ہیں، یا یہ کہ نماز میں رفعِ یدین، قرأت فاتحہ خلف امام یا آمین بالجہر کی کتنی اہمیت ہے، لیکن فی نفسہ وضو اور نماز کی ادائیگی میں اسے کوئی دشواری پیش نہ آئے گی، ایسا اِس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم کردہ روایت عہد بہ عہد نسلاً بعد نسل ہمیں اِس طرح منتقل ہوتی رہی ہے کہ ہم آج خود کو اس کڑی کے ایک تسلسل کے طور پر پاتے ہیں، اختلافات تو فقہاء کی موشگافیوں کی پیداوار ہیں، یا راویوں کی متضاد روایتوں نے انھیں جنم دیا ہے ......" (ص ۷۴-۷۵)

یہاں ایک سوال یہ ہے کہ جب شاز کے نزدیک دین کی بنیاد تیس سالوں کے بعد ہی متزلزل ہو چکی تھی، بعد کے سارے راویانِ حدیث: کذابین ووضاعین تھے، محدثین سب کے سب حاطبینِ لیل تھے، فقہاء ومجتہدین یہودیوں کے تلمود سے متاثر تھے، صوفیاءِ کرام اِسماعیلیوں (روافض) کے کارندے تھے؛ تو پھر وہ کون سا ایسا سلسلہ ہے کہ "ہم آج خود کو اس کڑی کے ایک تسلسل کے طور پر پاتے ہیں"؟!!

دوسرا سوال یہ ہے کہ یہ "تسلسل" اور "تعامل" کس کا معتبر ہے؟ برصغیر اور ترکی وغیرہ کے حنفی مسلمانوں کا؟ یا عرب ممالک کے شافعی اور حنبلی مسلمانوں کا؟ یا الجزائر اور تیونس وغیرہ کے مالکی مسلمانوں کا؟ اگر ہر ایک اپنی جگہ صحیح ہے تو پھر تو اِختلاف باقی رہ جائے گا، اور اگر کوئی ایک صحیح ہے تو پھر معیارِ ترجیح کیا ہوگا؟

اِس طرح کا خلط: مسئلے کی حقیقت جانے بغیر اپنی حماقت اور نادانی سے اُس میں دخل دینے سے ہوتا ہے، بنیادی چیز یہ ہے کہ اُصولی اور فروعی اِختلاف کے فرق کو ملحوظ رکھا جائے، ورنہ دنیا میں کون سا ایسا اہم مسئلہ ہے جس میں ایک سے زائد آراء نہ پائی جاتی ہوں، جب علمی صلاحیتیں مختلف ہوتی ہیں، عقول وفہوم میں تفاوت ہوتا ہے، ذوق ومزاج الگ الگ ہوتے ہیں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ مسئلے میں اِختلاف نہ ہو۔

(۱۲) شاز کی یہ بات بھی "وحدت اَدیان" کے باطل اور کفریہ فکر پر مبنی ہے:

''بین المذاہب، بین الفرق، بلکہ بین الجماعت اور بین المسالک مکالموں کی ابتدا بھی اس مقصد کی راہ میں حائل برف کو پگھلا سکتی ہے''۔

اِس اقتباس پر، مدرسے کے مولوی کے تبصرے کے بجائے، الہ آباد کورٹ کے مشہور جج (اکبر الہ آبادی مرحوم) کا ججمنٹ نقل کر دینا زیادہ مناسب ہے:

نئی تہذیب میں دِقت تو کچھ زیادہ نہیں ہوتی

مذاہب قائم رہتے ہیں، فقط ایمان جاتا ہے!

برادرانِ اسلام کو یاد رکھنا چاہیے کہ ''اِسلام'' میں حق و باطل کا پیمانہ اور صحیح و غلط کا معیار متعین اور طے شدہ ہے، اس کے لیے اَب نہ کسی مکالمے کی ضرورت ہے، نہ کسی مناظرے کی، اِسلام کی دعوت عام ہے، اُس کے اَحکام واضح ہیں، اُس کا راستہ کھلا ہوا ہے، جس کو اپنی آخرت سنوارنی ہے اُس کے لیے اِسلام کے علاوہ کسی اور مذہب کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔

پھر اِسلام کی طرف منسوب فرقوں اور جماعتوں میں بھی ''اہلِ حق'' کا مسلک و مشرب اور عقیدہ و مذہب روزِ روشن کی طرح نکھرا ہوا ہے، فروعی اِختلاف سے اِس پر کوئی فرق نہیں پڑتا، جن اَفراد اور جماعتوں سے اہلِ حق کا اُصولی اِختلاف ہے، وہ بھی عالم آشکارا ہے، اُس کے ذمہ دار خود اِنحراف کرنے والے لوگ ہیں، نہ کہ اِس پرآشوب اور پرفتن دور میں بھی بتوفیقہ تعالیٰ ''صراطِ مستقیم'' پر قائم اور مستقیم رہنے والے: (بخاری: ۷۳۱۱، ومسلم: ۱۹۲۱) ''لایزال طائفة من أمتي ظاهرين حتى يأتيهم أمر الله وهم ظاهرون'' (میری امت میں سے ایک جماعت ہمیشہ حق پر قائم رہے گی، یہاں تک کہ اللہ کا (کوئی مخصوص) امر آئے گا اِس حال میں کہ وہ اسی پر جمے رہیں گے)۔

پس ''مذہبِ حق'' کے طلب گاروں اور ''شاہ راہِ اعتدال'' کے جستجو کاروں کو سب سے پہلے: توحید، رسالت، قرآن اور یومِ آخرت پر اِیمان لانے کی دعوت ہے،

اُس کے بعد ذیلی تفصیل کسی بھی مستند صاحبِ علم وعمل سے حاصل کی جاسکتی ہے، جیسا کہ یہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول بھی رہا ہے، اور یہی دستور زمانہ بھی چلا آ رہا ہے۔

شاآز نے بطور خاص جن مسائل میں خلط سے کام لیا ہے، اُن میں ''تشبُّہ بالکفار'' کا مسئلہ بھی ہے، اِس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اِس بحث پر بھی مختصر سی روشنی ڈال دی جائے۔

تشبُّہ بالکفار

دنیا میں ہمیشہ سے دو گروہ پائے جاتے رہے ہیں: ایک خدا تعالیٰ کا مطیع و فرماں بردار، دوسرا باغی اور نافرمان، اِطاعت و فرماں برداری: اللہ تعالیٰ کے احکام کی تابع داری اور اُس کی مرضیات کے سامنے خود سپردگی کا نام ہے، اور بغاوت و نافرمانی: اللہ کے احکام سے حکم عدولی اور اس کے مطلوب راستے سے انحراف کا نام ہے، جس طرح دنیا کی کوئی بھی حکومت اپنی رعیت کا، باغیوں سے ربط و تعلق اور میل جول کسی طرح بھی گوارا نہیں کرتی، اسی طرح، بلکہ اُس سے کہیں زیادہ اللہ تعالیٰ کو اپنے فرماں بردار بندوں کا، باغیوں اور نافرمانوں سے فکری و نظریاتی اختلاط، قلبی و روحانی میلان، اور تہذیبی و ثقافتی میل جول رکھنا ناگوار اور ناپسندیدہ ہے، جیسا کہ مندرجہ ذیل آیات میں اِس مضمون کا بیان ہے:

﴿یا أیها الذین آمنوا ادخلوا في السلم کافةً، ولا تتبعوا خطوات الشیطان، إنه لکم عدو مبین﴾ (البقرۃ:۲۰۸) (ایمان والو! اِسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ، شیطان کے بچھائے ہوئے راستوں پر مت چلو، کیوں کہ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے)۔

﴿کفرنا بکم وبدا بیننا وبینکم العداوة والبغضاء أبداً حتی تؤمنوا باللّٰه وحده﴾ (الممتحنۃ:۴) (ہم تم سے بیزار ہیں، ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ بغض وعداوت ظاہر رہے گی جب تک کہ تم اللہ وحدہ لاشریک پر ایمان نہیں لاتے)۔

﴿ثُمَّ جَعَلْنَاکَ عَلَی شَرِیْعَةٍ مِّنَ الأَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلا تَتَّبِعْ (الجاثیۃ:۱۸)

﴿أَهْوَاءَ الَّذِيْنَ لا يَعْلَمُوْنَ﴾ (پھر ہم نے آپ کو دین کے ایک خاص طریقہ پر کردیا، آپ اسی کا اتباع کریں اور نادانوں کی خواہشوں پر نہ چلیں)۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے: (الانعام:۱۰۶) ﴿إِتَّبِعْ مَا أُوْحِيَ إِلَيْکَ مِنْ رَّبِّکَ لا إِلَهَ إِلا هُوَ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ (آپ اس طریقہ پر چلیں جس کی وحی آپ کے رب کی طرف سے آئی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اور مشرکوں سے الگ رہیں)۔

قرآن کریم کی پہلی سورت ''سورۂ فاتحہ'' میں مسلمانوں کو جہاں اِثباتی صیغہ کے ساتھ یہ دعا تعلیم فرمائی گئی ہے: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ، صِرَاطَ الَّذِيْنَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ (اے رب! ہم کو سیدھا راستہ چلایئے، ان لوگوں کا راستہ جن پر آپ نے انعام فرمایا ہے)، وہیں آگے منفی صیغہ کے ساتھ یہ قید بھی لگوائی گئی ہے: ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلا الضَّالِّيْنَ﴾ (جن پر نہ آپ کا غضب نازل ہوا (یہود کی طرح) اور نہ وہ گمراہ ہوئے (نصاریٰ کی طرح)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اختیار کردہ طریقے اور چلے ہوئے راستے کو معیارِ حق قرار دیتے ہوئے یہ اِرشاد ہے: (الأنعام:۱۵۳) ﴿وأن هذا صراطي مستقيماً فاتبعوه، ولا تتبعوا السبل فتفرق بكم عن سبيله﴾ (یقیناً میرا راستہ ہی سیدھا راستہ ہے، لہٰذا اسی کو اختیار کرو، اور ادھر ادھر کے راستوں کے پیچھے مت پڑو کہ وہ تم کو اللہ کے راستے سے دور کردیں گے)۔

''صراطِ مستقیم'' (سیدھے راستے) میں جس طرح فکر وعقیدہ وغیرہ افکار ونظریات داخل ہیں، اسی طرح یہ لفظ قولی وفعلی عبادات، اور کھانے پینے، پہننے اوڑھنے، رہنے سہنے کی عادات (وغیرہ امور) کو بھی شامل ہے، جیسا کہ مطلق کا یہی مقتضیٰ ہوا کرتا ہے، ومن ادعی تخصيصه فعليه دليله۔

تشبُّہ اور تشابُہ کا فرق:

یہاں یہ واضح رہنا چاہیے کہ ایک چیز ہے غیر اختیاری تشابہ اور ہم آہنگی، جیسے شکل وصورت، زبان ولغت، علاقہ ووطن، اور کھانے پینے کی چیزوں میں فطری اور پیدائشی یکسانیت، دوسری چیز ہے کسی قوم یا فرد سے مرعوب ومتأثر ہوکر، اور قلبی طور پر اُس کی طرف مائل ہوکر، اُس کی کسی عادت یا خصوصیت کی اتباع اور نقالی، ظاہر ہے کہ پہلی صورت میں کوئی حرج نہیں ہوسکتا، کیوں کہ یہ فطری امور ہیں، اور مسئلۂ تشبُّہ کی بنیاد ہی فطرت کی حفاظت اور باغیانِ فطرت کی مخالفت پر ہے، اور دوسری صورت شریعت کی اصطلاح میں ''تشبُّہ بالغیر'' کہلاتی ہے، جو اِسلام میں ناپسندیدہ اور ممنوع ہے، ارشادِ ربانی ہے: (ہود:۱۱۳) ﴿ولا ترکنوا إلی الذین ظلموا فتمسکم النار﴾ (اور تم لوگ ظالموں کی طرف (قلبی طور پر) مت جھکو کہ تمھیں بھی جہنم کی آگ چھوجائے)۔

اِسی قلبی میلان اور فکری مرعوبیت کے ساتھ جو نقالی پائی جاتی ہے اُسی سے منع کرتے ہوئے حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے: (ابوداود۲:۵۵۸) ''من تشبہ بقوم فھو منھم'' (جو جس قوم کی مشابہت اختیار کرے گا وہ اُن ہی میں شمار ہوگا)، اور قرآن کریم میں اِس طرح اِرشاد ہے: (المائدۃ:۵۱) ﴿ومن یتولھم منکم فإنہ منھم﴾ (اور تم میں سے جو ان کافروں سے دوستی گانٹھے گا وہ اُنہی میں سے مانا جائے گا)۔

جس طرح کہ دنیوی معاملات میں ہوا کرتا ہے کہ جس کا اُٹھنا بیٹھنا، رہنا سہنا جن لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے، اور خصوصاً لباس اور طرزِ معاشرت (فوج، پولس، سول ملازم، وکیل، ٹی ٹی وغیرہ) جس طرح کا ہوتا ہے، ظاہراً اُس کو وہی سمجھا جاتا ہے، اور اُس پر وہی حکم لگایا جاتا ہے۔

لہٰذا تشبُّہ کی حقیقت اور روح ہے: اللہ کے اور فطرتِ (اِسلام) کے باغیوں کی طرف قلب کا جھکاؤ، اور اُن کی ایسی چیزوں کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھنا جنھیں اِسلام نے

منع کر رکھا ہے یا اسلام میں اُن کا متبادِل موجود ہے، اور اگر اسی کے ساتھ ساتھ اسلامی چیزوں کی تحقیر بھی پائی جائے تو یہ تشبُّہ کا انتہائی درجہ (یعنی کفر) ہوگا۔

اِس اصولی مضمون کو سمجھنے کے بعد مسئلۂ تشبُّہ سے متعلق خلط والتباس سے بھرپور ایک نمونہ بھی ملاحظہ فرمالیجیے:

"...... ہمارے زوال کے عہد میں تحفظِ اِسلامی کی خاطر عرب تہذیبی مظاہر پر غیر ضروری اصرار کی جو لئے اپنے اپنے زمانے میں ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ کے یہاں غیر معمولی طور پر بلند ہوتی گئی تھی، اور جس کے نتیجے میں اِسلام کو عرب مشرقی ورثے کے طور پر دیکھنے کا رواج عام ہوا، التباسات کی یہ دھند بھی اَب چھٹنے کو ہے۔ ﴿إذ النفوس زوجت﴾ کی عمومی فضا میں اب ہمارے لیے یہ سمجھنا آسان ہے کہ آفاقی نبی کی امت کسی ایک تہذیبی مظاہر، جغرافیائی ماحول اور اُس سے متاثر لباس کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ اب بھی اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ کسی خاص زبان سے اِسلام کو نفرت ہے، یا کوئی خاص لباس غیر قوموں کا لباس ہے، جس کے پہننے سے اسلام رخصت ہوجاتا ہے، تو اس کا یہ سمجھنا ایک بین الاقوامی پیغمبر کی آفاقیت کو مشتبہ کردیتا ہے۔

من تشبه بقوم فهو منهم کی فرضی حدیث اور اس کی خیالی تعبیرات نے صدیوں سے اسلام کو ایک عرب تہذیبی اکائی کے طور پر متعارف کرا رکھا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مکانی فاصلوں کے سکڑنے کی وجہ سے اب یہ مفروضات خود بخود ختم ہو رہے ہیں، کل تک جو بات فقہائے حنابلہ، فقہائے احناف کے لیے سمجھنا مشکل تھی اور جس کی وجہ سے تہذیبی مظاہر کی بنیاد پر کفر واسلام کے فتوے صادر کرنے کا رواج عام تھا، آج وہی بات نئی سکڑتی دنیا میں قرآن کے معمولی طالب علم کے لیے بھی سمجھنا آسان ہوگئی ہے کہ تہذیبی مظاہر یا لباس کی بنیاد پر کفر واسلام کا فیصلہ نہیں ہوسکتا......

﴿إذ النفوس زوجت﴾ کے موجودہ ماحول میں اب اِن فتووں پر کسے یقین آئے گا کہ غیر عربی طرز کے لباس پہننا یا غیر عربی انداز سے بالوں کا ترشوانا حرام ہے، یا یہ کہ فارسی زبان کا سیکھنا (جس میں اَب انگریزی، فرنچ، جرمن اور دوسری

غیر عرب زبانوں کو بھی شامل کیا جانا چاہیے) من تشبہ کی رو سے حرام ہے۔اب کون اِس بات پر یقین کرے گا کہ انگریزی زبان منافق بناتی ہے؟ اور کون اِس فتوے کو معتبر سمجھے گا کہ غیر مسلم ملکوں میں رہائش اختیار کرنے والا شخص بروز حشر مشرکوں میں اٹھایا جائے گا؟ کیا اہل سنت والجماعت کا کوئی شخص آج بھی ابن تیمیہ کی طرح اِس عقیدے کا متحمل ہوسکتا ہے کہ جنس عرب، جنس عجم سے افضل ہے......؟'' (مستقبل کی بازیافت، ص۲۹-۳۰)۔

یہ اقتباس جہالت/تجاہل، خلط اور تلبیس کی افسوس ناک مثال ہے، اِس میں کئی مؤاخذات ہیں:

ا: ''تشبُّہ'' کے مسئلے کو ابن تیمیہؒ (ت: ۷۲۸ھ) کے ذریعہ عہدِ زوال میں اٹھایا جانے والا مسئلہ قرار دیا گیا ہے، حالاں کہ:

الف: اِس کی سب سے پہلی تردید پیشِ نظر مضمون میں نقل کردہ اُس حدیث سے ہوجاتی ہے جس کو ''فرضی حدیث'' کہا گیا ہے، کیوں کہ یہ حدیث صرف حضرت عبداللہ ابن عمرؓ ہی کے طریق سے کتبِ مشہورہ میں سے ''سنن'' سعید بن منصور (ت: ۲۲۷)، ''مصنَّف'' ابن ابی شیبہ (ت: ۲۳۵)، ''مسند'' احمد (ت: ۲۴۱)، ''مسند'' عبد بن حمید (ت: ۲۴۹)، اور ''سنن'' ابوداود (ت: ۲۷۵) میں ہے، اور یہ سب کتابیں تیسری صدی ہجری کی ہیں، جو مسلمانوں کے سیاسی عروج کا سب سے تابناک دور ہے۔

تو ایک ایسی حدیث جو مسلمانوں کے ابتدائی عہد (زمانۂ عروج) میں شہرت کی حد تک پہنچی ہوئی ہے، اُس کو ''فرضی حدیث'' قرار دے کر اُس کی ذمہ داری آٹھویں صدی کے (وقتی) عہدِ زوال کے لوگوں پر ڈالنا، تلبیس نہیں تو اور کیا ہے؟

ب: دوسری بات یہ کہ مذکورہ حدیث کو ''فرضی'' ٹھہرا کر ایسا تاثر دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ گویا تشبہ کے مسئلے کا سارا مدار اسی حدیث پر ہے، اور جب یہ حدیث ہی فرضی ٹھہری تو پھر اس پر متفرع سارے مسائل خود بخود غیر معتبر اور نا قابلِ اعتنا ہوگئے، حالاں

کہ اگر بحیثیت نقلی دلیل کے ایسا ہوتا بھی کہ اس کے علاوہ کوئی اور حدیث نہ ہوتی، جب بھی مجموعی طرق کے اعتبار سے یہ حدیث اِن الفاظ سے کم از کم "حسن" درجے کی ہے، جو اِثباتِ مسئلہ کے لیے تنہا ہی کافی ہو جاتی ہے۔

ج: پھر مذکورہ الفاظ سے ہٹ کر، "تشبُّہ غیر مسلمین" کی ممانعت، اور "مخالفتِ مشرکین" کے حکم کے سلسلے میں اور بھی ایسی صحیح احادیث وارد ہوئی ہیں جن سے گذشتہ حدیث کو اور تقویت ہو جاتی ہے، مثلاً: بخاری (۵۸۹۲) و مسلم (۲۵۹) کی روایت: "خالفوا المشركين"، اور بخاری (۳۴۶۲) و مسلم (۲۱۰۳) ہی کی یہ حدیث: "إن اليهود والنصارى لا يصبغون، فخالفوهم"، اور ترمذی (۲۶۹۵) کی یہ روایت: "ليس منا من تشبه بغيرنا"۔

د: اور سب سے بڑھ کر اِس حدیث کو قرآن کریم کی اُن آیات کی معنوی تائید بھی حاصل ہے جو ابھی پیش کی گئیں۔

ھ: نقلی دلائل کے پہلو بہ پہلو عقلِ سلیم بھی اسی کی متقاضی ہے کہ "تشبہ" کو ایک حساس مسئلہ قرار دیا جائے، تا کہ اہلِ حق اور اہلِ باطل میں امتیاز باقی رہے، اور خدائے ذوالجلال کے تابعداروں اور اُس کے نافرمانوں میں مطلوب فاصلہ قائم رہے۔

۲: شاؔز کے مذکورہ اقتباس میں قرآن کریم کی آیت: ﴿إذ النفوس زوجت﴾ کی معنوی تحریف کرتے ہوئے اُس سے بے محل استدلال کیا گیا ہے، جیسا کہ اس کی تفصیل "قرآن کریم کے معانی میں تحریف" کے عنوان کے تحت گذر چکی۔

۳: اختیاری، اور اضطراری حالات کے الگ الگ اسلامی احکام میں خلط سے کام لیا گیا ہے، جب اپنی حکومت ہو، اپنے اختیارات ہوں، احکامِ اِسلام کے نفاذ کے مواقع ہوں؛ اُس وقت کے تقاضے علیحدہ ہیں، اور جب کی زندگی کا دور ہو، اِیمان و اِسلام ہی کی حفاظت کے لالے پڑ رہے ہوں؛ اُس وقت کے مسائل الگ ہیں، باقی رہے اہلِ

عزیمت اور اُصحابِ استقامت حضرات؛ تو ان کا مشرب و مسلک ہر گاہ اور ہر جا یکساں ہی رہتا ہے:

(البقرۃ:۱۷۷)﴿والموفون بعهدهم إذا عاهدوا، والصابرين في البأساء والضراء وحين البأس، أولئک الذين صدقوا، وأولئک هم المتقون﴾(......اور جو لوگ کہ پیانِ وفا باندھنے کے بعد اُس کو پورا کرنے والے ہوں، اور فاقہ و تنگی، بیماری و آزاری اور لڑائی کے وقت بھی ثابت قدم رہتے ہوں، یہ ہیں وہ لوگ جو سچے ہیں، اور یہی ہیں وہ لوگ جو متقی ہیں)۔

۴: محولہ اقتباس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ''آفاقیت'' کے قرآنی تصور کو بدل کر، پیش کرنے کی انتہائی ملحدانہ کوشش کی گئی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی (نعوذ باللہ) کوئی آثارِ قدیمہ کا جامد نمونہ نہیں ہے، کہ ''میوزیم'' میں سجا کر رکھ دی گئی ہو، اور موافق و مخالف پوری قوم کا مشترکہ سرمایہ ہو، بلکہ آپ کی ذاتِ اقدس: تمام عالَم کے (جن و اِنس کے) لیے، اپنے تمام گوشہائے حیات کے ساتھ؛ حق و باطل کا معیار، خیر و شر کا پیمانہ اور صحیح و غلط کی کسوٹی ہے، آپ کی آفاقیت اپنے بشری اوصاف و خصائص کے ساتھ، طالبانِ حق کے لیے ایک چلتا پھرتا زندہ و تابندہ نمونہ ہے: (آل عمران:۳۱)﴿قل إن كنتم تحبون الله فاتبعوني﴾(آپ فرمادیں: اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو)۔

اِس لیے آپ کی حیاتِ طیبہ کا ہر پہلو امت کے لیے اسوہ ہے، اِلّا یہ کہ کسی عمل کی آپ کے ساتھ خصوصیت ثابت ہو جائے۔

۵: گذشتہ اقتباس میں لباس، زبان، وضع قطع اور طرزِ معاشرت میں تشبُّہ کے مسئلے پر جس انداز سے تبصرہ کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والا ''تشبُّہ'' کی حقیقت ہی سے جاہل ہے، حالاں کہ مسئلے کی تمہید میں اس سے متعلق (بتوفیقہ تعالیٰ) جو

کچھ عرض کیا جا چکا ہے اُس سے یہ مبحث بالکل آئینہ ہو جاتا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ غیروں (باغیوں) کی جو نقالی اُن سے ذہنی وفکری مرعوبیت اور قلبی رکون ومیلان کے ساتھ پائی جائے وہ شریعت میں ممنوع ہے، اور یا پھر وہ چیزیں منع ہیں جن کے اندر ذاتی خرابی اور فساد ہے، نہ کہ ہر طرح کا تشابُہ اور یکسانیت۔

چونکہ اِس مسئلہ میں خلط والتباس بہت عام ہے اِس لیے اِحساسِ طوالت کے باوجود (تمکیناً للعارفین و تبصیراً للطالبین) فقہی انداز میں اِس کی مزید وضاحت ذیل میں پیش کی جاتی ہے (و باللّٰہ التوفیق):

تشبُّہ کے مراتب اور احکام:

الف: غیروں کی یہ نقالی اور تشبُّہ: اسلام کے جس حیثیت کے رکن کے مقابلہ میں ہوگا اُس کا وہی حکم ہوگا، اگر اُس کا تعلق غیروں کے فکر وعقیدہ سے ہے تو یہ تشبُّہ کفر ہوگا، جیسے ہندوؤں کے عقیدۂ حلول وتناسخ، عیسائیوں کے عقیدۂ تثلیث، روافض کے عقیدۂ تحریفِ قرآن، وغیرہ کا اختیار کرنا، یا کسی قوم اور فرقے کے کفریہ وشرکیہ شعائر وعلامات کو صحیح سمجھنا، اس کی تعریف یا تعظیم کرنا، یا اسلام کے عقیدۂ توحید، عقیدۂ نبوت، ختمِ نبوت، قرآن، معجزات، تقدیر، موت، بعث بعد الموت، قیامت، جنت، دوزخ، اور فرشتوں وغیرہ میں سے کسی کا انکار کرنا، یا مذاق اڑانا۔

ب: اور اگر یہ تشبُّہ غیروں کے عقائد سے تو تعلق نہ رکھتا ہو، مگر اُن کی مذہبی خصوصیات میں سے ہو، تو یہ کفریہ عمل ہے، جو حرام تو بالاتفاق ہے، اور علماء کی ایک جماعت کے نزدیک ظاہر میں کفر ہی کا حکم بھی لگایا جائے گا، جیسے صلیب لٹکانا، قشقہ لگانا، جنیو باندھنا، زُنّار لٹکانا، کڑا پہننا، کلائی پر سرخ دھاگہ باندھنا، جے پکارنا، مندروں اور اُن کے مذہبی تہواروں اور پروگراموں میں جانا، وغیرہ۔

یہ بات تو ہمارے معاشرے میں بھی تسلیم کی جاتی ہے کہ جو شخص جس جماعت کی

تعداد میں اضافہ کرتا ہے وہ اسی میں شمار کیا جاتا ہے: (إتحاف الخیرۃ: ۳۲۹۷ بضعف)
''من کثر سواد قوم فھو منھم''، اگر مسلمانوں کی پنج وقتہ جماعت، جمعہ اور عیدین میں شریک ہو کر اُن کی تعداد میں اضافہ کا سبب بن رہا ہے تو وہ مسلمان مانا جائے گا، اگر محرّم کے جلوس میں شرکت کر رہا ہے تو رافضی سمجھا جائے گا، اگر ۱۲/ ربیع الأول کے جلوس میں شریک ہو رہا ہے تو بدعتی کہلائے گا، اور اگر ہولی، دیوالی، دسہرے اور کرسمس ڈے وغیرہ مشرکانہ اور کافرانہ تہواروں اور جلوسوں میں شرکت کر رہا ہے، تو ظاہر ہے کہ اُس کو وہی سمجھا بھی جائے گا۔

ضروری تنبیہ:

لفظِ ''نمستے'' اور ''نمسکار'' ہنود کے یہاں سلام کا ایک طریقہ ہے، مگر اِس کا مفہوم ''شرکیہ'' ہے، لہٰذا ''نمستے'' یا ''نمسکار'' کرنا کفریہ شعار اور شرعاً حرام ہے، اِسی طرح ''وَندے ماترم'' اور ''جن گن من'' کفریہ اور شرکیہ مضامین پر مشتمل گیت ہیں (جو انگریز حکومت کے اعزاز میں لکھے گئے تھے!)، اور ''یوگا'' خالص ہندوانہ شعار اور غیروں کا طریقۂ پرستش ہے، لہٰذا اِن پروگراموں میں شرکت کرنا، اور اُن کے الفاظ اپنی زبان سے ادا کرنا، کفریہ عمل ہے، اِسکولوں اور دیگر پروگراموں میں ہمارے مسلمان بھائیوں کو اِن چیزوں سے اِحتراز کرنا چاہیے۔

ج: اور اگر اُن چیزوں کا تعلق نہ اغیار کے مذہبی عقائد سے ہو، اور نہ مذہبی علامتوں سے، بلکہ اُن کے قومی شعائر (معاشرت و معاملات، اور اَطوار و عادات) سے ہو تو بعضی چیزیں اُن میں ایسی ہیں کہ وہ بہر حال بری اور شریعت میں ممنوع ہیں، جیسے برتھ ڈے منانا (جو یہودیوں، نصرانیوں کا شعار ہے)، تیجہ، چالیسواں، برسی وغیرہ منانا (جو اِیرانی روافض کا شعار ہے)، یا شادی بیاہ میں بارات، منڈھا، اُبٹن وغیرہ رسمیں اختیار کرنا (جو ہندوانہ طریقے ہیں)۔

اِسی طرح ڈاڑھی منڈانا، ٹخنے ڈھانکنا، گھٹنے کھولنا، عورتوں کا بے پردہ رہنا، ترچھی مانگ نکالنا، غیر اِسلامی بال رکھنا، کھڑے ہوکر پیشاب کرنا، مردوں کے لیے عورتوں کے اور عورتوں کے لیے مردوں کے لباس پہننا، یہ سب چیزیں بھی چونکہ خلافِ سنت اور مخالفِ فطرت ہیں، اِس لیے ہمیشہ گناہ رہیں گی۔

حدیث صحیح میں ہے (بخاری و مسلم): ''خالفوا المشركين .... وفي رواية: خالفوا المجوس .....: وفروا اللحى، وأحفوا الشوارب ''. (مشرکوں کی مخالفت کرو، اور ایک روایت میں ہے: مجوسیوں کی مخالفت کرو، ڈاڑھی بڑھا کر اور مونچھیں کترواکر)۔

د: اور بعض چیزیں ایسی ہیں کہ وہ خود تو مباح ہوتی ہیں، مگر کسی علاقہ یا کسی زمانہ میں غیر قوموں کی خصوصیت اور ان کا امتیازی نشان بن گئیں، تو جب تک یہ خصوصیت باقی رہے گی اُس وقت تک وہ ''تشبُّہ'' کی تعریف میں داخل ہوکر ممنوع اور فقہی اصطلاح میں مکروہ تحریمی ہوں گی، جیسے غیر قوموں کے کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے، اور رہنے سہنے، کے طور طریقے، اور ان کے وہ لباس جن میں نہ ٹخنے ڈھنکتے ہوں، نہ گھٹنے کھلتے ہوں، اور نہ بے پردگی ہوتی ہو (کیوں کہ ٹخنے ڈھانکنا، ستر کھولنا، اور بے پردگی کرنا تو ہمیشہ ہی منع ہے)۔

ترمذی کی حدیث ہے (۹۹:۲): ''لا تشبهوا باليهود ولا بالنصارى، فإن تسليم اليهود: الإشارة بالأصابع، وتسليم النصارى: الإشارة بالأكف ''. (یہود ونصاریٰ کی مشابہت مت اختیار کرو، یہود انگلیوں کے اشارہ سے سلام کرتے ہیں، اور عیسائی ہتھیلیوں کے اشارہ سے)۔

ایک حدیث میں ہے (ابوداود ۱:۷۱): ''ذُكر له الشبور، فلم يعجبه ذلك، وقال: هو من أمر اليهود، فذكر له الناقوس، فقال: هو من أمر النصارىٰ ''. (لوگوں کو نماز کے لیے جمع کرنے کے سلسلہ میں شبور (نقارہ) کا تذکرہ کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند نہ آیا اور آپ نے فرمایا کہ وہ یہودیوں کی چیز ہے، پھر ناقوس

(سائرن) کا ذکر کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ عیسائیوں کی چیز ہے، پھر ''اذان'' مشروع کی گئی)۔

ایک حدیث میں فرمایا گیا (ترمذی۲:۱۰۷) : ''نظفوا أفنيتكم، ولا تشبهوا باليهود '' (اپنے دروازے صاف ستھرے رکھا کرو، یہودیوں کی طرح (گندے) مت رہا کرو)۔

ایک حدیث یہ ہے (ابوداود۲:۶۹۸) : ''قلتُ: خذها وأنا الغلام الفارسي، فالتفت إليّ النبي صلى اللّٰه عليه وسلم، فقال: "هلاّقلت: أنا الغلام الأنصاري ''. (فارسی الأصل صحابی (حضرت ابوعُقبہ رُشید فارسی، ثم انصاریؓ فرماتے ہیں کہ ایک جنگ کے موقع پر میں نے تیر چلاتے ہوئے نعرہ بلند کیا کہ لے سنبھال، میں فارسی تیرانداز ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً ٹوکتے ہوئے فرمایا: کہ تم نے (اسلامی نسبت اختیار کرتے ہوئے) یہ کیوں نہیں کہا کہ میں انصاری تیرانداز ہوں؟)۔

ھ: جو چیزیں ذاتی طور پر مباح ہوں، مگر غیروں سے آئی ہوں، اور مسلمانوں کے پاس اُن کا متبادِل موجود ہو، تو غیرت کا تقاضا یہی ہے کہ پھر (حتی الامکان) دوسروں کی چیزوں کی طرف نظر نہ اٹھائی جائے، اور اپنی ہی چیزیں استعمال کی جائیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر یہ کہہ کر چھری واپس کردی تھی: ''أما الظفر فمدى الحبشة '' (بخاری:۱:۳۳۸، ومسلم۲:۱۵۷) کہ جانوروں کے ناخن سے بنی ہوئی چھری حبشیوں کی چیز ہے۔

ایک صحابی کے ہاتھ میں عربی کمان کے بجائے ایرانیوں کی بنائی ہوئی کمان دیکھ کر فرمایا تھا: ''ما هذه؟ ألقها، وعليكم بهذه وأشباهها '' (ابن ماجہ:۲۸۱۰) یہ کیا ہے؟ اسے پھینک دو، عربی کمان رکھو، جس کے ذریعہ اللہ نے تمہیں فتح وشوکت دی ہے۔

و: اور جو مباح چیزیں بشری ضروریات سے تعلق رکھتی ہوں، غیروں کا شعار نہ

ہوں، اور مسلمانوں کے پاس اُن کا متبادِل بھی موجود نہ ہو، تو بوقت ضرورت اُن کے اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ احزاب کے موقع پر حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورہ سے اہل فارس کے طرز پر خندق کھدوائی تھی، غزوۂ طائف کے موقع پر منجنیق (توپ) کا استعمال کیا تھا، حضرت عمرؓ نے حضرت اسماء بنت عمیسؓ کے مشورہ سے اہل حبشہ کی طرح تابوت بنوائے تھے۔

تشبُّہ سے متعلق اِسلام کے یہ واضح احکام ہیں، جو کتاب وسنت کی روشنی میں فقہائے کرام نے مدون فرمائے ہیں، مگر غیر قوموں کی موجودہ دنیوی ترقیات سے مرعوب اَذہان اپنی کم علمی اور بدفہمی کی بنا پر دین کے دیگر مسائل کی طرح اِس مسئلے میں بھی سخت قسم کے خلط والتباس کا شکار ہیں، امید کہ گذشتہ تفصیلات سے طالبانِ حق کی تشفی کا کچھ سامان ہوگیا ہوگا، وما توفيقي إلا بالله۔

گذشتہ صفحات میں ''اعتدال''، ''بے اعتدالی''، اور ''اِفراط'' و ''تفریط'' کے اَلفاظ بار بار استعمال کیے گئے ہیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ''اعتدال'' کی حقیقت، اہمیت اور اُس کے شرعی معیار سے متعلق بھی کچھ تفصیلات نذرِ قارئین کردی جائیں، امید کہ اِن شاء اللہ العزیز طالبانِ حق کے لیے مفید اور نافع ہوں گی۔

اِعتدال

حقیقت اور اہمیت

الحمدللہ، اللہ رب العزۃ نے ہم لوگوں کو محض اپنے فضل وکرم سے اِسلام جیسے ''اِعتدال پسند'' مذہب سے وابستہ فرمایا ہے، جس میں نہ تو یہود جیسی اِفراط اور شدت پسندی ہے، اور نہ ہی نصاریٰ جیسی تفریط اور کوتاہ دستی، یہ صفتِ ''اِعتدال'' دِین ودُنیا کے ہر معاملہ میں پسندیدہ اور مطلوب شیٔ ہے، یہ وصف مردوں کا جوہر اور جواں مَردوں کی شان ہے، اہلِ عرب کا مقولہ ہے: الاعتدال: حِلیة الرجال (میانہ رَوِی مردوں کی زیبائش ہے)، بزرگوں کا یہ مقولہ بھی مشہور ہے: خیر الأمور أوساطها (معاملہ کے مختلف پہلوؤں میں سے عام طور پر بہتر اُس کا درمیانی پہلو ہوتا ہے)۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم لوگ کچھ اپنی کم علمی اور کم فہمی کی وجہ سے اور کچھ دِین سے بے توجہی اور غفلت کی وجہ سے، اِس لفظِ ''اِعتدال'' کی معنویت اور شریعت میں اس کی اہمیت سے ناواقف ہوتے جارہے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اِس وقت ہمارے اَفکار ونظریات، اور عقائد وعبادات سے لے کر زندگی کے تمام شعبوں میں اِفراط وتفریط اور بے اِعتدالی پیدا ہوتی جارہی ہے، حالاں کہ جس طرح جسمانی نظام میں اَخلاطِ اربعہ میں سے کسی خِلط کی کمی بیشی اِنسان کو بیمار بنادیتی ہے، اور جس طرح دُنیوی اور سیاسی نظام میں ظلم وناانصافی ملک کی سالمیت تک کو خطرہ میں ڈال دیتی ہے، اِسی طرح روحانی اور دِینی نظام کی بے اِعتدالی اور اِفراط وتفریط کے نتائج بھی بڑے مضر اور نقصاندہ ہوتے ہیں، اِس لیے اِس سلسلہ میں چند باتیں بطورِ تذکیر کے پیش کی جاتی ہیں، اللہ تعالیٰ نافع بنادیں۔

اعتدال کی لغوی تعریف:

لغت کے اِعتبار سے ''اِعتدال'' نام ہے: کیفیت یا مقدار میں دو پہلوؤں میں سے درمیانی پہلو کا، یعنی اِفراط وتفریط، غلو وتقصیر، اور کمی وزیادتی کے دو متضاد کناروں کے مابین؛ درمیانی اور معتدل راستہ۔

''توسُّط''، ''اِقتصاد'' اور ''اِستقامت'' وغیرہ اَلفاظ بھی ''عدل'' و ''اِعتدال'' ہی کے ہم معنی سمجھے جاتے ہیں، اِسی لیے ''راہِ اعتدال''، ''میانہ رَوِی''، ''امرِ متوسّط'' اور ''صراطِ مستقیم'' یہ سب ایک دوسرے کے قریب المعانی کلمات ہیں۔

اعتدال کی شرعی حقیقت:

جب لغت کے ذریعہ یہ بات متعین ہوگئی کہ ''اِعتدال'': ''اِفراط وتفریط'' اور ''ظلم وناانصافی'' کی ضد ہے، تو اِسی سے اِس کی شرعی حقیقت بھی واضح ہوگئی، لہٰذا اگر ''ظلم'' کی حقیقت ہے: **وضع الشيء في غير محله** (کسی چیز: جان، طاقت، آبرو، دولت، علم، عقل وغیرہ کا بے موقع استعمال کرنا)، تو ''اِعتدال'' کی حقیقت ہے: **وضع الشيء في محله**، یا **إعطاء كل ذي حق حقه** (ہر چیز کو اُس کی جگہ پر رکھنا، اور صاحبِ حق کو اُس کا حق پہنچا دینا)۔

یعنی جس کی جتنی واقعی اہمیت اور حیثیت ہو اُس کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کرنا، مثلاً: اللہ، رسول، دین وشریعت، فکرِ آخرت وغیرہ کے بارے میں اُن کے شایانِ شان معاملہ کرنا، پھر اپنی جان، اپنی آبرو، اپنے مال، والدین، بیوی، بچوں، رشتہ داروں، پڑوسیوں اور دیگر اِنسانوں اور مخلوقات کا حسبِ مرتبہ خیال رکھنا، اور دنیا، دنیا کے مال ومتاع، جاہ ومنصب اور تعیُّش وآرام کے لیے اُس کے حسبِ حیثیت معاملہ کرنا؛ یہی ''شرعی اِعتدال'' ہے۔

اِعتدال کی اہمیت:

''اِعتدال'' کو عباد الرحمٰن (رحمٰن کے مخصوص بندوں) کے اوصاف میں شمار کرایا گیا ہے، اعتدال ہی کی بدولت، اللہ تعالیٰ نے اہلِ اِسلام کو اَقوامِ عالم پر فضیلت دی ہے، اِرشادِ ربانی ہے (البقرۃ:۱۴۳): ﴿وکذلک جعلناکم امۃً وسطاً لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیداً﴾ (اور ایسے ہی ہم نے تمھیں ایک اِعتدال پسند قوم بنایا ہے، تا کہ تم لوگوں پر گواہ بن سکو، اور تمھارے گواہ رسول بنیں)۔

کسی بھی معاملہ میں شہادت دینے اور گواہ بننے کے لیے جس طرح صداقت ودیانت اور صلاح وتقویٰ ضروری ہے، اِسی طرح گواہوں کا غیر جانبدار ہونا اور اِفراط وتفریط کی بے اِعتدالیوں سے محفوظ ہونا بھی شرط ہے، ورنہ گواہی معتبر نہیں رہ جاتی۔

مذکورہ آیت میں گذشتہ انبیائے کرام علیہم الصلاۃ والسلام کے سلسلہ میں یہود کی تقصیرات اور کوتاہیاں اور نصاریٰ کے اِفراط اور غلو کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے مسلمانوں کو یہ ہدایت اور تعلیم ہے کہ تمہارے اندر یہ بے اِعتدالی نہیں ہونی چاہیے۔

ابوداود شریف (۲:۶۵۹) کی ایک روایت میں ہے: ''الاقتصاد جزء من النبوۃ'' (میانہ روی: نبیوں کی شان ہے)، بخاری (۲:۹۵۷) ومسلم (۲:۳۷۷) کی ایک روایت میں ہے: ''سددوا وقاربوا، واعلموا أنہ لن یُدخِل أحدَکم عملُہ الجنۃَ'' کہ ہر عمل میں سداد (اور اعتدال) اِختیار کرو، اور (جذبات میں بھی) قریب ہی قریب رہو (حدود سے تجاوز مت اختیار کرو)، اور یہ بات ہمیشہ ذہن میں رکھو کہ تم میں سے کسی کا عمل اُس کو جنت میں نہیں لے جائے گا (بلکہ اُس کی نیت، کوشش اور تلاشِ حق کے جذبہ کے مطابق اللہ کا فضل ہوگا، وہی اُس کو جنت میں لے جائے گا، لہٰذا زیادہ جذباتی ہونے سے کوئی فائدہ نہیں)۔

بخاری شریف (۲:۷ ۹۵) کی ایک اور حدیث میں ہے: ''القصدَ القصدَ تبلغوا'' اعتدال اور میانہ رَوی رکھو، منزل پر پہنچ جاؤ گے۔

حتیٰ کہ اِسلام میں تو کسی کے ساتھ دوستی کرنے اور تعلقات رکھنے میں بھی، اور کسی سے اختلاف کرنے اور دشمنی رکھنے میں بھی ''اِعتدال پسندی'' کی تعلیم دی گئی ہے، اِرشادِ خداوندی ہے (المائدۃ: ۸): ﴿**یا أیها الذین آمنوا کونوا قوامین لله، شهداء بالقسط، ولا یجرمنکم شنآن قوم علیٰ أن لا تعدلوا، اعدلوا هو أقرب للتقویٰ**﴾ (اِیمان والو! تم ایسے ہوجاؤ کہ اللہ کے لیے حقوق کو پوری طرح سے ادا کرو، اور اِنصاف پسند گواہ بنو، اور کسی قوم سے دشمنی تمھیں اِس پر نہ آمادہ کردے کہ تم اُس کے ساتھ نا انصافی کرنے لگو، تم تو عدل وانصاف ہی کرو، یہی تقوی کے زیادہ مناسب ہے)۔

ترمذی (۱۹۲۰) کی ایک روایت میں ہے: ''أحبب حبیبك هوناً ما، عسی أن یکون بغیضك یوماً ما، وأبغض بغیضك هوناً ما، عسی أن یکون حبیبك یوماً ما'' کہ اپنے دوست سے دوستی بھی حد کے اندر رکھو (کوئی راز وغیرہ اُس کو نہ بتاؤ)، ہوسکتا ہے کہ کسی دن وہ تمھارا دِشمن ہوجائے (پھر تم کو نقصان پہنچادے)، اور ایسے ہی اپنے دشمن سے دشمنی بھی حد کے اندر رکھو (کہ کہیں بعد میں دوستی ہوجائے تو اپنے گذشتہ رویہ پر شرمندگی ہو)۔

اور دشمنی کا اِعتدال: ﴿**جزاء سیئة سیئة مثلها**﴾ (الشوری: ۴۰)، اور ﴿**فمن اعتدی علیکم فاعتدوا علیه بمثل ما اعتدی علیکم**﴾ (البقرۃ: ۱۹۴) میں بیان کیا گیا ہے، کہ اپنی طرف سے کوئی زیادتی مت کرو، اور اگر دوسرے کی طرف سے زیادتی ہو تو ظلم کے بقدر بدلہ لے لو، اس سے زیادہ نہیں، کہ جذبات میں آکر اینٹ کا جواب پتھر سے دینے لگے، یا کسی کے جرم کا بدلہ کسی اور سے لینے لگے۔

اعتدال کی پہچان:

''اعتدال'' کی ایک پہچان یہ بیان کی گئی ہے کہ اِفراط وتفریط کے دونوں کنارے اُس سے شاکی رہتے ہیں، اور صاحبِ ''اِعتدال'' کی شان یہ ہے کہ وہ دونوں غیر معتدل کناروں سے ہوشیار رہتے ہوئے، اور اُن کی بے اِعتدالیوں سے خود کو بچاتے ہوئے ''راہِ مستقیم'' پر گامزن رہتا ہے، جس کی ہدایت قرآنِ کریم میں اِن الفاظ میں دی گئی ہے (الأنعام:۱۵۳): ﴿وأن هذا صراطي مستقيماً فاتبعوه، ولا تتبعوا السبل فتفرق بكم عن سبيله﴾ (اور بے شک میرا یہ راستہ ہی سیدھا راستہ ہے، لہٰذا تم اُسی کا اتباع کرو، اور اِدھر اُدھر کے راستوں پر مت چلو کہ وہ تم کو صراطِ مستقیم سے بھٹکا دیں گے)، اور (المائدة:۱۰۵) ﴿يا أيها الذين آمنوا عليكم أنفسكم، لا يضركم من ضل إذا اهتديتم﴾ (ایمان والو! تم اصل اپنی (اِصلاحِ عقائد وتصحیحِ اَعمال کی) فکر کرو، اگر تم راہ پر ہو تو دوسروں کی گم راہی تمھارے لیے مضر نہ ہوگی)۔

غلو کی مذمت:

جس طرح ''اِعتدال'' شریعت میں انتہائی پسندیدہ وصف ہے، اِسی طرح بے اِعتدالی اور غلو سخت ناپسندیدہ صفت ہے، اِرشادِ ربانی ہے: (الأنعام: ۱۴۱) ﴿ولا تسرفوا، إن الله لا يحب المسرفين﴾ (حد سے زیادہ خرچ مت کرو، اللہ تعالیٰ اِسراف کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتے)، ایک جگہ اِرشاد ہے: (الإسراء: ۲۶، ۲۷): ﴿ولا تبذر تبذيراً، إن المبذرين كانوا إخوان الشياطين﴾ کہ بے موقع خرچ مت کرو، کیوں کہ بے محل خرچ کرنے والے شیطان صفت ہوتے ہیں (جیسے وہ اپنی صلاحیتوں کو غلط جگہ صرف کر رہا ہے ایسے ہی یہ اپنا مال غلط جگہ ضائع کر رہا ہے)۔

''اِسراف'' کہتے ہیں: ضرورت کی جگہ پر ضرورت سے زائد خرچ کرنے کو، اور ''تبذیر'' کہتے ہیں: بے ضرورت اور بے محل خرچ کرنے کو۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمیٔ جمرات کے موقع پر چھوٹی کنکریاں منتخب فرمائیں، اور اِرشاد فرمایا کہ ایسی ہی کنکریاں مارا کرو، اور جذبات میں آ کر غلو میں مت پڑ جانا، کیوں کہ پہلی اُمتیں اِسی قسم کی بے اِعتدالیوں سے ہلاک ہوئی ہیں، نسائی (۲:۴۰) کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: ''إیاکم والغلو في الدین، فإنما هلك من کان قبلکم بالغلو في الدین'' (خود کو دین میں بے اعتدالی سے بچاؤ، کیوں کہ تم سے پہلی امتیں اسی غلو فی الدین کی وجہ سے برباد ہوئیں)۔

ترمذی شریف (۲:۱ ۷) کی ایک حدیث میں ہے: ''إن لکل شيء شرةً، ولکل شرة فترةً، فإنْ صاحبُها سدد وقارب فارجوه، وإن أشیر إلیه بالأصابع فلا تعدوه'' کہ ہر چیز میں ایک وقت اُٹھان کا ہوتا ہے، اور ہر اُٹھان میں ایک زمانہ اِنحطاط کا آتا ہے، پس اگر اُٹھان کے زمانہ میں وہ اعتدال پر باقی رہے، اور حدود کے آس پاس ہی رہے، جب تو اُس سے (خیر اور کامیابی کی) امید رکھو، اور اگر (وہ اتنا آگے چلا جائے اور اتنا نمایاں ہو جائے کہ) اُس کی طرف انگلیوں سے اشارہ کیا جانے لگے تو ایسے شخص کو کامیاب مت سمجھو (اِلا ماشاء اللہ)۔

مسند احمد (۲:۱۵۸) کی ایک روایت میں اِس طرح ہے: ''إن لکل عابد شرةً، ولکل شرة فترةً: فإما إلی سنة، وإما إلی بدعة، فمن کانت فترته إلی سنة فقد اهتدی، ومن کانت فترته إلی غیر ذلك فقد هلك'' کہ ہر عابد کا ایک زمانہ نشاط اور انبساط کا ہوتا ہے، اور اُس کے بعد ایک وقت قبض اور سستی کا آتا ہے، پھر یہ سستی کبھی تو سنت و شریعت کی حدود میں رہتی ہے، اور کبھی بدعت (اور گناہوں) تک پہنچ جاتی ہے، لہٰذا جس کی سستی سنت کی حدود میں رہے وہ تو ہدایت پر ہے، اور جس کا فتور سنت کے راستے سے ہٹ جائے وہ ہلاک ہو گیا۔

بے اِعتدالی سے روکتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر یہ اِرشاد

بھی فرمایا (بخاری ۱:۱۷۸، ومسلم ۱:۲٦٦): "يا أيها الناس، خذوا من الأعمال ما تطيقون، فإن الله لا يمل حتى تملوا، وإن أحب الأعمال إلى الله: ما دام؛ وإن قل" (لوگو! اتنے ہی معمولات بناؤ جن کو ہمیشہ نبھاسکو، کیوں کہ اللہ تعالیٰ تو ثواب دینے سے اُکتائیں گے نہیں، ہاں (اگر تحمل سے زیادہ کا تم نے معمول بنالیا) تو تم ہی اُکتانے لگو گے، بے شک اللہ کو زیادہ محبوب وہ عمل ہے جو دائمی ہو، چاہے تھوڑا ہی کیوں نہ ہو)۔

اِعتدال ہی کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ شریعت کے کسی ایک کام میں لگ کر، دوسرے کاموں اور حقوق سے صرفِ نظر نہ کرلیا جائے، بلکہ ہر صاحبِ حق کو اُس کا حق ادا کیا جائے، حدیث میں بعض صحابہ کو اِسی کی تاکید اور ہدایت کرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا (ابوداود ۱:۱۹۴): "إن لأهلك عليك حقاً، وإن لضيفك عليك حقاً، وإن لنفسك عليك حقاً" (تمھارے اوپر تمھارے گھر والوں کا بھی حق ہے، تمھارے مہمانوں کا بھی حق ہے، اور تمھاری جان کا بھی حق ہے)، اسی طرح کا مضمون بخاری (۱۹۷۵) ومسلم (۱۱۵۹) میں بھی ہے، جس میں: "بیوی، بچوں اور جسم" کے حقوق کا (بھی) ذکر ہے۔

اِعتدال کا مدار:

اگر غور کیا جائے تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ شریعت میں مطلوب اِعتدال کا حصول: بحیثیتِ مجموعی چھ چیزوں کی دُرستگی اور سلامتی پر موقوف ہے: علم، فہم، فکر، ذوق، عمل اور نیت، مگر اپنے ظاہر وباطن کو پورے طور پر شریعت کا پابند بنادینے، اور ہر حال میں شریعت کی پوری پوری تابعداری کرنے، اور سنت کا پورا پورا اِہتمام کرنے سے، یہ کمال خود بخود حاصل ہوجاتا ہے۔

اِسی لیے بزرگوں کا قول ہے: "اچھے برے تمام حالات میں جذبات کو عقل کے تابع رکھے، اور عقل کو شریعت کے تابع"، ایک بزرگ فرماتے ہیں: "تمام فتنوں کی جڑ

ہے: اپنی رائے کو شریعت پر مقدم کرنا، اور اپنے جذبات کو عقل پر ترجیح دینا''۔

لہٰذا جس وقت شریعت کا جو حکم ہو اُس کو پورا کر دینا، دِین کا جو تقاضا سامنے آئے اُس پر عمل کر لینا، یا جس وقت کوئی جذبہ اُبھرے، یا طبیعت کسی طرف مائل ہو، فوراً عقل کی روشنی میں اُس کے نفع ونقصان پر غور کرنا، پھر عقل کے فیصلہ کو شریعت کی عدالت میں پیش کر کے، اُس کے کیے ہوئے فیصلہ کو آخری فیصلہ ماننا، اور اُسی پر خود کو راضی کر لینا، یہی شریعت میں مطلوب ''اِعتدال پسندی'' ہے، جیسا کہ اِرشادِ ربانی ہے: (النساء: ٦٥):

﴿فلا وربک لا یؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا في أنفسھم حرجاً مما قضیت ویسلموا تسلیماً﴾ (آپ کے رب کی قسم! یہ لوگ اِیمان والے نہیں ہو سکتے جب تک اپنے آپسی اختلافات میں آپ کو (اور آپ کی لائی ہوئی شریعت کو) حَکَم اور فیصل نہ بنائیں، اور پھر آپ کے کیے ہوئے فیصلہ سے دِل پر کوئی بوجھ بھی نہ محسوس کریں، بلکہ پوری طرح اُس کو تسلیم کر لیں)۔

اِعتدال کا نمونہ:

چونکہ ہر آدمی اپنے علم وفہم، فکر وذوق، اور عمل ونیت کے معتدل ہونے کا دعویدار ہو سکتا تھا، اِس لیے شریعت نے اس کا ایک معیار اور نمونہ مقرر کر دیا ہے کہ جو اُس مطلوبہ راستہ پر چلے گا وہی ''اِعتدال پسند'' اور ''صراطِ مستقیم'' کا راہ رو مانا جائے گا، اِسی لیے جہاں ''صراطِ مستقیم'' کی اہمیت کے پیشِ نظر، مسلمانوں کے لیے ہر نماز میں اِس کی دعا کا مانگنا لازم قرار دیا گیا ہے: ﴿اھدنا الصراط المستقیم﴾، وہیں فوراً ہی ''صراطِ مستقیم'' کا مصداق بھی بتا دیا گیا ہے: ﴿صراط الذین أنعمت علیھم، غیر المغضوب علیھم ولا الضالین﴾ کہ اے اللہ! ہمیں سیدھا راستہ چلا دیجیے، اُن لوگوں کا راستہ جن پر آپ نے اِنعام فرمایا، جو (یہود کی طرح) آپ کے مغضوب نہیں ہیں، اور نہ ہی (نصاریٰ کی طرح) بے راہ۔

پھر اِن ''منعَم علیهم '' کی مزید وضاحت کرتے ہوئے ایک دوسری جگہ یہ اِرشاد بھی آ گیا (النساء:٦٩): ﴿ومن يطع الله والرسول فاولئک مع الذين أنعم الله عليهم من النبيين والصديقين والشهداء والصالحين﴾ (اور جو لوگ اللہ اور اُس کے رسول کی اِطاعت کریں گے وہ (آخرت میں) اُن حضرات کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے اِنعام فرمایا ہے، یعنی: اَنبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کے ساتھ)۔

لہٰذا شریعت کی نظر میں وہی ''راہِ اِعتدال''، اور ''صراطِ مستقیم'' مطلوب ہے جس کا نمونہ سلفِ صالحین: صحابہؓ، تابعینؒ اور تبعِ تابعینؒ کے یہاں پایا جاتا ہو، یا شرعی دلائل کی روشنی میں حضراتِ فقہاء نے اُس کو لکھا ہو، جس کا عام فہم عنوان: ''سنت وشریعت'' ہے، کہ اپنے تمام امور میں ''سنت وشریعت'' کو اپنا رہنما اور اُسوہ بنالیا جائے، اور اِس کا اِہتمام کیا جائے کہ ظاہری اور باطنی کوئی کام حتی الامکان خلافِ سنت نہ ہونے پائے۔

اعتدال پیدا کرنے کا طریقہ:

مذکورہ بالا تفصیلات سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ کسی بھی مسئلہ میں اِعتدال پیدا کرنے کے لیے سب سے پہلے اُس مسئلہ کے تمام پہلوؤں سے واقفیت ضروری ہے، ورنہ درمیانی راستہ کا علم ہوئے بغیر کیسے اُس پر چلا اور جما جاسکتا ہے، اور اِفراط وتفریط کی دونوں انتہاؤں کو جانے بغیر، کیسے اُن سے بچا جاسکتا ہے؟ اِس لیے مسلمانوں کو اپنے اندر دِینی اِعتدال پیدا کرنے کے لیے سب سے بنیادی اور ضروری چیز صحیح اور مستند علم کا حاصل کرنا ہے۔

اور اِس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ جب جس شخص سے جو دِینی فریضہ یا دُنیوی ذمہ داری متعلق ہو، وہ اگر لیاقت واہلیت ہو تو از خود، ورنہ کسی معتبر عالمِ دین سے اُس سے

متعلق شرعی مسائل معلوم کرلے، مثلاً توحید ورسالت وغیرہ عقائد، نماز روزہ وغیرہ عبادتیں اور ظاہری وباطنی اخلاق تو ہر مسلمان سے ہمہ وقت متعلق ہیں، اِس لیے اُن کے موٹے موٹے مسائل کا سیکھنا تو ہر مسلمان پر فرض ہے ہی، اِسی طرح رشتہ داروں اور پڑوسیوں کے حقوق معلوم کرلے، مال ہوتو زکوۃ کے مسائل سیکھ لے، حج کی تفصیلات معلوم کرلے، تجارت کا اِرادہ کرے تو خرید وفروخت اور معاملات کے مسائل سیکھ لے، نکاح کا اِرادہ کرے تو زوجیت کے حقوق معلوم کرلے، باپ (یاماں) بنے تو اولاد کے حقوق اور اُن کی تربیت کی ذمہ داریاں پتہ کرلے، کسی علاقہ یا اِدارہ کا ذمہ دار، یا ملازم بن رہا ہے، تو حاکم ورعیت کے حقوق سمجھ لے، استاذ وطالب علم اساتذہ وشاگردوں کے حقوق متحضر کرلیں۔

غرضیکہ ہرموقع اور ہر مرحلہ کے مسائل اوراحکام کی طرف توجہ کرکے اُن کواچھی طرح سیکھ لے، سمجھ لے، اور پھر بقدرِ استطاعت اپنے آپ کو اُسی کا پابند بنالے، تو یہی شریعت کی نظر میں ''اِعتدال'' کہلائے گا۔

لیکن یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ عملی اعتدال اور استقامت پیدا کرنے کے لیے نِرا ''علم'' کافی نہیں ہوتا، جب تک ''عمل'' کا بھرپور جذبہ بھی نہ ہو، اور یہ چیز پیدا ہوتی ہے دِل کے اندر اِیمان واِیقان، اللہ کا خوف وخشیت، اُس کے وعدوں پر یقین، اُس کی وعیدوں سے ڈر، اُس کی اور اُس کے رسول کی محبت پیدا کرنے سے، آخرت کی فکر، اور جنت دوزخ کا تصور کرنے سے ......

تعلیماتِ دین اور اُن کا اعتدال:

یہ بات اہلِ اِسلام کے لیے انتہائی شکر وسعادت کی ہے کہ مذہبِ اسلام ایک مکمل اور جامع دین ہے، جو اِنسان کے ہر مرحلۂ حیات کے لیے ایک دستور، اور ہر شعبۂ زندگی کے لیے ایک لائحۂ عمل رکھتا ہے، جو مذہب وعبادت سے لے کر، معاملات

وسیاست تک؛ اِنسانی زندگی کے تمام شعبوں میں دخیل ہے۔

یہ بات پہلے عرض کی جاچکی ہے کہ اگر اِسلام کے مجموعی اُحکام کو چند جلی عنوانات کے تحت تقسیم کیا جائے تو اِجمالی طور پر چھ شعبے بنتے ہیں: عقائد، عبادات، اَخلاق، معاملات، معاشرت، سیاست، اِن میں سے ہر موضوع سے متعلق واضح اِسلامی تعلیمات وہدایات موجود ہیں، ہم یہاں اُن کے بنیادی نقاط کو سامنے رکھتے ہوئے ''تعلیماتِ دین'' کے خصوصی امتیاز اور اعتدال کی طرف اِشارہ کرتے ہیں، وما توفيقي إلا بالله:

(۱) عقائد میں اِعتدال کا خلاصہ ہے: توحید، رسالت، آخرت، تقدیر، فرشتوں، اللہ کی نشانیوں (بیّنات ومعجزات)، اور اُس کی کتابوں کو دِل سے حق ماننا، اور زبان سے اُن کا اِقرار کرنا، اور اللہ کے پسندیدہ راستہ کے علاوہ تمام راستوں کو غلط سمجھنا۔

اور پسندیدگی کا معیار: علمی اعتبار سے کتاب وسنت کو سمجھنا، اور عملی لحاظ سے: ''ما أنا عليه وأصحابي '' کو ماننا (یعنی: آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت اقوال واعمال اور تعلیمات وہدایات کا وہ تصوُّر جو صحابہؓ کے طرزِ عمل سے متعیَّن ہوا؛ اُس کو دینی اُسوہ اور عملی نمونہ تسلیم کرنا)۔

(۲) عبادات کا اِعتدال ہے: ہر کام کو اِخلاصِ نیت کے ساتھ، سنت کے مطابق کرنا، فرائض وواجبات کو لازم سمجھنا اور بغیر کسی کوتاہی کے ادا کرنا، سنن ومستحبات کا حتی الامکان اہتمام کرنا، (شرک وبدعت اور) ایسے حرام کاموں سے بچنا جو عبادت کی مقبولیت سے مانع بن جاتے ہیں۔

''شرک'' کا مطلب ہے: اللہ تعالیٰ کی ذات یا صفات میں کسی اور کو شریک ماننا، کسی اور کو لائقِ عبادت اور پرستش سمجھنا، یا اُس کے کسی اِرادہ اور فیصلہ میں کسی کو مؤثر خیال کرنا، یا اُس کے علاوہ کسی اور سے بھی نفع ونقصان کی امید رکھنا، یا کسی عمل کے کرنے یا نہ

کرنے میں غیر اللہ پر نظر رکھنا۔

''بدعت'' کا مطلب ہے: امیدِ ثواب کے ساتھ کوئی ایسا کام کرنا جس کی اَصل ہی شریعت میں نہ ہو، یا شرعاً اُس کا جو درجہ ہو اُس سے اُس کو بڑھا دینا، یا کسی غیر موَقّت امر کو از خود کسی وقت سے مقیَّد کر دینا، اور اُس کو شریعت کا حصہ سمجھنا، یا کسی عام کو خاص، یا مطلق کو مقید، یا اِس کے برعکس صورت کر دینا۔

(۳) اَخلاق کے دو حصے ہیں: ظاہری اور باطنی، پھر دونوں کے دو دو پہلو ہیں: مثبت اور منفی، منفی اَخلاق میں سے بعض صرف خلافِ شرافت و مروّت ہوتے ہیں، اور بعض موجب فسق و گناہ بھی ہوتے ہیں۔

الف: وہ اَخلاقِ ظاہری جو مثبت پہلو سے متعلق ہیں اُن میں سے چند یہ ہیں:

ادب و تعظیم، شفقت و ترحُّم، صلہ رحمی و سخاوت، اِحسان و سلوک، وقار و متانت، عدل و اِنصاف، جراُت و شجاعت، غیرت و حمیت، غیظِ حق، حق گوئی و بے باکی، بشاشت و تازگی، شرم و حیا، عفت و پاکدامنی، اِستقلال و اِستقامت، صدق و سچائی، امانت و دیانت، وفائے عہد، صبر و قناعت، زہد و استغنا، بے تکلفی و سادگی اور کفایت شعاری، وغیرہ۔

ب: وہ اَخلاقِ ظاہری جو منفی پہلو سے متعلق ہیں اُن میں سے چند یہ ہیں:

شرک و بدعت، ظلم و زیادتی، مَنّ و اِیذاء، بے اِعتدالی و نا اِنصافی، تعصُّب و اِنکارِ حق، چوری و ڈاکہ زنی، بدنظری و بدکاری، بے شرمی و بے حیائی، بے غیرتی و بے حسی، قتل و غارت گری، قطع رحمی، جھوٹ و چغلی، غیبت و بہتان، بدگوئی و دشنام طرازی، غضب و غصہ، اِسراف و تبذیر، بخل و اِمساک، وغیرہ۔

ج: وہ اَخلاقِ باطنی جو مثبت پہلو سے متعلق ہیں اُن میں سے چند یہ ہیں:

اِیمان و یقین، توکل و تفویض، خلوص و للّٰہیت، خشوع و خضوع، خوف و خشیت، تواضع و عبدیَّت، تشکُّر و اِمتنان، حبّ فی اللہ، بغض فی اللہ، حلم و مروَّت، وغیرہ۔

د: وہ اَخلاقِ باطنی جو منفی پہلو سے متعلق ہیں اُن میں سے چند یہ ہیں:
رِیا وسُمعہ، نفاق وتملُّق، تکلُّف وبناوٹ، عُجب وخود پسندی، کِبر وتعلّی، تذلل وکمینگی، بغض وعناد، حسد وجلن، حرص وہوس، طمع ولالچ، بدظنی وبدگمانی، غفلت ولاپرواہی، جُبن وبزدلی، سستی وکسل مندی، حماقت وبے وقوفی، وغیرہ۔

ان اَخلاق کا اِعتدال ہے: ظاہری وباطنی ہر دواعتبار سے اپنے اندر مثبت خِصال وعادات (اوصافِ حمیدہ) پیدا کرنے کی کوشش کرنا، علمی اِصطلاح میں ''تحلیہ'' اِسی کا نام ہے، اور ظاہری وباطنی دونوں حیثیتوں سے منفی عادتوں اور کاموں (اَخلاقِ رذیلہ) سے اجتناب واحتراز کرنا، شرعی اِصطلاح میں اِسی کو ''تزکیہ'' کہا جاتا ہے۔

حسن اَخلاق کی بھی شریعت میں بڑی اہمیت وارِد ہوئی ہے، موطأ مالک کی روایت ہے: (۳۳۵۷) ''بعثت لأتمم حسن الأخلاق'' (مجھے حُسن اَخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث فرمایا گیا ہے)، بخاری (۳۸۶۱) ومسلم (۲۴۷۴) کی روایت ہے، حضرت ابوذر غفاریؓ نے ابتدائے اِسلام میں جب اپنے بھائی اُنیس کو مکہ مکرمہ حالات کی تحقیق کے لیے بھیجا تھا، تو انھوں نے واپس آکر اِطلاع دی تھی: ''رأیتہ یأمر بمکارم الأخلاق'' (میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکارمِ اَخلاق کی تعلیم کرتے ہوئے دیکھا)، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے (بخاری: ۳۵۵۹ ومسلم: ۲۱۲۳): ''إنَّ مِن أحبکم إليَّ: أحسنکم أخلاقاً'' (تم میں سے میرے نزدیک زیادہ محبوب وہ ہے جس کے اَخلاق زیادہ اچھے ہوں)۔

اِس لیے مسلمانوں کو اچھے اخلاق سیکھنا اور اپنے اندر اُن کو پیدا کرنا، پھر ہر موقع کے مناسب اُن کو اِستعمال کرنا یہ بہت بڑی دینی ذمہ داری ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو ''اِسلام'' کی دعوت بعد میں دی ہے، اُس سے بہت پہلے ہی سے مکہ کے لوگ آپ کے کریمانہ اور شریفانہ اَخلاق سے متاثر تھے، ظلم وزیادتی کے خلاف قریش کے بعض امن

پسند لوگوں کی طرف سے بنائی جانی والی اِصلاحِ معاشرہ تنظیم ''حِلف الفضول'' کے آپ اہم رکن تھے، خانۂ کعبہ میں حجرِ اسود کے نصب کے سلسلہ میں قریش میں جو اختلاف ہوا تھا وہ آپ ہی کی حسنِ تدبیر سے حل ہوا تھا، آپ اہلِ مکہ کے یہاں ''امین'' کے لقب سے مشہور تھے۔

جب آپ کو نبوت سے سرفراز کیا گیا اور آپ کی طبیعت اِس بارِ گراں سے متأثر ہوئی، تو حضرتِ خدیجہؓ نے آپ کو تسلّی دیتے ہوئے عرض کیا تھا (بخاری: ۳،۴۵۷۲، ومسلم: ۲۳۱): ''واللّٰه ما يُخزيك اللّٰه أبداً، إنك لَتَصِل الرَّحِمَ، وتَصدُق الحديثَ، وتَحمِل الكَلَّ، وتَكسِب المعدومَ، وتَقري الضيفَ، وتعين على نوائب الحق'' (خدا کی قسم! اللہ آپ کو کبھی رسوا نہیں کرے گا، اِس لیے کہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، سچ بولتے ہیں، دوسروں کا بوجھ اُٹھا دیتے ہیں، محتاجوں کی فکر کرتے ہیں، مہمانوں کی خاطر داری فرماتے ہیں، اور نیک کاموں میں تعاون فرماتے ہیں)۔

نجاشی کے دربار میں حضرتِ جعفر طیارؓ نے جو تقریر کی تھی اُس میں یہ بھی فرمایا تھا (مسند احمد ۴: ۱۷۳): ''أيها الملك! كنا قوماً أهل جاهلية: نعبد الأصنام، ونأكل الميتة، ونأتي الفواحش، ونقطع الأرحام، ونسيء الجوار، يأكل القوي منا الضعيف، فكنا على ذلك حتى بعث اللّٰه إلينا رسولاً منا؛ نعرف نسبه وصدقه وأمانته وعفافه، فدعانا إلى اللّٰه لنوحده ونعبده ونخلع ما كنا نعبد نحن وآباؤنا من دونه من الحجارة والأوثان، وأمرنا بصدق الحديث، وأداء الأمانة، وصلة الرحم، وحسن الجوار، والكف عن المحارم والدماء، ونهانا عن الفواحش، وقول الزور، وأكل مال اليتيم، وقذف المحصنة...''

بادشاہ سلامت! ہم لوگ گنوار اور اَن پڑھ لوگ تھے: بتوں کی پوجا کرتے تھے، مردار کھاتے تھے، بے حیائی کے کام کیا کرتے تھے، رشتے ناطے کا خیال نہیں رکھتے تھے،

پڑوسیوں سے بدسلوکی کرتے تھے، ہم میں سے طاقتور کمزور کا حق دبا لیا کرتا تھا، ہم لوگ ایسے ہی بداخلاقیوں میں مبتلا تھے کہ اللہ نے ہمارے درمیان ایک ایسا رسول بھیجا جس کا نسب، جس کی سچائی، جس کی امانت اور عفت و پاک دامنی ہمارے درمیان معروف ومشہور تھی، اُس نے ہمیں اِس بات کی دعوت دی کہ ہم اللہ کی توحید کا اقرار کریں، اُسی کی عبادت کریں، اور جن بتوں اور پتھروں کو ہم، یا ہمارے باپ دادا پوجا کرتے تھے، اُن کی پرستش چھوڑ دیں، اور اُس نے ہمیں حکم دیا کہ ہم سچ بولا کریں، امانت ادا کیا کریں، رشتے ناطے جوڑا کریں، پڑوسیوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا کریں، حرام کاموں اور ناحق خون بہانے سے باز آجائیں، برے کاموں، بری باتوں سے الگ ہوجائیں، یتیموں کا مال کھانے اور پاک دامن عورتوں کو تہمتیں لگانے سے توبہ کرلیں ....

(۴) معاملات کا اِعتدال ہے: ہر قدم پر حلال وحرام کا فرق ملحوظ رکھنا، سود، جوا، دھوکہ اور رشوت سے بچنا، کسی کی طیبِ خاطر کے بغیر اُس کی کوئی چیز (مال، نسبت اور عہدہ وغیرہ) اِستعمال نہ کرنا، اور معاملہ کے اندر ایسے اِبہام وجہالت سے احتراز کرنا جس کے نتیجہ میں نزاع اور اِختلاف کی نوبت آسکتی ہو۔

(۵) معاشرت کے دو پہلو ہیں: ایک کا تعلق اِنسان کے ذاتی رہن سہن، صورت شکل اور وضع قطع وغیرہ سے ہے، اِس کا اِعتدال یہ ہے کہ ایسا طرزِ زندگی اپنایا جائے جس میں اِسلامی تشخص واِمتیاز نمایاں ہو، اور غیروں سے مرعوبیت کی بنا پر اُن کی نقالی اور تشبُّہ نہ پایا جائے۔

اور دوسرے پہلو کا تعلق دوسروں کے ساتھ تعلقات اور حقوق سے ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ شریعت نے جس کا جو حق اور ذمہ داری متعلق کی ہے وہ ادا کی جائے، جس کے ساتھ تعلق کی جو حد بتائی ہے اُس سے وہ تعلق رکھا جائے، اور کسی کو ''بے وجہ'' اپنی ذات سے تکلیف نہ پہنچنے دی جائے۔

والدین کی خدمت، مہمانوں کی ضیافت، بیماروں کی عیادت، جنازوں میں شرکت اور یتیموں، بیواؤں، مسکینوں محتاجوں اور مسافروں کی مدد وغیرہ اُمور، اَہم اِسلامی حقوق میں سے ہیں، بیوی بچوں اور دیگر رشتہ داروں اور عام مسلمانوں اور ہم سایوں کے حقوق کی بھی اِسلام میں بڑی اہمیت ہے۔

(٦) سیاست کے معنی ہیں: تدبیر وانتظام، اُس کی دو قسمیں ہیں: تدبیرِ منزل (گھریلو اِنتظام)، سیاستِ مَدَنیہ (شہری اور ملکی انتظام)۔

دونوں کا مشترکہ اِعتدال ہے: کہ سب سے پہلے اپنا زاویۂ خیال درست کیا جائے کہ دُنیا مؤمن کا ''وطنِ اصلی'' نہیں ہے، عارضی ہے، لہٰذا اِس کے اِنتظام اور تدبیر میں اِس طرح منہمک نہ ہو کہ اصل مقصد (عقائد وعبادات) میں کوتاہی ہونے لگے، اِس لیے اِسراف (ضرورت سے زائد خرچ) وتبذیر (بے موقع خرچ) سے بچتے ہوئے بقدر گذر بسر خرچ کرنا تو فرض سمجھا جائے، پھر آرام وآسائش کی حد تک خوشی سے خرچ کیا جائے، اور زیبائش وآرائش کے لیے خرچ کرنا بس گوارا کرلیا جائے، جب کہ نمائش (یعنی دکھاوا اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے) کے لیے خرچ کرنا: ناجائز اور حرام سمجھا جائے۔

دوسرے نمبر پر یہ عقیدہ درست کیا جائے کہ کوئی بھی تدبیر بذاتِ خود مفید اور مؤثر نہیں ہوتی، جب تک اللہ تعالیٰ کی مشیت اور حکم شاملِ حال نہ ہو۔

تیسرے نمبر پر ایک مسلمان اور دیندار کے لیے کسی بھی تدبیر کے اختیار کرتے وقت دیکھنے کی اہم چیز: جواز اور حِلّت بھی ہوتی ہے، اگر وہ جائز ہے جب تو اُس کے اختیار کرنے نہ کرنے پر غور اور بحث کا موقع آتا ہے، ورنہ اگر وہ شریعت کے خلاف ہے تو پھر اُس کی کوئی گنجائش نہیں۔

اِلاَّ یہ کہ اضطراری صورت ہو، اور اضطرار: شریعت میں اُس حالت کو کہتے ہیں

جس میں اِنسان کے اِیمان، جان، آبرو، یا معتد بہ مال کو واقعی خطرہ لاحق ہو جائے، واضح رہے کہ نفع نہ ہونا، یا نفع میں کمی ہو جانا اور چیز ہے، اور موجود چیز کے ضائع ہو جانے کا یقینی اندیشہ ہو جانا اور چیز ہے۔

اور خاص سیاستِ مَدَنیہ کا اِعتدال ہے: اِسلام کے حکومت و سلطنت سے متعلق اَحکام کو پیشِ نظر رکھنا، حُکّام کے لیے رعایا کے حقوق، اور رعایا کے لیے حُکّام کے حقوق کو سمجھنا، اگر اِسلامی حکومت ہے تو سمع وطاعت وغیرہ کے اَحکام پر چلنا، اور ذِمیوں اور امن لے کر رہنے والوں کے حقوق کا خیال رکھنا۔

اور اگر غیر اِسلامی حکومت ہے تو اپنے عقائد و شعائر، اور ''پرسنل لا'' کی حفاظت کے اِہتمام کے ساتھ ساتھ، حکومتِ وقت سے کیے ہوئے معاہدوں کی پابندی کرنا، غیر مسلمین سے تعلقات کی شرعی حدود کو جاننا اور اُس کو ملحوظِ عمل رکھنا۔

سیاسی اعتبار سے مسلمانوں کا آپسی نظام اِس طرح بنایا جانا چاہیے کہ علمائے کرام مسلمانوں کو من حیث المذہب بگڑنے نہ دیں، اور زعمائے قوم مسلمانوں کو من حیث القوم مٹنے نہ دیں، اور دونوں اپنے اپنے دائرۂ حدود میں کام کریں، کیوں کہ کام ہمیشہ ربط سے ہوتا ہے، خلط سے نہیں۔

اِسی طرح مختلف دینی جماعتوں کو بھی باہم اعتماد و اِرتباط سے کام کرنا چاہیے، خدمتِ دین کے تینوں پہلوؤں (اِشاعت، حفاظت اور شوکت) کو سامنے رکھتے ہوئے، دعوت اِلی اللہ، تلاوتِ آیات، تعلیمِ کتاب وحکمت، تبلیغِ اَحکام، تزکیۂ نفوس، اَمر بالمعروف، نہی عن المنکر اور تنظیم المسلمین کی ذمہ داریوں کو محسوس کیا جانا چاہیے۔

ہر طرح کے غلو اور بے اعتدالیوں سے اِجتناب کرتے ہوئے، عقائد واَعمال کے تحفظ کا بندوبست کرتے ہوئے، حسبِ توفیق، بقدرِ حیثیت اور مذاق و مناسبت کے اعتبار سے اپنے دائرۂ کار میں، ربطِ باہمی سے دینی خدمات اَنجام دینی چاہییں۔

کتنی تسلی ہے اہل اِسلام کے لیے حدیث شریف کے اِن اَلفاظ میں ''المرء مع من أحب ''- بخاری: ۶۱۷۰، ومسلم: ۲۶۴۰- (کہ آدمی کا حشر اُن لوگوں کے ساتھ ہوگا جن سے وہ محبت کرتا ہے)، تو ایسا کیوں نہ کیا جائے کہ ''خدمتِ دین'' توحسبِ ذوق اور توفیق اَنجام دی جائے، اور محبت (وتعاون): اُصولِ صحیحہ کے مطابق دین کی خدمت کرنے والے تمام دینی خدام اور جماعتوں سے رکھی جائے۔

اللہ تعالیٰ ہم لوگوں کو محض اپنے فضل وکرم سے دِین ودنیا کے تمام شعبوں میں ''راہِ اعتدال'' پر چلنا، اور شرعی اُمور میں ''صراطِ مستقیم'' پر جمنا نصیب فرمادیں، اور ہر قسم کے شرور وفتن سے ہماری اور سارے مسلمانوں کی حفاظت فرمادیں، آمین۔

دردِ دل

یہ بات ثابت کرنے اور منوانے کی محتاج نہیں کہ ''مدارسِ دینیہ'' کے اِس مبارک سلسلہ کا سررشتہ یونان ویورپ کی درس گاہوں کے بجائے، اِسلام کے دور اول میں قائم شدہ مکہ مکرمہ کے پہلے مدرسہ ''دارِاَرقم'' سے ملتا ہے، جہاں سے حضراتِ خلفائے اربعہؓ اور دیگر سابقین اولین اصحابؓ نے نبوی تعلیم وتربیت سے آراستہ ہوکر سند کمال حاصل فرمائی، پھر حالات کی عدمِ مساعدت سے یہ مدرسہ مدینہ منورہ منتقل ہوا، جہاں ''صفہ'' نامی چبوترہ پر بیٹھ کر: دعوت الی اللہ، تلاوتِ آیات، تعلیم کتاب وحکمت، تبلیغ اَحکام اور تزکیۂ نفوس وقلوب کا وہ غلغلہ بلند ہوا کہ عرب کے بادیہ نشین، اِیران وروما سمیت وقت کی دیگر ترقی یافتہ قوموں سے لے کر، قیامت تک کی تمام اقوام وملل کے لیے اِیمان ویقین، علم وعمل، اور اخلاق وتہذیب کا مثالی نمونہ بن کر ابھرے۔

اِسلام کی نظروں میں اَب وہی ''اِیمان'' اِیمان تسلیم کیا گیا جو اِن اہل ایمان نے قبول فرمایا، وہی ''علم'' علم قرار پایا جو اِن اہل علم نے پڑھا پڑھایا، وہی ''عمل'' عمل ٹھہرا جو اِن مسلمانوں نے سیکھا سکھایا، اُنہی ''اخلاق'' کو اخلاق مانا گیا جو اِن بااخلاقوں نے اِختیار کیا، اُسی ''تہذیب'' کو تہذیب سمجھا گیا جس کی اِس مہذب جماعت نے بنیاد رکھی:

﴿والسابقون الأولون من المهاجرين والأنصار والذين اتبعوهم بإحسان رضي الله عنهم ورضوا عنه﴾ (التوبۃ: ۱۰۰) (مہاجرین وانصار میں سے جو لوگ پہلے ایمان لائے، اور جن لوگوں نے نیکی کے ساتھ اُن کی پیروی کی، اللہ اُن سے راضی ہے، اور وہ اللہ سے راضی ہیں)۔

(الحجرات:۷)﴿ولكن الله حبب إليكم الإيمان وزينه في قلوبكم، وكره إليكم الكفر والفسوق والعصيان، أولئک هم الراشدون﴾(لیکن اللہ نے تمھیں ایمان کی محبت دی، اور تمھارے قلوب کو اُس سے مزین کردیا، اور کفر، فسق اور نافرمانی سے تمھارے اندر نفرت پیدا فرمادی، یہی ہیں وہ لوگ جو راہِ راست پر ہیں)۔

قدیم طرز کے مدارسِ دینیہ کو حقیقی اور متوارث ''اِسلام'' کا قلعہ کہا جاتا ہے، اِس کا اِدراک (نادان) دوستوں سے کہیں زیادہ (دانا) دشمنوں کو ہے، لیکن افسوس یہ ہے کہ اہلِ اِسلام بالعموم، اور ہمارے اِن ''قلعوں'' کے محافظین بالخصوص؛ شدید قسم کی مرعوبیت اور اِحساس کمتری کا شکار ہوتے جارہے ہیں، جن کو رہتی دنیا تک کے لیے دوسروں کا ''قبلہ نما'' بنایا گیا تھا، وہ خود اپنی سمت کھوتے جارہے ہیں۔

آج کی دجل آمیز ہلچل میں اخلاق وتہذیب اور علم وعمل تو بعد کی چیزیں ہے، نعوذ باللہ ایمان ویقین تک کی تشریح وتعبیر بدلی جارہی ہے، ایسے میں بجائے اِس کے کہ ہماری صفوں سے ایسے لوگ آگے بڑھتے جو اپنے زورِ علم اور طاقتِ عمل سے ﴿يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِه﴾(النساء:۴۶) کے مصداق طبقات وافراد سے نبرد آزما ہوتے، اور اُن کے خلط والتباس اور دجل وتلبیس کا پردہ چاک کرتے، ہو یہ رہا ہے کہ:

۱: کچھ محافظین تو دشمن کی صفوں میں ہی شامل ہوتے جارہے ہیں!

۲: کچھ حفاظت کی ذمہ داری سے یکسو ہوکر، اپنے ذاتی مفادات اور مشاغل کو ترجیح دے رہے ہیں۔

۳: کچھ دفاع ورِباط (حدود اللہ کی حفاظت) کی اپنی طے شدہ پوزیشن اور فرضِ منصبی چھوڑ کر، دوسرے محاذوں پر لگتے جارہے ہیں۔

جس کے نتیجے میں اِسلام (اور حدود اللہ) کی حفاظت کا محاذ روز بروز کمزور پڑتا جارہا ہے، مدارس کے اندر کے ماحول میں کم ہی افراد میں اپنے مقصد کے تئیں اِحساس اور

بیداری پائی جاتی ہے، ''حفاظت''، ''اِشاعت'' اور ''شوکت'' کی الگ الگ ذمہ داریوں میں خلط عام ہے:

۱: ﴿والحافظون لحدود الله﴾ میں ''حفاظتِ حدود'' کی جس ذمہ داری کا بیان کیا گیا ہے، وہ محققین اہلِ علم کے علاوہ کوئی انجام ہی نہیں دے سکتا، ''حفاظت اِسلام'' کے منصب پر فائز لوگوں کے لیے اِس سے بڑی سعادت کیا ہوگی کہ ﴿وإنا له لحافظون﴾ کے ذریعے جس کام کا ذمہ اللہ رب العزت نے خود لیا تھا، اُس کو انجام دینے اور اس ''بارِ امانت'' کو اٹھانے کے لیے اُن نیک بختوں کا انتخاب ہوا ہے!!

۲: ''اِشاعتِ دین'' کا میدان بہت عام ہے: دعوتِ دین، تبلیغِ اَحکام، وعظ وتذکیر، درس وتقریر وغیرہ ساری خدماتِ دینیہ کو شامل ہے، پھر ان خدمات کا بھی کوئی مخصوص طریقہ متعین نہیں، محظوراتِ شرعیہ (غلط بیانی، تحریف وتلبیس، اور تصویر کشی وغیرہ) سے بچتے ہوئے، مستند دینی باتوں کو جس طرح بھی دوسروں تک پہنچایا جائے، سب ''اِشاعتِ دین'' ہی کا حصہ ہے۔

واضح رہے کہ شریعت میں ''تبلیغ'': دین کی باتیں دوسروں تک پہنچانے کو کہا جاتا ہے، خواہ وہ صرف ایک بات ہو، جیسا کہ حدیث ''بلغوا عني ولو آية'' میں فرمایا گیا، اور خواہ وہ پورے دین کی ساری باتیں ہوں، جیسا کہ قرآن کریم کی آیت ﴿بلغ ما أنزل إليك من ربك﴾ (جو کچھ تمھارے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے سب دوسروں تک پہنچاؤ) میں فرمایا گیا ہے۔

۳: ''شوکتِ دین'' یہ بالکل الگ چیز ہے، حفاظت واِشاعت کی کوششیں، ''شوکت'' سے وابستہ ضرورتیں پوری نہیں کرسکتیں۔

إعلاء كلمة الله: ''دعوت إلى الله'' کے عام مفہوم سے الگ، ایک مخصوص شرعی اِصطلاح ہے، جو کفر اور کفار کی شوکت کے توڑنے کو متضمن ہے، جیسا کہ

﴿وقاتلوهم حتى لاتكون فتنة﴾ میں اس کی طرف صاف اِشارہ، اور ﴿وكلمة الله هي العلياء﴾ کی تفسیر میں اس کی صراحت موجود ہے، اِسی لیے ''اِعلاء'' کبھی جزیہ، صلح اور قتال وغیرہ کے ذریعے بھی حاصل ہو جاتا ہے۔

بہرحال! عرض یہ کرنا ہے کہ مدارِس دینیہ کا اصل موضوع: ''حفاظتِ حدود اللہ'' ہے، لہٰذا ہماری ساری تعلیم و تربیت کا بنیادی محور اور مرکزی نقطۂ نظر یہی ہونا چاہیے، دین کی دیگر خدمات میں تعاون اور اُن کی شرعی نگرانی تو مدارس کے دائرۂ کار میں آتی ہے، مگر مدارس کے تعلیمی نظام میں خلل کو گوارا کرتے ہوئے، دوسرے کاموں میں شرکت؛ یہ بنائے مدارس کے مقاصد کے خلاف ہے۔

اے کاش! اہلِ مدارس اپنا مقصدِ وجود سمجھتے، اپنے دائرۂ کار کی تعیین کرتے، اپنی ذمہ داریاں اور فرضِ منصبی کا احساس کر پاتے، ﴿طائفة ليتفقهوا في الدين﴾ کی ''جماعتیں'' تیار کرنے پر زور صرف کرتے، ''تحريف الغالين، وانتحال المبطلين، وتأويل الجاهلين'' کی اہم ترین ذمہ داری کو پیشِ نظر رکھتے، اور مدرسوں کی چہار دیواری میں بنے ہوئے تنگ اور بند حجروں کی قدر فرماتے، تو دینی، فکری اور علمی فتنوں کے اِس سیلِ رواں پر کسی حد تک بند باندھا جا سکتا تھا۔

مگر جب پاسباں ہی بے اطمینانی کا شکار ہونے لگ جائیں، اپنے چودہ سو سالہ تعامل و توارث کے مثبت اثرات کے کھلی آنکھوں نظر آنے کے باجود، موجودہ شور و شغب سے مرعوب ہوئے جا رہے ہوں، اسلاف و اکابر کے بنائے ہوئے ''نصاب و نظام'' کے سلسلے میں گومگو میں پڑے جا رہے ہوں، لن يصلح آخر هذه الأمة إلا بما صلح به أولها کے مسلمہ اصول کے ہوتے ہوئے بھی، جدت اور تجدد پر گرے جا رہے ہوں، تو پھر چوروں اور رہزنوں کو خوف ہو تو کس کا ہو؟

میری اِن باتوں کو بیگانوں کا شکوۂ عناد سمجھ کر نظر انداز نہ فرمایا جائے، بلکہ اُس

دوست کے ''دردِ دِل'' کی آہ خیال فرمایا جائے، جو زوال کی اِس شب دیجور میں بھی، روشنی کی امید: ''مغرب'' کے سیاہ افق کے بجائے، ''مشرق'' کے سپیدۂ سحر ہی سے لگائے بیٹھا ہے، کیوں کہ یہ بات بہرحال طے پا چکی ہے کہ دنیا میں خیر اُسی وقت تک باقی رہے گا جب تک افقِ ''مشرق'' سے پھیلنے والی اِس روشنی سے ہی دنیا فیض یاب ہو، ورنہ جس دن کہ ''مغرب'' سے نمودار ہونے والی روشنی اِس دنیائے دُوں پر پوری طرح اثر انداز ہو گئی اُس دن امر نافذ ہو جائے گا، بساط لپیٹ دی جائے گی، کاروبارِ دنیا ہمیشہ کے لیے بند کر دیا جائے گا: ﴿فاعتبروا يا أولي الأبصار﴾۔

إن أريد إلا الإصلاح ما استطعت، وما توفيقي إلا بالله، عليه توكلت وإليه أنيب، وما علينا إلا البلاغ المبين، ولاحول ولاقوة إلا بالله العلي العظيم، وصلى الله تعالى على خير خلقه محمد وآله أصحابه أجمعين، وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين.

محمد معاویہ سعدی گورکھپوری
مدرسہ مظاہر علوم، سہارنپور، یوپی

عصر حاضر کا فتنۂ الحاد

از: محمد فاروق صاحب (بشکریہ ماہنامہ مظاہر علوم، سہارنپور)

اسلام کا نام لے کر اسلام کو ڈسنا، اسے تحریفی نشتر لگانا، اس پر جرح وتنقید کی مشق کرنا اور محض مفروضات سے اس کے قطعی مسائل کو پامال کرنا؛ ہر دور کے ملاحدہ وزنادقہ کا طرۂ امتیاز رہا ہے، پہلی صدی کے خوارج ہوں، یا مابعد کے باطنیہ، تیسری صدی کے اصحاب العدل والتوحید ہوں، یا دورِ حاضر کے اَرباب فکر ونظر، دوسری صدی کا ابن المقفع ہو یا چودھویں صدی کے اسلم جیراجپوری، اکبری دور کے ابوالفضل اور فیضی ہوں، یا ہمارے دور کے جاوید غامدی، ماضی قریب کے ڈاکٹر فضل الرحمٰن اور عمر احمد عثمانی ہوں یا آج کا عمار خان ناصر۔

سب کا مشترک مقصد، مشترک نقطۂ نظر اور مشترک سرمایہ: اسلام کی چاردیواری میں رخنہ اندازی کرنا ہے، ان کا خیال یہ ہے کہ اسلام کی اصل روح پہلی صدی کے وسط یا تقریباً آخر میں دفن ہو کر رہ گئی، اور اب جو مدون اسلام تیرہ یا چودہ صدیوں سے مسلمانوں کے پاس موجود ہے، یہ وہ اسلام نہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا تھا؛ بلکہ یہ اسلام مردہ کا ورثہ اور زندگی کی حرارت سے محروم جسد بے روح ہے۔ نعوذ باللہ۔

''فتنہ'' عربی زبان کا لفظ ہے، جو متعدد معانی کے لیے قرآن کریم میں بھی استعمال ہوا ہے، لیکن معروف معنی: دنگا فساد ہی ہے، اور اسی معنی میں یہ لفظ اردو میں بھی مستعمل ہے، روزمرہ کی گفتگو میں بھی فتنہ وفساد وغیرہ الفاظ ہم استعمال کرتے رہتے ہیں، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کے مطابق امت محمدیہ مسلسل فتنوں کا شکار رہے گی۔

آج نقشۂ عالم پر نگاہ دوڑائیے! حرمین شریفین سے لے کر تمام عرب ممالک، ایشیا، یورپ، افریقہ اور امریکہ سبھی خطے شرور وفتن کی لپیٹ میں ہیں، آفات ومصائب کا ایک عالمی طوفان ہے جو بڑھتا چلا جارہا ہے، فتنوں پر فتنے اٹھ رہے ہیں، دینی وعلمی فتنے، ملکی وقومی فتنے، تہذیب وتمدن

کے فتنے، آرائش وآسائش کے فتنے، سرمایہ داری کے فتنے، غربت وافلاس کے فتنے، اخلاقی وسیاسی فتنے، عقل پرستی کے فتنے، داخلی وخارجی فتنے حتیٰ کہ نورانی اور روحانی فتنے۔ ایک تسلسل کے ساتھ تمام فتنے دنیا میں پھیلتے چلے جارہے ہیں، دنیا کا کوئی بھی خطہ شاید ایسا نہیں جو فتنوں سے بالکلیہ محفوظ اور مامون ہو۔

اور انتہائی کرب ناک صورت حال یہ ہے کہ دشمنان اسلام کی سازشوں کے نتیجے میں عالم اسلام فتنوں کی آماجگاہ بن کر رہ گیا ہے، اسلام کے نام پر فتنے، اسلامی عقائد اور اسلامی اعمال میں فتنوں کی ایک شورش برپا ہے۔

یورپ سے درآمد شدہ دانشور مسلمانوں کے ایمان کو ختم یا کم از کم کمزور کرنے کے لیے آئے دن نئی تحقیق اور جدید ریسرچ کے نعرے بلند کررہے ہیں، قلمی جولانیاں، زبان کی سلاست وروانی، چرب لسانی کے ذریعے اَذہان وعقول کو متاثر کرکے احکام دین سے باغی کرنا ان کے فرائض منصبی میں داخل ہے، ان سے اور کچھ نہ بن پڑے تو اچھے بھلے مسلمان کو اس کے عقائد وافکار کے حوالے سے شک میں تو ڈال ہی دیتے ہیں، اور یہ سب اِس وجہ سے ہے کہ ہم مسلمانوں نے اپنے خالق سے بے پروائی اختیار کرلی ہے، اللہ رب العزت فرماتے ہیں: ﴿ومن اعرض عن ذكري فإن له معيشةً ضنكا﴾ (جو ہماری یاد سے منہ موڑے گا اس کی زندگی تنگ ہوجائے گی)۔ آج ہماری پستی وذلت کا بڑا سبب یہی ہے کہ ہم نے خالقِ کائنات سے روگردانی کررکھی ہے۔

...... دورِ حاضر میں بھی یہ فتنے مختلف شکلوں میں موجود ہیں، سب سے پہلے میں جاوید غامدی صاحب اور ان کے فکری جانشین جناب عمار خان ناصر کا نام لینا چاہوں گا، کیونکہ یہ وہ شخصیات ہیں جنھوں نے دین کی از سرِ نو تشکیل کا بیڑا اٹھایا ہے، اور اللہ کے نازل کردہ دین میں سے صحابہ کرام سے لے کر آج تک چودہ صدیوں کے علما، فقہا، محدثین ومفسرین کی آرا کے برخلاف جو کچھ غامدی صاحب کے سمجھ آسکا، وہ انھوں نے اپنی کتاب میزان میں بیان کردیا ہے۔

(۱) غامدی صاحب نے تشکیل جدید میں پہلا حملہ قرآن پاک پر کیا کہ قرآن سمجھنے کے لیے صرف ایک راستہ ہے اور وہ ہے عربی دانی۔ قرآن سمجھنے کے لیے نہ کسی تفسیر کی پابندی ضروری ہے نہ تشریحات سلف کی پیروی۔

(۲) اور سنت کے بارے میں اِرشاد ہوتا ہے کہ: سنت حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے افعال و عادات نہیں؛ بلکہ دین ابراہیمی کی روایت ہے، جسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کی حیثیت سے جاری فرمایا، نیز سنت کو سمجھنے کے لیے دین ابراہیمی کے حاملین (یہود و نصاری) کے عمل و تواتر کو دیکھا جائے گا (امت محمدیہ کے تواتر عملی کو نہیں!!)۔

(۳) تیسرا اُصول یہ وضع کیا کہ حلت و حرمت اور جواز و عدم جواز کے لیے مدار: شریعت نہیں، بلکہ فطرت اور عقل انسانی ہے۔

اِن اصولِ ثلاثہ سے دین کا کوئی جز بچتا نظر آئے، مثلاً حدود و تعزیرات اور اِقدامی جہاد وغیرہ تو اس کے بندوبست کے لیے قانونِ اِتمام حجت نامی اصطلاح معرضِ وجود میں لائی گئی۔

لیجیے! قرآن مجید کی تمام تر تفاسیر سے بھی آزادی ملی، سنت کے نام پر ملا لوگ جو قیود لگاتے ہیں ان سے بھی جان چھوٹی، اور شریعت کے گورکھ دھندے سے بھی خلاصی ہوئی۔ اب غامدی صاحب ہیں اور قرآن کی آیات، اپنی عربی دانی کی بنیاد پر جس آیت کی جو چاہیں تشریح کریں۔ غامدی صاحب ہیں اور دین ابراہیمی کی روایات، لہٰذا سنتوں کی تعداد سمٹ کر...... رہ گئی۔ غامدی صاحب ہیں اور ان کی فطرت سلیمہ، لہٰذا اپنی فطرت سے سوال کرکے، جسے چاہیں حلال قرار دیں اور جسے چاہیں حرام، رہی سہی کسر قانون اِتمام حجت پوری کردے گا۔ رہے نام ملتِ غامدیہ کا۔!!

اِسی اصول کے پیش نظر انہوں نے حیات عیسیٰ، ظہور مہدی، حجیت حدیث، داڑھی کی سنیت، حجیتِ اجماع، رجم کی حد، قرآن کریم کی مختلف قراءات، تصوف، مسلم و غیر مسلم اور مرد و عورت کی گواہی میں فرق، زکوۃ کے معین نصاب اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی افعال و اعمال کی سنیت کا انکار کردیا کہ قرآن اِن سے خاموش ہے۔ اور موسیقی، تصویر، بیمہ وغیرہ کو اس لیے جائز قرار دے دیا کہ قرآن اِن سے منع نہیں کرتا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیکڑوں سنتوں کا اِنکار اِس بنا پر کردیا کہ دین ابراہیمی کی روایت نہیں۔ اور کھانے کی چیزوں میں چار چیزوں کے سوا سب کی حرمتِ شرعی کا انکار کردیا کہ وہ فطرت پر موقوف ہیں، اور اِقدامی جہاد، مرتد کی شرعی سزا اور مسئلہ تکفیر کو قانونِ اتمام حجت میں نمٹادیا۔

عمار خان صاحب: اکثر مسائل میں تو غامدی صاحب کے بالکل قدم بہ قدم ہیں، چنانچہ

تفسیر بالرائے، انکارِ اجماع، انکارِ سزائے ارتداد ورجم، اقدامی جہاد کے انکار اور تصوف واہل تصوف کے استہزا میں بعینہ غامدی اصغر ہیں۔ اور بعض مسائل جن میں وہ سمجھتے ہیں کہ اگر میں نے غامدی صاحب سے اتفاق کیا تو امت کی اجماعی رائے کی روشنی میں دائرۂ اسلام سے خارج قرار پاؤں گا تو ان میں اِنکار کے بجائے تشکیک اور نفس مسئلہ کی اصل حیثیت کو مجروح کرنے کی کوشش کرتے ہیں، چنانچہ داڑھی کی شرعی حیثیت، حیات عیسیٰ اور مسئلہ تکفیر وغیرہ مسائل میں وہ اِسی راہ پر گامزن ہیں۔

اِن انکار کا یقینی نتیجہ مذہب بیزاری، دینی تشکیک وتذبذب، تمام امت اسلامیہ کی تجہیل اور تحمیق اور قدیم علماء امت اور حاملینِ دین کو ناقابل اعتماد مجرم قرار دینا اور اسلام کی پوری تاریخ تاریک در تاریک دِکھلانا ہے۔

غامدی صاحب کے وضع کردہ فہمِ دین کے اصولوں کے نتیجے میں کیا کچھ ہمارے ہاتھ سے جاتا ہے؟ اس کے تصور سے بھی رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ قرآن کریم کی تفسیر وتشریح میں جو کچھ صاحبِ قرآن نے فرمایا وہ ناقابل اعتبار ٹھہرا کہ قرآن سمجھنے کا مدار فقط عربی دانی ہے۔ اقوالِ صحابہ وتابعین، تشریحاتِ مفسرین اور فقہا کرام کے قرآن سے اخذ کردہ مسائل واحکام سب بیک جنبشِ قلم ناقابل التفات ٹھہرے۔ سنت رسول اور آثار صحابہ کی پابندی بھی غیر لازم ہوئی کہ سنت تو دین ابراہیمی کی روایت ہے۔ اور اجماع کو تو غامدی صاحب نے صاف لفظوں میں بدعت اور عمار خان نے علمی افسانہ لکھ دیا۔ یوں پوری امت مبتدع وافسانوی کردار کی حامل ٹھہری۔ تصوف کو جناب نے عالمگیر ضلالت قرار دے کر تمام صوفیاء ملت کو گمراہی کے گڑھے میں دھکیل دیا۔ یہود ونصاریٰ کے لیے نبی کریم پر ایمان کو غیر ضروری قرار دے کر کلمہ اسلام کی اہمیت ختم کر ڈالی۔ الغرض کلمہ اسلام سے لے کر دین کے معمولی حکم تک سب کو غامدی صاحب نے مردود، ناقابل التفات، یا مشکوک کر دیا۔ اور چودہ صدیوں کا اجماعی تعامل اور جمہور اہل علم کا موقف غیر معتبر ٹھہرا، اب دین کو سمجھنے کا واحد ذریعہ عقلِ غامدی اور فطرتِ عمار ہے!! أعاذنا الله مِنه.

طرفہ تماشا یہ ہے کہ اِس تحریف دین کا نام تحقیقِ اِسلام اور اِلحاد فی الدین کا نام اِظہار حقیقت رکھا جاتا ہے۔ غامدی وعمار صاحبان کے علاوہ دیگر ملحدینِ زمانہ میں زید حامد، فرحت ہاشمی (راشد شاز، اسرار عالم، وحید الدین نماں) اور ان جیسے دسیوں پروفیسرز، بیسیوں ڈاکٹرز اور نام نہاد

دانشوران شامل ہیں۔ جو مختلف ٹی وی چینلز، پرنٹ والیکٹرانک میڈیا اور مختلف لیکچرز وانٹرویوز میں آئے دینی احکام کی من پسند تشریحات وتوضیحات کر کے قوم کو گمراہ کرنے پر تلے بیٹھے ہیں۔

ان سے ہٹ کر اسکولوں کالجوں میں رائج انگریزی کلچر، یہود وہنود کی تہذیب وتمدن بھی اِلحاد پھیلانے میں پیش پیش ہے، اسی کو دیکھ کر علامہ اقبال نے کہا تھا۔

ہم تو سمجھے تھے کہ لائے گی فراخی تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا اِلحاد بھی ساتھ

ابتدا ہی سے بچوں کے گلے میں ٹائی لٹکا کر ان کو عیسائی تہذیب سے مانوس اور اسلامی تہذیب سے بے گانا کیا جاتا ہے، بود وباش، رہن سہن، شکل وصورت، لباس وغیرہ سب کچھ عیسائیوں کے طرز پر ہے، مخلوط تعلیم ہم نے شروع کر رکھی ہے، بے حیائی اور فحاشی کے حلقے ہمارے گھروں میں لگے ہوئے ہیں، قومی ودینی غیرت کا جنازہ ہم نے نکال رکھا ہے، ہندوؤں کے تہوار ہم نے اپنا رکھے ہیں۔

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود
تم مسلماں ہو جنہیں دیکھ کر شرمائیں یہود؟

گویا لادینیت، الحاد، سیکولرازم، لامذہبیت اور دین سے دوری کی جتنی ممکنہ صورتیں ہیں، وہ سب ہم نے اختیار کر رکھی ہیں، کافر دشمنوں نے اپنے ایجنٹ اسلامی ممالک میں بھیج کر ہمارے میڈیا پر ان کو اسلامی اسکالرز باور کرایا ہے، حالانکہ ان کا مقصد اور واحد مقصد: مسلمان قوم کو خدا، نبی اور قرآن سے کاٹنا اور دور کرنا ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اللہ والوں، نبی کے وارثوں اور قرآن کے حاملین سے قوم کو بدظن کریں۔ سو اِس کوشش میں دن رات ایک کیے ہوئے ہیں۔

(ماخوذ بتصرف واختصار)

باسمہٖ سبحانہ وتعالیٰ

راشد شاز کا فتنہ

''اسلام: شاہ راہ اعتدال''

راشد شاز اور ان جیسے مفکرین کے مذہبی انحرافات، ایک علمی تحلیل وتجزیہ

یہ مفصل نام اس کتاب کا ہے جو مولانا محمد معاویہ سعدی، شعبۂ تخصص فی الحدیث مظاہر علوم سہارنپور کے قلم ژرف نگار کا شاہکار ہے۔ کتاب میں اسلام کی راہِ اعتدال اور اس شاہراہ سے منحرف نظریات وعقائد سے متعلق اصولی بحث کے ساتھ اس دور کے ایک نوزائیدہ لیکن انتہائی مضر فتنہ کا تفصیلی وتحقیقی جائزہ بھی لیا گیا ہے اور وہ فتنہ ہے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے برج کورس کے ڈائریکٹر جناب راشد شاز صاحب کے افکار ونظریات کا فتنہ۔

اگر چہ کئی اہل قلم حضرات اور اربابِ فتویٰ نے مختصراً راشد شاز صاحب کی فکری کج روی کا جائزہ لیا ہے۔ لیکن زیرِ نظر کتاب کے مرتب جناب مولانا محمد معاویہ سعدی نے موصوف کے افکار کا مفصل اور مدلل تحقیقی جائزہ لے کر بروقت ایک بڑی علمی خدمت انجام دی ہے۔

اللہ تعالیٰ اس محنت کو شرف قبولیت سے نوازے اور امت کی ہر طرح کے فکری وعملی انحراف سے حفاظت فرمائے۔ آمین

ابوالقاسم نعمانی غفرلہ
مہتمم دارالعلوم دیوبند
۱۲ ربیع الثانی ۱۴۳۷ھ